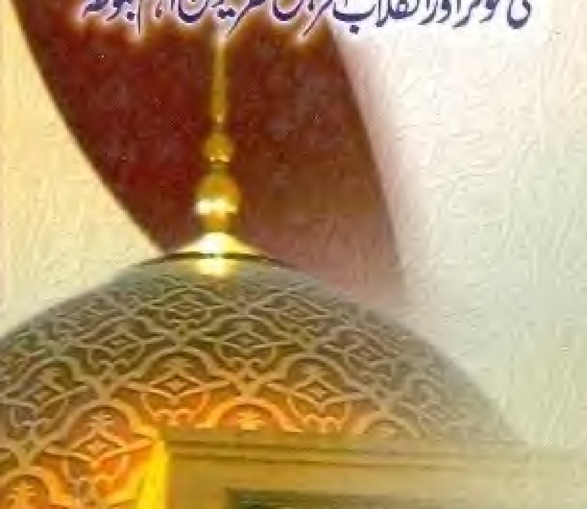
۲

خطبات حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مؤثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ



سنت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام

ابراھیم علیہ السلام کی سنت

ذبح کی صورت میں انعام خداوندی کی تکمیل

عید کی خوشبو

قربانی کی طرف رغبت دلانا

قربانی کے جانور

ماہ شوال میں تین دعاؤں پر مشتمل تقریریں

شعائر اسلام کی عظمت

مقبول حج

مقصد کا حصول حج بیت اللہ کی صورت میں

اسرار حج

حج اور قربانی کی روح

عبادات کا اصل مقصود

احکام حج

زمزم بک ڈپو دیوبند

خطباتِ حکیم الامت

جلد ٦

سنتِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

(حج و قربانی)

مجدد وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

ترتیب مواعظ

مفتی عبد الرحمٰن خان

٢٣٧٥٥٣

زمزم بکڈپو دیوبند

تفصیلات

نام کتاب ــــــــ سنتِ ابراہیم علیہ السلام

تالیف ــــــــ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

باہتمام ــــــــ اسعد واجدی

سن طباعت ــــــــ مارچ ۱۹۹۶ء

قیمت ــــــــ

ناشر

زمزم بکڈپو دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

عرضِ ناشر

نحمدہٗ ونصلّی علی رسولہ الکریم : اما بعد ،

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ خطباتِ حکیم الامت رحؒ کے گرانمایہ سلسلہ کی چھٹی جلد سُنتِ ابراہیم علیہ السلام (حج و قربانی) تزئین اور کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللّٰھم لک الحمد ولک الشکر ،

ان مواعظ کی صحیح قدر وقیمت تو وہی حضرات جان سکتے ہیں جنہوں نے دینی علوم کے طویل مطالعہ اور سلف و خلف کے محقق علماء کے گرانقدر علمی ذخیرہ سے استفادہ کے بعد ان مواعظ کا مطالعہ کیا ہو اور جن کے سامنے حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کا علمی و روحانی مقام پوری طرح واضح ہو چکا ہو، مگر ہم جیسے کور چشموں کے لئے یہی بات بہت قابلِ فخر ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں اس دَور کے نادر المثال عالم باعمل حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے اُن خطبات اور تقاریر کو چھاپنے کی توفیق عطا فرمائی ہے جن کے ذریعہ سینکڑوں انسانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب بَرپا ہوا، دین کے بارے میں بیسیوں شبہات کا خاتمہ ہوا، اور ان خطبات کی بدولت وہ "صراطِ مستقیم" روز روشن کی طرح واضح ہوئی جو ہر مومن کا مقصد اور ہر مسلمان کی بار بار دعا ہے۔

مواعظ اشرفیہ کی تزئین اور ترتیب نو کا یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء میں حضرت مولانا مفتی

محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کے حکم سے جناب منشی عبدالرحمان خان صاحب زیدت مکارمہم نے شروع کیا تھا اور مواعظ کی گیارہ جلدیں انہی کے ہاتھوں اشاعت پذیر ہوئیں جسکو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر بعد میں بوجوہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں جناب منشی صاحب موصوف ہی کے تعاون سے ہمارے ادارہ تالیفات اشرفیہ نے بقیہ جلدوں کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا، موصوف نے بقایا جلدوں کی ترتیب ہمارے حوالے کی جن کی عنوانات سازی اور تزئین نو کا کام ہمارے محترم دوست جناب قاری محمد ادریس صاحب ہوشیارپوری نے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

جس کے نتیجہ میں بحمد اللہ بارہویں جلد سے لے کر ستر ہویں جلد تک چھ جلدیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں یہ ذکر نہ کروں کہ ان بقایا جلدوں کی اشاعت میں حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے خلیفہ ارشد، میرے مشفق ومربی شیخ سیدی ومرشدی حضرت الحاج مولانا محمد شریف صاحب مدظلہم العالی ودامت برکاتہم العالیہ کی دعاؤں اور توجہات کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کے نتیجہ میں ناشر یہ ذخیرہ آپ کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوا۔ ورنہ اگر حضرت ممدوح مدظلہ العالی کے دامن تک رسائی نہ ہوتی تو احقر کو شاید اس علمی ذخیرہ کی ہوا بھی نہ لگتی۔ اللہ تعالیٰ گلدستہ اشرف کے انمول پھول کو ہمیشہ سرسبز شاداب رکھے اور اسکی نکہت باشیوں سے دنیا کے علم وعرفان کی فضا معطر ہوتی رہے۔

آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین:

احقر، محمد اسحاق عفی عنہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ ملتان

فہرست مواعظ سُنّت ابراہیم علیہ السلام

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ
وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ
اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

۸ الحج المبرور
مقبول حج

۹ تحصیل المرام
مقصد کا حصول حج بیت اللہ کی صورت میں

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا

۱۰ التہذیب
اسرارِ حج

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ
شَیْئًا وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ
السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّ
عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ
لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا
رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا
الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۝ ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَھُمْ وَلْیُوْفُوْا
نُذُوْرَھُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۔

۱۱ روح الحج والشج
حج اور قربانی کی روح

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ
التَّقْوٰی مِنْکُمْ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ
لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ

۱۲ روح الارواح
عبادات کا اصل مقصود

اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ

۱۳ احکام حج
احکامِ حج

اظہارِ مسرّت وتحسین

از حضرت اقدس مرشدی و مربی مولانا الحاج محمد شریف صاحب دامت برکاتہم
خلیفۂ ارشد حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مجھے دلی خوشی ہے کہ عزیز القدر حافظ محمد اسحاق صاحب مجدد ملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات شائع کرنے کے حریص ہیں۔ انہیں حضرت رحؒ سے صرف نسبت ہی نہیں لبت کمانشہ ہے۔ حضرت کے مسلک اور مذاق کی تبلیغ کے بہت خواہشمند ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے حضرت کی کتابیں جو نایاب ہیں چھپواتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو قبول فرما کر ناظرین کے لئے نافعیت اور ہدایت اور اُن کے لئے سرمایۂ آخرت بنائیں۔

دعا گو

احقر محمد شریف عفی عنہ

فہرست مضامین

سُنّتِ ابراھیمؑ

۲- تکمیل الانعام فی صورۃ ذبح الانعام

ذبح کی صورت میں انعام خداوندی کی تکمیل

٣ عود العید : عید کی خوشبو

٤ ترغیب الاضحیہ : قربانی کی طرف رغبت دلانا

۵ الضحایا: قربانی کے جانور

۶ السوال فی شوال: ماہِ سوال میں تین دعاؤں پر مشتمل تقریر

۷ تعظیم الشعائر : شعائرِ اسلام کی عظمت

۸ الحج المبرور : مقبول حج

۹ تحصیل المرام : مقصد کا حصولِ حج بیت اللہ کی صورت میں

۱۰- التہذیب (اسرارِ حج)

۱۱ روح الحج والثج : حج اور قربانی کی روح

۱۲ روح الارواح : عبادات کا اصل مقصود

۱۳- احکام حج

جہاں دیدہ

مفکر اسلام جسٹس حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے قلم سے بیس ملکوں کا معلومات آفریں سفرنامہ جس میں مسلمانوں کے تاریخی مراکز کے حالات قصۂ زمین بر سرزمین تاریخ کے دلچسپ اور بصیرت افروز واقعات مشہور اسلامی شخصیتوں کے روح پرور تذکرے، اپنی نوعیت کا منفرد مجموعہ ہے۔ قیمت مع ڈسٹ کور =/120

تراشے

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا چالیس سالہ حاصل مطالعہ جو علمی ادبی و تحقیقی امور پر دلچسپ سبق آموز واقعات اور نہایت عمدہ معلومات سے مزین ہے ——— قیمت =/35

نقوشِ رفتگاں

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے قلم سے ۶۱ باکمال افراد کی زندگیوں کا حیات بخش مجموعہ ——— قیمت: =/70

روح کی بیماریاں اور انکا علاج

حکیم مولانا محمد اختر صاحب کی مشہور و معروف کتاب جسمیں بدنظری عشق مجازی، تکبر، غصہ حسد جیسے تمام امراض کا مکمل علاج موجود ہے،

قیمت مجلد =/90

سنتِ ابراہیم علیہ السلام

ابراہیم علیہ السلام کی سنّت

قربانی کے متعلق یہ وعظ کیرانہ کی جامع مسجد میں
۲۴، ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ کو ارشاد فرمایا:
مولوی محمد ابراہیم صاحبؒ نے اسے قلمبند فرمایا۔

حقیقت قربانی کی فنا نفس ہوئی ـــــ اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد کا حکم ہوا نہ کہ اپنی ذات کے ذبح کا۔ اس لئے کہ اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنا جس قدر نفس پر شاق اور سخت ہے، اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ لینا اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ ..... کوئی باپ بحالت ہوش وحواس کبھی اس فعل کو گوارا نہ کرے گا۔ بلکہ اپنی جان دے دینا نہایت آسان اور سہل سمجھے گا ـــــ اور فنا نفس کے یہی معنیٰ ہیں کہ اپنی نفس کی مخالفت کرنا۔ اور یہ معنیٰ ذبح ولد میں خود اپنے کو ذبح کرنے سے بہت زیادہ ہیں۔

(از حضرت حکیم الامتہ رحمتہ اللہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الوعظ المسمّٰی بہٖ

سُنّتِ ابراہیم

*

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فی حدیثہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا ما ھذہ الاضاحی یارسول اللہ قال سنۃ ابیکم ابراھیم۔

عیدگاہ کی حاضری کا اہتمام

چونکہ زمانہ قربانی کا قریب ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ قربانی کے مسائل ضرور بیان کئے جائیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آجکل قربانی بوجہ لاپرائی کے حسب قاعدہ نہیں کی جاتی حالانکہ ان قواعد کا لحاظ واہتمام نہایت ضروری ہے۔ اور بعض اہل ثروت کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خود قربانی ہی کی طرف توجہ نہیں کرتے حالانکہ ذی وسعت پر قربانی واجب اور اس کے ترک پر وعید وارد ہے

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص وسعت رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ یہ عیدگاہ وہ جگہ ہے جس میں حاضر ہونے کی تاکید اور ترغیب بیان فرمائی ہے کہ عورتوں پر نماز عید واجب بھی نہیں بلکہ ان کو نماز پڑھنا فرض بھی نہیں ان کو بھی پہلے یہ حکم تھا کہ عیدگاہ میں حاضر ہوں چنانچہ حیض والی عورتوں کو حضورؐ نے حکم فرمایا تھا کہ وہ بھی عیدگاہ میں حاضر ہوں۔ حالانکہ حائضہ کو نماز پڑھنا جائز نہیں (مگر یہ حکم حضورؐ ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا اس زمانہ میں بسبب فتنہ کے یہ حکم نہیں جیسا اپنے محل میں تحقیق ہو چکا ہے)

یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو عیدگاہ میں ضرور جانا چاہیے اور وہیں نماز ادا کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اس میں تساہل کرتے ہیں اور بلا عذر اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے ہیں ہمارے فقہاء نے اس کو منع فرمایا ہے البتہ معذورین جو عیدگاہ جانے کی طاقت نہیں رکھتے ان کو اتنی اجازت دی ہے کہ ان کے واسطے بستی میں ایک امام رہ جائے یا ایسا ہی کوئی عذر شرعی ہے ان کو بھی شہر کی مسجد میں پڑھنے کی اجازت ہے اور فقہاء یہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ قواعد سے جن کو وہ اپنی خداداد قوت اجتہاد سے سمجھے ہوتے ہیں اور حضورؐ کا فرمودہ باری تعالیٰ کا فرمودہ ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ٭ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بانی اسلام ہیں یہ محض غلط اور باطل ہے بلکہ بانی اسلام باری تعالیٰ ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک

اسمیں صاف تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض مبلغ ہیں اور احکام دینی خدا کے نازل کردہ ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام دین محمدی ہے یعنی یہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے موجد اور بنانیوالے ہیں بلکہ یہ تعبیر مجازی ہے کیونکہ دین تو اللہ ہی کا ہے مگر چونکہ ہم کو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معلوم ہوا ہے اس نسبت خاصہ کی وجہ سے اس طرح تعبیر کر دیا جاتا ہے غرض اصل احکام خدا و رسول کے ہیں فقہاء کا صرف یہ کام ہے کہ انھوں نے اس قانون خداوندی کو جو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بندوں کو

سنتِ ابراہیم

کو پہنچا چکا تھا۔ لوگوں پر ظاہر کر دیا ہے اور بذریعہ قیاس ایسے لوگوں کے لئے اچھی طرح توضیح و تفصیل کر دی جو اس قانون کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اسی واسطے اصول و فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ **القیاس مظہر لا مثبت** اس کی ایسی مثال ہے جیسا کہ ججان ہائی کورٹ نے ایک مسئلہ کو طے کر دیا ہو کہ وہ دراصل قانون کا ہی فیصلہ ہے جو ضرور ماننا جائے گا کیونکہ ججان مذکور واضعان قانون کی مقصود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لہذا ان کا فیصلہ قانونی طور پر صحیح سمجھا جائے گا لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ ججان مذکور موجد قانون ہیں اور اُنھوں نے اپنے ایجاد کردہ قانون کے موافق یہ فیصلہ کیا ہے بلکہ وہ مظہر قانون کہلائیں گے۔ یہی مثال فقہا کی ہے کہ وہ بھی مظہر قانون ہیں نہ کہ موجد۔ غرض اصل حکم یہ ہے کہ عیدگاہ میں جانا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ اس اجتماع اور دیگر اجتماعات کی مثل جماعت جمعہ و جماعت پنجگانہ وغیرہ کی کیا مصلحت ہے سو اس مصلحت کے بیان کرنے میں اور نیز دیگر امورِ شرعیہ کی مصالح کے بیان کرنے میں بھی اس وقت کے عقلاء اور بعض علماء نے بھی ایک غلطی کی ہے اور ٹھوکر کھائی ہے اور حقیقت میں جو چیز اصل مصلحت خداوندی ہے وہ اور ہی شے ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ جماعت میں مقصود اتفاق ہے اور یہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے کہ جماعت پنجگانہ اس مصلحت سے وضع ہوئی تاکہ اہلِ محلہ شب و روز میں پانچ مرتبہ اپنی اپنی مسجد میں مجتمع و متفق ہو جاویں اور ملاقات کریں اور جمعہ کی جماعت اس مصلحت سے مقرر ہوئی ہے تاکہ تمام شہر کے مسلمان ایک مسجد میں جمع ہو جائیں اور باہم ملاقات کریں اور عید کی جماعت اس غرض سے مقرر کی گئی تاکہ تمام شہر اور اطرافِ شہر کے کل مسلمان ایک جگہ یعنی عیدگاہ میں جمع ہوں اور باہم ملیں جو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کی اچھی صورت ہے۔

اے حضرات! محققین کے نزدیک یہ نکتے کچھ بھی قدر نہیں رکھتے اور حقیقت میں یہ نکتے کوئی چیز نہیں شریعت نے نکات کا اہتمام نہیں کیا ہے دیکھو شعراء وغیرہ کی کتابیں قافیہ وغیرہ سے پُر ہیں اور قرآن مجید میں اس کا کچھ اہتمام نہیں کیا گیا حالانکہ تمام دنیا بھر کی کتابوں سے قرآن پاک افصح و ابلغ ہے اگر نکتے قابلِ قدر ہوتے تو خدا تعالیٰ قادر تھا کہ تمام قرآن کو مسجع و مقفیٰ کر دیتا مگر باوجود اس کامل قدرت کے پھر ایسا نہ کیا۔ دیکھو سورۂ قٓ مکی ہے اور مکی سورتوں میں بہ نسبت مدنی سورتوں کے بوجہ اس کے کہ مکہ میں اہلِ زبان زیادہ تھے صناعتیں زیادہ ہیں مگر

تکلفات اور زائد نکات سے وہ بھی بری ہیں چنانچہ فرماتے ہیں : ق والقرآن المجید ، یہاں تو قافیہ دال ہے آگے فرماتے ہیں :

بل ان جاءھم منذر منھم فقال الکٰفرون ھذا شئ عجیب

یہاں قافیہ بک ہے علی ہذا القیاس آگے دیکھئے کہ کچھ قافیہ وغیرہ کا اہتمام نہیں بس بتلا دیا کہ قافیہ وغیرہ کی ضرورت نہیں بلکہ حقائق ومعانی کی ضرورت ہے ۔

کیونکہ قرآن روحانی مطب ہے اور طب کی کتاب میں زیادہ اہتمام اس کا ہونا چاہیے کہ اس کے نسخے شفا میں کامل ہوں لفظی نکات کا اس میں اہتمام نہیں ہوا کرتا ۔

دیکھئے اگر حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے نسخہ میں گل بنفشہ اور کاسنی ہو تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ان دونوں دواؤں میں قافیہ نہیں اس لئے یہ نسخہ ٹھیک نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ نکتہ نہ مقصود ہے نہ قابلِ لحاظ ہے بلکہ مقصود شفا ہے چونکہ یہ نسخہ اس کے مناسب ہے اس لئے کامل ہے ۔

علی ھذا القیاس احکام شرعیہ میں نکات مقصود نہیں بلکہ معرفتِ الٰہی مقصود ہے پس علماء محققین کی نظر اسی مقصود پر ہے یہ نکات انکی نظر میں کچھ بھی نہیں ظاہر ہے کہ جس کی نظر اشرفی پر ہو وہ پیسہ کوڑی کو کیا نظر میں لاوے گا ۔ وہ معرفت الٰہی ایسی نعمت ہے کہ ان کا ہی دل جانتا ہے اس کے مزہ کے مقابلہ میں تمام دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں وہ معرفت سے ہر وقت مزے لیتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہتے گو سب کچھ جانتے ہیں مگر ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ✤ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

جن فضلاء کو یہ معرفت حاصل نہیں اور جن کے آئینہ نظر میں یہ مقصود منکشف نہیں ہوا وہ ایسے نکات کے درپے ہوتے ہیں چنانچہ کوئی نکتہ وحدۃ الوجود میں غرق ہے کوئی وحدۃ الشہود میں لیکن انہیں نکتہ دانوں میں اگر کسی کو یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ نکات سب نظر سے گر جاتے ہیں پھر ان کا نام تک زبان پر نہیں آتا اور معرفت الٰہی سے سکون ہو جاتا ہے

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے متعلق جو کہ صفائی کا داروغہ ہے گلیوں وغیرہ کی تحقیق ہو اگر وہ وزیر اعظم ہو جائے تو اب ان قصوں کی اس کو ضرورت نہیں رہی بلکہ اب اس کو خدمت در رضائے شاہی ہر وقت مدنظر رہے گی پس جماعت وغیرہ میں جو یہ نکتے اتفاق کے بیان

کئے جاتے ہیں میں اسکی نفی نہیں کرتا ہوں بلکہ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حکم شرعی اس مصلحت اتفاق پر مبنی نہیں ہے حکم شرعی پر خود یہ نکات مبنی اور اس کے تابع ہیں حکم شرعی کی وضع تو ایسی بناء پر ہے جس کا ہم کو علم بھی نہیں ہے ہم کو تو اس قدر علم کافی ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے جس کو اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچایا اور بس ہمارا مشرب یہ ہونا چاہئے ۔

زبان تازہ کردن باقرار تو ٭ نینگیختن علت از کار تو

ہمارے لئے بڑی بنا اس حکم کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مقرر کیا ہے البتہ جس حکم کی حکمت خود اللہ تعالیٰ نے بتلا دی ہے اس کو بے تکلف بیان کیجئے باقی جس حکم کی مصلحت خود انہوں نے نہیں بتائی ہمیں اپنی رائے کو دخل دینا اور اپنی مزعومہ حکمت پر حکم کو مبنی کرنا بڑی حماقت اور سراسر نادانی ہے مثلاً پھول پتی اور گلکاری پر تعمیر مبنی نہیں بلکہ تعمیر پر یہ سب گلکاریاں مبنی ہیں ہماری مصلحتیں بالکل پھولوں کی مثل ہیں اور مقصود اعظم عمارت ہے نہ کہ پھول پتی پس سمجھ لو کہ نماز و جماعت اس وجہ سے مقرر نہیں ہوئی تاکہ اتفاق اس پر مرتب ہو بلکہ اتفاق سے حکم شرعی پر یہ مصلحت اتفاق بھی تابع ہو کر مبنی ہو گئی ۔

میں نے ایک کتاب لکھی ہے "المصالح العقلیہ فی الاحکام النقلیہ" جس میں احکام شرعیہ کی کچھ حکمتیں بیان کی گئی ہیں مگر اس کتاب میں جو چیز زیادہ پسندیدہ اور کارآمد ہے وہ اس کا خطبہ ہے ۔ جس میں چند مفید قواعد اور فوائد ہیں اس میں یہ فائدہ بھی مذکور ہے کہ یہ نکات مذکورہ حکم شرعی کے تابع ہیں ان پر حکم شرعی مبنی نہیں ۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کے لئے بھی عیدگاہ میں حاضر ہونے کا حکم فرمایا تھا تو اس سے ثابت ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اہتمام کے ساتھ قولاً بھی عیدگاہ میں جانے کا اہتمام کیا ہے حضور کا عملی اہتمام یہ ہے کہ آپ ہمیشہ عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے صرف ایک بار بارش کی شدت سے تشریف نہیں لے گئے ۔

تعریف سنت مؤکدہ

لیکن یہ آپ کا تشریف نہ لے جانا اپنے ذاتی آرام و راحت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض امت پر شفقت کی وجہ سے تھا ، بعض اعمال مستحبہ گاہ گاہ آپ نے اس لئے چھوڑ دیئے ہیں کہ کہیں امت دقت میں نہ پڑ جائے چنانچہ

سنتِ ابراہیم

آپ نے صحابہ کو نماز تراویح چند روز پڑھائی اور پھر چھوڑ دی صحابہؓ نہایت ذوق شوق سے تراویح کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے مگر آپ اپنے حجرہ اعتکاف سے تشریف نہ لائے صحابہ نے اس خیال سے کہ شاید آپ سوتے رہ گئے ہوں گے کھانسنا کھنکارنا شروع کیا تاکہ آپ بیدار ہو جائیں اور ہمیں تراویح پڑھادیں مگر آپ تشریف نہ لائے مجبوراً صحابہؓ واپس چلے گئے۔ صبح کو جب صحابہؓ خدمت شریف میں حاضر ہوئے تب آپ نے فرمایا کہ مجھ کو تمہارے رات کے آنے کی خبر ہے مگر میں قصداً نہیں نکلا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ اجتماع پسندیدہ ہے۔ مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں تم پر یہ نماز یعنی تراویح فرض نہ ہو جائیں اور تم وقت میں پڑ جاؤ اس وجہ سے پھر آپ نے تراویح جماعت سے نہیں پڑھی لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ ضرور جماعت تراویح پر مواظبت فرماتے جیسا کہ یہ ارشاد بتلا رہا ہے پس مواظبت حقیقیہ گو نہیں مگر مواظبت حکمیہ ثابت ہے اسی لئے حضرات صحابہؓ نے بعد میں تراویح پر مواظبت کی اور اسی لئے تراویح سنت مؤکدہ ہے چونکہ یہ زمانہ ترجمہ کا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ سنت مؤکدہ کی تعریف کر دی جائے تاکہ جو شبہ تراویح کے سنتِ مؤکدہ ہونے پر واقع ہوتا ہے وہ دفع ہو جائے۔

تعریف سنت مؤکدہ کی یہ ہے کہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت کی ہو۔ اب آمیں شبہ یہ پیدا ہوا کہ بعض احادیث کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تراویح باجماعت فصل کی ساتھ صرف تین روز پڑھی ہے پس معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اس پر مداومت نہیں کی تو تراویح سنتِ مؤکدہ نہ ہوئی۔ اس شبہ کی بنیاد محض ترجمہ اردو کا دیکھنا ہے اور محض ترجمہ کے دیکھنے سے اصل حقیقت ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی بلکہ یہ علوم کی تحصیل پر موقوف ہے اور آج کل سرے سے علوم ہی حاصل نہیں کئے جاتے بس اپنی خواہش کے موافق جو دل میں آیا سمجھ لیا اور جو چاہا کرنے لگے گو غلط ہی سمجھا ہو غرض علمائے محققین نے احکام میں کبھی لِمَ وکَیفَ نہیں کہا حالانکہ ان کو علوم بھی حاصل تھے اور اب تو لوگ محض ترجمے دیکھ کر احکام کے ساتھ تمسخر اور گستاخی اور خود رائی کرنے لگے حالانکہ محض ترجمہ کا دیکھنا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا ترجمہ کے دیکھنے والے اول تو کہاں تک ترجمہ دیکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک یاد رکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک صحیح سمجھ سکتے ہیں آج کل تو خیر سے حفظ کی قوت ہی نہیں بس یہ حال ہوگا۔

۷ حفظت شیئاً و غابت عنك اشياء

تجربہ ہے ترجمہ میں کچھ نہ کچھ ضرور رہ جاتا ہے اس لئے استعداد علمی کی ضرورت ہے۔
محض ترجمہ دیکھ کر غلطی ہو جانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مولوی صاحب پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے انہوں نے سفر حج کیا ان کے پاس ایک کتاب سفر نامہ حج تھی وہ اس سفر میں جو کام کرتے اس کتاب کو دیکھ کر کرتے تھے اس کتاب میں یہ واقعہ بھی لکھا تھا کہ عرب میں یہ عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے قیمتی لباس والے بھیک مانگتے ہیں اتفاق سے ایک دن جعفر آفندی جو پاشا کا مترجم تھا اور باوجود ہندی ہونے کے زبان ترکی وغیرہ پر قادر تھا اور شان وشوکت سے تھا ان مولوی صاحب کے سامنے آیا اور آ کر سلام کیا مولوی صاحب سخت لہجے میں کہنے لگے کہ کچھ کہنا ہے جعفر آفندی خوش مزاج بھی تھا کہا ہاں چار روز کا بھوکا ہوں کچھ مدد کیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ یہ لباس فروخت کر دو اور کھاؤ تم کو ایسے لباس کے ساتھ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔
جعفر نے کہا کہ لباس بیچ دوں گا تو بھیک کیسے ملے گی اس لباس کے لحاظ سے تو کوئی روپے دو روپے دے دیتا بھی ہے اور یہ نہ ہو تو دو چار ہی آنے پر ٹرخا دیا کریں گے خیر آفندی یہ گفتگو کر کے اس وقت تو چلے گئے پھر ایک دن یہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے جعفر آفندی گزرے میں نے ان کو بلایا اور تعظیم کی یہ مولوی صاحب حیران ہوئے کہ میں نے تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا تھا اور یہاں معاملہ بالعکس ہے آخر ان مولوی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں میں نے کہا ایک معزز شخص ہیں وغیرہ وغیرہ تب تو مولوی صاحب نہایت شرمندہ ہوئے اب جعفر آفندی نے مزاحاً مجھ سے کہا کہ ذرا ان مولوی صاحب سے دریافت کیجئے کہ انہوں نے مجھ سے بے رُخی کا برتاؤ کیوں کیا وہ بیچارے بہت معذرت کرنے لگے پھر میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ نے ان کے ساتھ ایسا بدنما برتاؤ کیوں کیا تو مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ بعض لوگ عرب میں عمدہ لباس پہن کر لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں وہ مکار دھوکہ باز ہوتے ہیں اور علاوہ کتاب میں دیکھنے کے میں نے ایسے لوگ آنکھوں سے بھی دیکھے میں نے یہی سمجھ کر ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا میں سمجھا کہ یہ بھی کوئی سائل ہیں جو اس شان سے آئے ہیں جعفر آفندی بہت خوش طبع تھے فوراً بولے کہ اجی مولوی صاحب آپ نے

جن لوگوں کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ باندھے تھے یا ترکی ٹوپی پہنے اس مولوی صاحب نے کہا واقعی عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ جعفر نے کہا کہ حضرت میں تو ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا نہ کہ عمامہ باندھے ہوئے آپ نے مجھ کو ان پر کیسے قیاس کر لیا سچ ہے یک من علم را دہ من عقل باید محض کتاب دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کافی ذریعہ معلومات کا نہ ہو اسی طرح سے نرے ترجمے سے کام نہیں چلتا بلکہ عقل و استعداد کی بہت ضرورت ہے ورنہ محض ترجمہ دیکھنے والے بہت غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے یہ مولوی صاحب تھے۔

غرض سنت مؤکدہ کی تعریف کا یہ مقدمہ تو صحیح ہے کہ جس فعل پر حضورؐ نے مداومت فرمائی ہو وہ سنتِ مؤکدہ ہے لیکن اس مقدمہ کے سمجھنے کے لئے نری ترجمہ بینی کافی نہیں بلکہ استعداد علمی کی بھی ضرورت ہے۔

اب سنو کہ مداومت کی دو قسمیں ہیں ایک مداومت حقیقیہ اور دوسری مداومت حکمیہ۔ مداومت حقیقیہ تو یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً بھی ہمیشہ کیا جاوے اور مداومت حکمیہ یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً تو کسی مصلحت کی وجہ سے کبھی چھوڑ دیا ہو لیکن ارادہ میں اس فعل پر دوام ہو اور حضورؐ کے ارادہ کو بھی بجائے فعل کے مؤثر سمجھنا چاہیے اور حضورؐ کا ارادہ دوام تراویح کے متعلق خود اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آپ نے جماعت تراویح پر مداومت اسی وجہ سے نہیں کی تاکہ یہ فرض نہ ہو جائے، اور امت دقت میں نہ پڑ جائے یہ غایت درجہ کی امت پر شفقت ہے یہ مصلحت تھی ترک دوام صوری میں۔ چونکہ مداومت حکمیہ ارادیہ جو بمنزلہ فعل کے ہے حضورؐ سے ثابت ہو چکی تو یہ تراویح کی سنت مؤکدہ ہونے کی کافی بلکہ اکفی دلیل ہے۔

شانِ محبت

صاحبو! واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری وجہ سے عمر بھر تکلیف اٹھائی کہ بعض دفعہ ایک کام کو آپ کا جی چاہتا تھا مگر ہماری مشقت کے خیال سے نہ کرتے تھے تو کیا ہم کو آپ کی خوشی کے لئے مشقت نہ برداشت کرنا چاہیے جب کہ ہم کو حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تراویح کی جماعت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور حضورؐ کا بھی دل چاہتا تھا کہ اس پر مواظبت کریں مگر آپ نے ہماری دقت کے خیال سے صورۃً مواظبت نہیں کی تو کیا ہم کو اس پر مواظبت نہ کرنا چاہیئے ضرور چاہیئے۔

صحابہ کرام نے اس راز کو سمجھا ہے کیونکہ انکو حضورؐ سے محبت تھی اور محبت کی یہ شان ہے کہ محبوب کی گزشتہ تکلیف تک سے محب متاثر ہوتا ہے تو اس کے احکام و مرضیات سے تو کیوں متاثر نہ ہوتا۔ صاحبو! اصل یہ ہے کہ جیسی صحابہ کرام کو حضور پُر نورؐ سے محبت تھی ہم کو ویسی محبت ہی نہیں۔ بعض صحابہؓ کی محبت کا یہ لون تھا کہ تمام عمر گزر گئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے کیونکہ محبت کا اختلاف استعداد محب سے ہے۔ ایک یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب غایت درجہ کی محبت ہو جاتی ہے تو محبوب کے دیکھنے کی تاب نہیں رہتی خوب کہا ہے ؎

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو آجاتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجاتا ہے ؎ تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے

غرض بعض صحابہ کو اس رنگ کی بھی محبت تھی کہ حضورؐ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کسی نے ایک صحابی سے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ شریف دریافت کیا تو کہا کہ یہ تو اس سے پوچھو جس نے حضورؐ کو آنکھ بھر کر دیکھا ہو یہاں تو تمام عمر گزر گئی کبھی آنکھوں کو تاب ہوئی کہ نگاہ بھر کر اس پُر جمال کو دیکھ سکیں بیان کروں تو کیا بیان کروں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم — گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم
بخدا کہ رشکم آید ز دو چشم روشن خود ؎ کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

صحابہؓ حضورؐ کی محبت میں بے چین تھے حتیٰ کہ وہ حضورؐ کی گزشتہ تکلیف کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کے دستر خوان پر عمدہ گوشت آیا فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کی تکلیف یاد آگئی تو زار زار آنسو جاری ہو گئے کھانا اٹھا دیا اور نہ کھایا۔ حضورؐ نے ہماری وجہ سے بہت فاقہ کشی کی ہے کہ مہینوں چولہے میں آگ تک نہیں جلی یہ حضر رہے کہ یہ فاقہ دنیا کے کم ہونے کی وجہ سے اٹھایا لیکن خود دنیا کی کمی حضورؐ نے ہماری محبت ہی کی وجہ سے اختیار کی کیونکہ جانتے تھے کہ امت میری عاشق ہے وہ میرا اقتدا کرے گی اگر میں دنیا کو لوں گا تو امت اس کو سنت خیال کر کے دنیا کے پیچھے چل پڑے گی اور مجھ کو تو دنیا کے اختیار کرنے سے کچھ ضرر نہ ہو گا مگر امت دنیا کی طرح طرح کی مضرتیں اٹھاتے گی بعض لوگ اس سنت کو آڑ بنا کر دنیا کی طلب ایسے طریقہ سے کر رہے ہیں

کہ گنہگار رہو کر عند اللہ ماخوذ ہونگے جو اعلیٰ درجہ کی تکلیف کا باعث ہے اس وجہ سے آپ نے دنیا کو چھوڑا اور فاقہ کی تکلیف اٹھائی۔

ہر فعل ماثور مسنون ہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ضرور نہیں کہ جس فعل کو حضورؐ کر لیں وہ ہر حال میں مسنون ہی ہوا گر ایسا ہوتا تو حضورؐ بعض افعال کو ہمارے خیال سے ترک کیوں کرتے ؟ کیونکہ وہ تو سنت ہوتا پھر مضر کیوں ہوتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض دفعہ فعل ماثور بھی غلو کی وجہ سے مضر ہو جاتا ہے یہ خوب یاد رکھیئے کہ ہر فعل ماثور ہر حال میں ہر صورت میں موجب ثواب نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ فعل ماثور بعض عوارض کی وجہ سے بالعکس معصیت ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اسکے ساتھ ہی بعض صورتوں میں اس سے ممانعت بھی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

شر الطعام طعام الولیمہ یدعی لھا الاغنیاء ویترک لھا الفقراء الخ

یعنی کھانوں میں برا کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں امراء کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔ دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اس عارض ترک یا طرد فقراء کی وجہ سے شر ہو گیا۔ افسوس آجکل اکثر ولیمے اسی قسم کے ہوتے ہیں جن میں محض برادری کے معززین کو بلایا جاتا ہے اور غرباء کو نہیں پوچھا جاتا بلکہ اس جگہ سے نکال دیا جاتا ہے حالانکہ جن فقراء کو ولیمہ سے نکالا جاتا ہے انکی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : ھل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم

تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ فقراء وضعفاء ہی کی وجہ سے تو دیا جاتا ہے۔ پس نہایت بے حیائی ہے کہ جن کی وجہ سے یہ رزق دیا گیا ہے انہیں کو اس رزق سے دھکے دیئے جائیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر مخلوق میں ایسے بوڑھے نہ ہوتے جن کی کمریں جھک گئی ہیں اور بہائم نہ ہوتے اور شیر خوار بچے نہ ہوتے تو تم پر عذاب کی بارش ہوتی۔ معلوم ہوا کہ ہم عذاب خداوندی سے بوڑھوں اور بچوں بہائم وغیرہ کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں۔

رحمت کا مذہب

صاحبو! شریعت مطہرہ نے بہائم کے بھی حقوق تعلیم کئے ہیں چنانچہ

میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں جانوروں کے حقوق بیان کئے ہیں اسلام نے سب کے حقوق بالتفصیل
بتا دیئے ہیں چنانچہ بہائم کے بھی کچھ حقوق ہیں اور کیوں نہ ہوں جب انکی برکت سے ہم سے عذاب
ٹلا ہوا ہے اسی طرح غریبوں کی وجہ سے ہماری مدد ہوتی ہے اور ہم کو رزق دیا جاتا ہے پھر غرباء کو دھکے
دینا بیحیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ الحاصل ولیمہ اسی حد تک مسنون ہے جس حد کو اسلام نے متعین کر دیا
ہے کہ جس میں غرباء بھی ہوں اور حسب طاقت ہو سودی قرض سے نہ کیا گیا ہو اور اس میں ریا اور
سمعہ کو دخل نہ ہو اور تکلفات نہ ہوں خالصاً لوجہ اللہ ہو وہ ولیمہ مسنون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے یہاں جو سب سے بڑا ولیمہ تھا اسمیں محض ایک بکری ذبح کی گئی تھی۔ آپ نے کر کے دکھلا دیا کہ
اس طرح کام کیا کرتے ہیں۔

اس حدیث سے ایک مشہور اشکال کا بھی جواب ہو گیا وہ یہ کہ بعض فرقے اسلام کو بے رحم
بتلاتے ہیں اس وجہ سے کہ اسلام نے ذبح بہائم کو جائز رکھا ہے میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام بے رحم
ہوتا تو ہرگز بہائم کے حقوق کی تعلیم نہ کرتا اور اجازت دیتا کہ بہائم کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ
کرو خواہ سختی کا خواہ نرمی کا حالانکہ اسلام پکار رہا ہے کہ بہائم کے حقوق کا لحاظ رکھو ان پر بے جا
سختی مت کرو جو کام ان کے متعلق ہو وہ لے لو پھر راحت دو طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ
لادو اور جب سفر کرو تو کبھی کبھی راستہ میں انکو گھاس چرنے کی بھی مہلت دیدیا کرو اور جانوروں
کو ہانکتے ہوئے ان کو گالی نہ دیا کرو اور منزل پر پہنچ کر انکو زین وغیرہ سے الگ کر دو اور پہلے
ان کے چارہ کا انتظام کر کے پھر کسی اور کام میں لگو اس کے علاوہ بہت سے حقوق ہیں جن کی تفصیل میرے
رسالہ ارشاد الہائم فی حقوق البہائم میں مذکور ہے جن کی نظیر کوئی باطل مذہب نہیں دکھا
سکتا ____ رہی ذبح بہائم کی اجازت تو نہ یہ بیرحمی ہے نہ اسمیں جانور کو تکلیف ہوتی ہے
جس کی تفصیل آئندہ اس مقام کے بعد جہاں حضرت نوح علیہ السلام سے برتن بنوانے اور پھر توڑ دلانے
کا قصہ مذکور ہے آئے گی۔

ذبح بقرہ

بعض مسلمان ہنود کے میل جول کی وجہ سے گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا پسند
نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کچھ گوشت خوری پر موقوف نہیں اسلام
میں گوشت کھانا اور نہ کھانا دونوں یکساں ہیں گائے کا گوشت نہ کھایا تو بکری کا کھا لیا اسمیں کیا

ترجیح ہے گائے کا گوشت کھانا فرض تھوڑا ہی ہے۔

افسوس ان لوگوں نے شریعت خداوندی کے مقابلہ میں اپنی ایک شریعت گھڑلی ہے ان لوگوں نے یہ مسئلہ ہنود سے لیا اس لئے کہ ہنود بھی یہی کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت مت کھاؤ کہ رحم کے خلاف ہے بکری وغیرہ کا کھاؤ حالانکہ یہ قول بالکل عقل سے بھی بعید ہے اسواسطے کہ جو بے رحمی گائے کے ذبح میں ہے وہی بیرحمی بکری وغیرہ تمام جانوروں کی ذبح میں ہے اگر بکری وغیرہ کا ذبح بیرحمی نہیں ہے تو گائے کا ذبح بھی بیرحمی نہیں اب ہم کو بتلایا جائے کہ گائے کا ذبح کیوں بیرحمی ہے اور بکری کا ذبح کیوں بیرحمی نہیں ــــ؟

بعض کہتے ہیں کہ گائے کے ذبح میں دُودھ گھی میں کمی آجاتی ہے یہ بالکل غلط ہے، گائے سے زیادہ دُودھ گھی بھینس کا ہوتا ہے پھر اسکی کیا وجہ ہے کہ ہندو اور ان کے حامی مسلمان گائے کے ذبح سے روکتے ہیں اور بھینس کے ذبح کی اجازت دیتے ہیں حالانکہ اسمیں دُودھ گھی کا نقصان بہت زیادہ ہے گائے کا دودھ گھی تو بیماروں کو بتلایا جاتا ہے، تندرست آدمی تو اکثر بھینس کا دُودھ گھی استعمال کرتے ہیں مگر اس کے ذبح پر کسی کو اعتراض نہیں نہ یہ بیرحمی شمار کیا جاتا ہے ہاں گائے کے ذبح پر ہندوؤں کا بھی اعتراض ہے اور بعض مسلمان بھی انکی حمایت کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ دلائل تو محض بہانے ہیں اصل بات یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کا معبود ہے اس کا ذبح اس لئے انکو ناگوار ہے پھر ان مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ جس اعراض کا منشا شرک ہے اس میں وہ ہندوؤں کی موافقت وحمایت کرتے ہیں۔ غرض اپنی خواہش کے موافق جس کو چاہا کھالیا جس کو جی نہ چاہا نہ کھایا۔

ایسے مسلمانوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کسی نے تمام قرآن میں سے دُو چیزیں پسند کی تھیں احکام میں سے تو کلوا واشربوا کھاؤ اور پیو۔ اور دعاؤں میں سے یہ دعا ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء اے اللہ آسمان سے ہم پر دستر خوان اُتار دیں جس طرح اس شخص نے اپنی خواہش کے مطابق قرآن پاک سے صرف دُو چیزیں چھانٹیں اور باقی کو چھوڑ دیا اسی طرح ان مسلمانوں نے بھی حسب خواہش کچھ جانور اپنے لئے اختیار کر لئے اور باقی جانور جو شریعت اسلام میں حلال

ہیں چھوڑ دیجئے۔

صاحبو! لگائے کا کھانا اگرچہ اسلام میں مباح ہی ہے واجب اور فرض نہیں لیکن کسی فرقۂ مخالف اسلام کی دلجوئی و خوشنودی کی غرض سے اور وہ بھی محض مردار دنیا کے لئے اس کا چھوڑنا سخت گناہ ہے اور اسلام کی کھلی مخالفت ہے۔

آپؐ کے ترک دنیا کی وجہ

یہ تو جملہ معترضہ تھا اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ حضورؐ نے دنیا کو اسواسطے پسند نہ کیا کہ آپ جانتے تھے کہ میرے اس فعل سے امت مشقت میں پڑ جائے گی اور یہ دنیا ان کو مضر ہوگی ورنہ آپ کے لئے کیا کمی تھی اگر آپ دنیا چاہتے تو تمام دنیا غلام بن کر تابع ہو جاتی اور جہاں آپ تشریف لے جاتے دنیا آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کی معرفت آپؐ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ اگر آپؐ دنیا لینا چاہیں تو جبل احد کو سونے کا بنا کر اس طرح تابع کر دیں کہ اگر آپؐ سفر میں بھی تشریف لے جائیں تو یہ آپؐ کے ہمراہ رہے آپؐ نے فرمایا کہ اے اللہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز فاقہ رہے اور ایک روز کھانا ملے فاقہ کے روز صبر کروں اور کھانے کے دن شکر کروں۔ یہ کیوں؟ محض ہمارے لئے کیونکہ ہمارے لئے دنیا مضر تھی ورنہ آپ کے لئے کچھ بھی مضر نہ تھی

اس کے متعلق ایک مرتبہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کامل کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر جاننے والے کے پاس سانپ اور ناقص کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر سے ناواقف کے پاس سانپ منتر جاننے والے کے پاس سانپ ہو تو مضر نہیں بخلاف ناواقف کے کہ اس کے ہاتھ میں سانپ مضر ہے جب کامل اور ناقص میں یہ فرق ہے پھر حضورؐ تو اکمل الکاملین تھے آپؐ کو دنیا کیا مضر ہوتی مگر باوجود عدم مضرت کے پھر آپنے دنیا کو صرف اس واسطے نہ لیا کہ میرے بعض امتی میرے اس فعل کو آڑ بنا کر دنیا پر گر جاویں گے اور مضرتیں اٹھائیں گے۔

دیکھا آپ نے کہ حضورؐ کو امت پر کس قدر شفقت تھی اسی وجہ سے آپنے بہت سے کام جو آپ کر سکتے تھے اور کرنا چاہتے بھی تھے صرف ہماری مضرت کے خوف سے بوجہ ہم پر شفقت

کے نہ گئے چنانچہ آپ بارش میں نماز عید گاہ میں جا کر ادا کر سکتے تھے کیونکہ بارش کو تو آپ محبوب رکھتے تھے چنانچہ جب بارش ہوتی تو آپ اپنا کرتہ اُتار کر بدن پہ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ پانی تازہ بتازہ میرے خدا کی طرف سے آیا ہے۔

قوتِ نبوی

اور اس کے علاوہ آپ کوئی نازک اور کمزور بھی نہ تھے بلکہ طبعی طور سے حضور کا مزاج بہت قوی تھا چنانچہ آپکی نو بیبیاں تھیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شب میں تمام بیبیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ کتنی کامل قوت کی دلیل ہے۔ پھر یہ ابتدائی جوانی کا واقعہ نہیں۔ جوانی میں تو آپ نے ایک نکاح سے زیادہ نہیں کیا تھا بلکہ ۹ بیبیاں آپ کے پاس اُس وقت تھیں جب کہ پچاس سے آپکی عمر متجاوز ہو گئی تھی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ آپ میں تیس مردوں کی قوت تھی۔

محققین نے فرمایا ہے کہ دنیا کے مردوں کی نہیں بلکہ جنت کے مردوں کی اور جنت کے ایک مرد میں سو مردوں کی قوت ہے اس حساب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تین ہزار مردوں کی قوت ہوئی اور معمولی مرد کے لئے اسلام نے چار عورتوں کی اجازت دی ہے تو اس حساب سے آپ کے لئے بارہ ہزار عورتوں کی اجازت ہوتی مگر باوجود اتنی قوت کے آپ نے صرف نو بیبیوں کو اختیار کیا جن کو آپؐ کی قوت کے اعتبار سے عشر عشیر کی بھی نسبت نہیں ہے اس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے نفس کش تھے کہ دنیا بھر میں آپ کا نفس کشی میں کوئی نظیر نہیں مل سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس کو بارہ ہزار روٹیوں کی خواہش ہو اور یہ مقدار بلا کسی مزاحم اور بلا مانع بلا مشقت کے ہر طرح سے اس کو میسر بھی ہو سکتی ہو پھر بھی وہ صرف نو روٹیوں پر اکتفا کرے تو یہ نفس کشی نہیں تو اور کیا ہے کیا کوئی عاقل سوا معاند کے ایسے شخص کو عیش پرستی کا نام دے سکتا ہے ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ آپ کی قوت کا یہ حال تھا کہ آپ کی عمر شریف تریسٹھ سال تھی مگر تمام بال سیاہ تھے بجز چند بالوں کے جن کی شمار بیس سے بھی کم تھی کہ وہ سفید تھے اور یہ حالت بفکری کی وجہ سے نہ تھی حضورؐ کو تو طرح طرح کی ایسی فکریں تھیں کہ دنیا میں کسی کو بھی نہیں ہو سکتیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

---

۵ شمائل ترمذی۔ رواہ الترمذی مجاہد مرسلاً ۱۲ ط

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
دائم الحزن طویل الفکرۃ :

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر اور غم ہی میں رہتے تھے رات دن میں کوئی آن ایسی نہ تھی کہ فکر سے خالی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ قسم ہے اللہ کی اگر تم ان امور کو دیکھو جن کو میں دیکھتا ہوں اور تمکو اُن باتوں کی خبر ہو جائے جن کی مجھ کو خبر ہے تو تم عمر بھر روتے پھرو اور ہنسنا بھول جاؤ۔ میں اسرافیل کو دیکھ رہا ہوں جو صور کو منہ میں لئے کھڑے ہیں حکم کے منتظر ہیں کہ اب حکم ہو اور انہیں پھونک ماردوں کہ سارا عالم درہم وبرہم ہو جاوے۔ ایسی حالت میں مجھ کو کیسے چین آئے اور میں کیسے بے فکر ہو بیٹھوں ایک روایت میں ہے، شیبتنی سورۃ ھود باوجودیکہ ایسی فکر اور تریسٹھ سال کی عمر پھر بھی بیس بال تک سفید نہ ہوں یہ نہایت قوۃ مزاج کی دلیل ہے۔ غرض آپ نازک مزاج اور کمزور نہ تھے کہ بارش میں چلنا دشوار ہوتا موت سے زیادہ تو کوئی مصیبت نہیں مگر جب اولیاء اللہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ موت کو دوست رکھتے ہیں اور اس دن کی تمنا کرتے ہیں اس لئے کہ یہ وسیلہ ہے محبوب سے ملنے کا۔

خرم آنروز کزیں منزل ویراں بروم ٭ راحت جاں طلبم وز پے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ٭ تا درمیکدہ شاداں وغزل خواں بروم

تو حضور اس ذراسی بارش سے کیا ڈرتے یہ محض امت پر شفقت تھی۔

غرض یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک مرتبہ مسجد میں عید کی نماز پڑھی اور تمام عمر عیدگاہ میں نماز پڑھی اور حیض والی عورتوں تک کو عیدگاہ میں آنے کا آپ نے حکم فرمایا جس سے عیدگاہ میں آنے کی عظمت اور اہتمام شان ظاہر ہے گو بعد میں احادیث ہی سے سمجھ کر صحابہ نے اس سے روک دیا۔

تارک قربانی کیلئے وعید مگر اسی کے ساتھ حضور کا حکم ہے کہ جس نے باوجود وسعت کے قربانی نہ کی ہو وہ ہمارے مصلی (عیدگاہ) کے قریب آئے یوں نہیں فرمایا کہ عیدگاہ میں نہ آوے بلکہ یوں فرمایا کہ اس کے قریب تک بھی نہ آئے۔ قربانی نہ

کرنے والے سے کس قدر نفرت معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو حکم دیا کہ مصلے مسلمین کے پاس تک نہ پھٹکے۔

صاحبو! اگر عزت ہو اور حضورؐ کی محبت ہو تو یہ بڑی سخت بات ہے مگر افسوس کہ استقلال تو قربانی کی تاکید ہے مگر بعض مسلمان پھر بھی نہیں کرتے۔

برائے نام قربانی

اور بعض ایسے بھی ہیں کہ قربانی تو کرتے ہیں مگر محض برائے نام ہی کرتے ہیں خواہ عنداللہ مقبول ہونے کے قابل ہو یا نہ ہو چنانچہ کانپور میں ایک لوہار تھے انہوں نے قربانی کے لئے ایک ایسا بکرا تجویز کیا جس میں سب ہی عیب تھے ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسا جانور کیوں ذبح کرتے ہو لوہار بولا واہ صاحب ہماری بیوی صاحبہ کا فتویٰ ہے کہ اسکی قربانی جائز ہے اس شخص نے کہا کہ ذرا ہم کو بھی دکھلانا چاہیئے کہ آپ کی بیوی نے کہاں سے فتویٰ دیا ہے۔ لوہار گھر گیا اور بیوی سے ذکر کیا کہ حضور کے فتوی کو بعض لوگ نہیں مانتے ذرا انہیں بھی قائل کر دو۔ وہ اتفاق سے اردو پڑھی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکال کر دکھلایا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ جس جانور کے تہائی سے کم دم وکان ناک وغیرہ کٹی ہوں وہ جائز ہے اس بکری میں چونکہ ہر چیز تہائی سے کم کٹی ہوئی ہے اور یہ عیب موثر نہیں لہذا جائز ہے اس شخص نے کہا کہ بھائی ہم شرح وقایہ تو سمجھتے نہیں علماء کے پاس چلو اور یہ جانور ان کو دکھلاؤ پھر وہ جو حکم دیں۔ لوہار کہنے لگا کہ بس صاحب ہم کو تو ہماری بیوی کا فتویٰ کافی ہے کسی عالم کو دکھلانے کی حاجت نہیں۔ بس اس لوہار کو صرف قربانی کا نام کرنا تھا۔

فضیلت قربانی

غرض بعض لوگ برائے نام قربانی کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کی عظمت ان کے دلوں میں نہیں ہے اس وقت میں اسکی عظمت ہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ اب اس حدیث کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کے دو جزو ہیں ایک جزو میں تو فضیلت قربانی کی بیان فرمائی ہے اور دوسرے جزو میں حقیقت قربانی بیان فرمائی ہے یعنی جب حضورؐ نے قربانی کی فضیلت یہ فرمائی کہ ہر بال کے عوض نیکیاں ملتی ہیں تو صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول حقیقت قربانی کی کیا ہے؟

حقیقی ادب صحابہؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب حضورؐ کو خوش مزاج پاتے تھے تو سوال کیا کرتے تھے اور حضورؐ اگر مناسب سمجھتے جواب دیدیتے تھے ورنہ منع فرمادیتے تھے چنانچہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے سے آپ نے صحابہ کو منع فرمایا کہ اس میں گفتگو مت کرو، تمہاری فہم سے بالا ہے جس طرح حکم خداوندی ہے مان لو اس کے بعد صحابہ جواب کے لئے اصرار نہیں کرتے تھے۔ اور یہ عدم اصرار غایت ادب کی وجہ سے تھا صحابہ حضور کا بیحد ادب کرتے تھے اور طریق ادب میں بہت ہی کامل تھے، صاحبو! عالم بن جانا آسان ہے مگر ادب نہایت مشکل ہے ادب کا طریقہ ہر شخص نہیں جانتا۔ بعض طریقے ادب کے ایسے ہیں کہ اہل علم بھی نہ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں گو درسی علم رکھتے ہیں، مگر ادب جاننا اس کے لوازم سے نہیں بقول عارف شیرازیؒ ؎

شاہد آن نیست کہ موئے ومیانے دارد ⁂ بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

؎ نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ⁂ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست ⁂ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

کسی نے خوب کہا ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ⁂ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ادب کے متعلق مجھے بلگرام کی ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے، ان کی خدمت میں ایک شاگرد سبق پڑھنے آئے دیکھا کہ چہرہ مرجھایا ہوا ہے سمجھ گئے کہ آج فاقہ ہے، عرض کیا کہ حضرت آج مجھے سبق پڑھنے سے عذر ہے اجازت چاہتا ہوں کہ سبق ملتوی رکھا جائے اجازت لے کر اٹھے اور گھر جاکر بہت سا کھانا لے کر خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت اس کو قبول فرمالیجئے فرمایا کھانا تو ایسے وقت آیا ہے کہ واقعی مجھے حاجت ہے مگر ایک عذر شرعی کی وجہ سے نہیں قبول کرسکتا عرض کیا حضرت وہ عذر کیا ہے فرمایا حدیث شریف میں آیا ہے جو چیز تمہارے پاس بغیر اشراف نفس یعنی بغیر انتظار وطمع نفس کے آئے اس کو لے لو یعنی ورنہ نہیں۔ اے بیٹا جب تم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اسی وقت میرے نفس میں یہ آیا تھا کہ یہ کھانا لینے گئے ہیں اس وقت سے اب تک نفس کو اس کھانے کا انتظار تھا لہذا میں اس کھانے کو قبول نہیں کرسکتا۔ سبحان اللہ یہ ہے اتباع سنت کہ حاجت شدیدہ میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ایک ہم ہیں کہ ضرورت

کے وقت فرائض کا بھی پرواہ نہیں کرتے۔

پھر دوسرا کمال یہ کہ اپنی احتیاج کو بھی ظاہر کر دیا اور نفس کے انتظار کی بھی قلعی کھول دی جو کچھ بات تھی سیدھی سیدھی بیان کر دی نہ کچھ تصنع کیا نہ بناوٹ۔ صاحب جس کے پاس کھرا مال ہو گا وہ خریداروں کی پرواہ نہیں کیا کرتا بلکہ خود خریدار اس کی پرواہ کیا کرتے ہیں اور جس کے پاس کھوٹا مال ہوتا ہے وہ طرح طرح کی بناوٹیں کر کر کے خریداروں کو جاتا ہے بس جو واقعی اہل اللہ ہیں ان کو اسکی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی ہمارا معتقد رہے گا یا نہیں بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ بہتر ہو کہ کوئی ہمارا معتقد ہی نہ ہو کیونکہ ان کے معمولات میں مخلوق کی آمد و رفت سے نقصان ہوتا ہے گو وہ اپنی خوش اخلاقی سے کسی کو منع نہ فرمائیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ فلاں اپنے مرید کو منع کر دیجئے کہ وہ فلاں کام نہ کرے ایسا نہ ہو کہ اس کا اثر آپ تک پہنچے کہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میاں کسی پر کیوں رکھتے ہو تمہارا جی چاہتا ہو بدگمان ہونے کو تو ہو جاؤ اور میاں تم نے تو گویا مجھے بڑی دھمکی دی ہے کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ مجھے تو تمہارے اس اعتقاد نے پریشان کر رکھا ہے۔ بہت اچھا ہو کہ مجھ سے لوگوں کا اعتقاد جاتا رہے کوئی میرے پاس نہ آئے بس تنہا میں ہوں اور میرا اللہ ہو بقول جامیؒ ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے ٭ کہ یارے برخورد از وصل یارے

بعض دفعہ اہل اللہ خود اسکی تدبیر کیا کرتے ہیں کہ کوئی ہمارا معتقد نہ رہے چنانچہ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ سے میرٹھ میں معتقدین نے وعظ کے لئے درخواست کی تو آپ نے جس وقت وعظ شروع کیا تو مولوی عبدالقیوم صاحب کو جو اس وقت بچے تھے اپنے زانو پر بٹھلا لیا اور درمیان وعظ کے کبھی کبھی ان سے فرماتے گال پھلاؤ وہ پھلاتے اور آپ اس کو پچکا دیتے غرض اس قسم کی حرکات عین وعظ میں کرتے رہے اور یہ افعال اس غرض سے کئے جا رہے تھے تاکہ لوگ غیر معتقد ہو جائیں مگر کوئی غیر معتقد نہ ہوا پھر وعظ کے بعد ایک بہت بڑے رئیس مصافحہ کے لئے آگے بڑھے آپ نے ان کی ناک پکڑ کر ہلا دی اس رئیس نے عرض کیا کہ حضرت ہماری عقیدت ایسی نہیں ہے کہ ایسے افعال کی وجہ سے ہم آپ کو چھوڑ دیں غرض بعض بزرگ خود ایسے افعال کرنے

لگتے ہیں کہ مخلوق خود بخود ہم سے بھاگ جانے اور معتقدوں کے کم ہونے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے ان کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ؎ مانمیخواہیم ننگ و نام را

اور یہ ہوتا ہے کہ

ساقیا برخیز و در دہ جام را ؎ خاک برسر کن غم ایام را

ایک بار یہی مولانا شہیدؒ لکھنؤ تشریف لائے تو ایک شہزادہ زیارت کو حاضر ہوا اور حسبِ دستور اودھ شہزادہ نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تین دفعہ فرشی سلام کیا۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے تینوں دفعہ انگوٹھا دکھلا دیا۔ شہزادہ شرمندہ ہوا اور برہم ہو کر مجمع حاضرین میں بیٹھ گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو ایک اشرفی مولانا کی نذر کی مولانا نے منہ چڑا دیا شہزادہ کو غصہ ہو کر چلا گیا۔

بعد میں حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت وہ تو سلام کرتا تھا اور آپ انگوٹھا دکھلاتے تھے یہ کیا بات تھی۔ فرمایا شریعت میں تو اس طرح سلام ہے نہیں۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ وہ یوں کہتا ہے کہ میری قسمت پھوٹ گئی۔ میں نے کہا کہ میرے ٹھینگے سے۔ غرض اولیاء اللہ دل کی بات صاف کہہ دیتے ہیں کسی کے غیر معتقد ہونے سے نہ ڈرتے ہیں نہ کسی کے معتقد ہونے کی پرواہ کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اُن بنگرامی بزرگ صاحب نے صاف کہہ دیا کہ نفس کو اس کھانے کا انتظار ہو گیا تھا اس وجہ سے میں نہیں لیتا اور یہ عذر شرعی ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو چیز بدوں انتظار کے آئے وہ لے لو۔

اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ جو چیز انتظار کے بعد آئے وہ نہ لو اگر اس موقع پر ہم ہوتے تو اصرار کرتے کہ نہیں حضرت لے ہی لیجئے قبول ہی فرما لیجئے جیسا دستور ہے مگر وہ شاگرد نہایت سمجھدار و فہیم تھے اور طریقہ ادب سے واقف اور سچی محبت کرنے والے تھے انہوں نے ذرا بھی اصرار نہ کیا (اب تو محض رسم پرستی ہے محبت و ادب کچھ نہیں ہے) چنانچہ یہ کہہ کر کہ بہت اچھا فوراً کھانا واپس لے گئے اور نظر سے غائب ہو کر پھر فوراً واپس آگئے اور کھانا پیش کر کے عرض کیا کہ حضرت اب تو نفس کو وہ انتظار نہ رہا تھا بلکہ نفس مایوس ہو چکا تھا کہ آیا ہوا کھانا جاتا رہا۔ سو اب تو قبول فرما لیجئے اب تو عذر شرعی بھی نہ رہا۔ وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور دُعا دی۔

غرض رسوم کے غلبہ سے طرز ادب مشکل ہے، اور حقائق پر نظر ہو تو کچھ مشکل بھی نہیں وہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے محبت کی ضرورت ہے مگر آجکل تو محبت کا دعویٰ ہی دعویٰ ہوتا ہے اگر سچی محبت ہو تو خود محبت ہی طرز خدمت سکھا دیتی ہے (قال الشاعر)

محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دیگی ؎ ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر)

حضرت صدیق اکبرؓ نے قبل از اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خدمت کرنا چاہی جبکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے آپ کا نکاح ٹھہرا تو حضرت خدیجہؓ بڑی امیر تھیں بڑی عاقل بھی تھیں تجارت کے ذریعہ سے مال بڑھاتی تھیں یہاں تک کہ بہت سے غلام اور جانور آپ کے پاس تھے نقد بھی بہت کچھ تھا ادھر حضورؐ کے یہاں مال زیادہ نہ تھا لیکن حضور کا خاندان ہمیشہ سے معظم اور رئیس سمجھا جاتا تھا گو دعویٰ نبوت سے وہ شان ریاست عامہ کی نہ رہی تھی کیونکہ لوگ مخالف ہو گئے مگر بعد میں پھر پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

—— تو صدیق اکبرؓ نے چاہا کہ اسوقت کچھ آپ کی خدمت روپیہ سے کروں تاکہ خدیجہؓ کے سامنے آپ کی بات ہلکی نہ ہو اگر خرچ نہ ہوا تو بات ہلکی ہو جائے گی اسوقت صدیق اکبرؓ بہت مالدار تھے مگر ساتھ ہی یہ خیال کرتے تھے کہ میری اس خدمت کو آپ کیوں قبول کرنے لگے آپ کو غیرت وحیا اس کے قبول سے مانع ہوگی۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ آپ قبول فرمائیں وہ تدبیر یہ کی کہ عرض کیا کہ حضورؐ آپ کے دادا صاحب نے غالباً میرے دادا کے پاس کچھ امانت رکھی تھی وہ لے لیجئے اس طریقہ سے روپیہ دیا اور آپ نے قبول فرما لیا۔

تو دیکھئے حضرت صدیق اکبرؓ ابھی اسلام بھی نہیں لائے تھے مگر چونکہ آپکو حضورؐ سے سچی محبت تھی اس نے خدمت کا یہ طریقہ خود بخود انکو سکھلا دیا الحاصل ادب کے سبب صحابہ کا یہ مذاق تھا کہ حضورؐ سے ایک بات پوچھی اگر آپ خاموش ہو گئے تو پھر جواب پر اصرار نہیں کرتے تھے پھر کسی دوسرے وقت اگر ضرورت سمجھتے تو موقع محل دیکھ کر مکرر عرض کر کے جواب حاصل کر لیتے تھے۔

حقیقت قربانی عرض جب فضیلت قربانی کی صحابہؓ نے سُنی تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ حقیقت قربانی کی کیا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا سنۃ ابیکم

ابراھیم یعنی تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ اور سنت ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو جو آپؐ نے باپ فرمایا تو اس لئے فرمایا کہ مخاطب عرب ہیں اور اکثر عرب کا سلسلہ نسبی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے تو اس صورت میں ابراہیم علیہ السلام کا باپ ہونا حقیقۃً ہوگا اور اگر مخاطب کل امت کو مانا جاوے اس صورت میں ابراہیم علیہ السلام کا کل امت کے لئے باپ ہونا مجازاً ہوگا یعنی روحانی باپ اور روحانی باپ وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے روح اور نفس کی اصلاح ہو اور ہماری روحانی اصلاح کا سلسلہ ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے لہذا وہ ساری امت کے روحانی باپ ہیں۔ تو باپ کے پہلے معنی ظاہری ہیں اور دوسرے معنی باطنی۔

اور اتفاق سے اسی طرح خود مقصود حدیث بھی دو معنی کو مشتمل ہے یعنی جس طرح ابکم میں ایک ظاہری معنی ہیں ایک باطنی معنی اسی طرح سنت ابراہیم کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لکل آیۃ ظھر وبطن یعنی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ میں اس کی تحقیق بھی مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ظاہر اور باطن کے کیا معنی ہیں بیان اس کا یہ ہے کہ بعض معانی تو وہ ہیں کہ جو مدلول قرآن بدلالت لغویہ ہوں اور بعض وہ ہیں جو مدلول بدلالت لغویہ نہ ہوں پھر اسکی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ معنی کسی طرح سے بھی مدلول قرآنی نہ ہوں نہ بواسطہ نہ بلاواسطہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معنی مدلول قرآنی ہوں لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ بواسطہ ہوں پس اگر قرآن کے ایسے معنی گھڑے جائیں جو قرآن کا کسی طرح مدلول نہ ہو تو یہ معنی بالکل غلط ہوں گے اور یہ مسلک فرقہ باطنیہ کا ہے، جیسے اذھب الی فرعون میں فرقہ باطنیہ نے اس کے یہ معنی لئے ہیں کہ اے روح تو نفس کے پاس جا یعنی ان کے نزدیک موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے اور اس فرقہ نے قصہ موسیٰ و فرعون کو تو بالکل ہی اڑا دیا ہے جو مدلول قرانی بدلالت ظاہرہ تھا اور اپنی طرف سے ایک نئے معنی گھڑ لئے۔ محققین صوفیہ نے اسکی نسبت فرمایا ہے کہ یہ فرقہ باطنیہ ملحد ہے جو مسلمانوں کا لباس پہن کر اسلام کو مٹانا چاہتا ہے اور محققین صوفیہ نے برخلاف اس فرقہ باطنیہ کے اس آیت کی دو توجیہیں کی ہیں ایک یہ کہ اے موسیٰ فرعون کی طرف جا۔ یہ معنی تو مدلول قرآنی

بدلالت ظاہرہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ الخ دوسرے معنی بواسطہ یہ کئے ہیں کہ اے قرآن کے دیکھنے والے اور اے قرآن کے پڑھنے والے جب تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصہ کو پڑھے تو اس قصہ پر اپنے حال کو قیاس کر یعنی تیرے اندر جو منشاً ہے اعمال صالحہ کا یعنی روح جو مثل موسیٰ کے ہے اُس کو قوت پہنچا کر اس کے ذریعہ سے نفس کی جو کہ افعال قبیحہ کا منشا ہونے میں مثل فرعون کے ہے مغلوب کر۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

موسیٰ و فرعون در ہستی تست

یہ معنی بھی مدلول قرآنی ہیں لیکن بواسطہ ایک قسم کے قیاس کے کیونکہ اسکی حقیقت یہ کہ اس قصہ ظاہرہ سے سبق لے کر اپنے نفس میں اس کو جاری کیا گیا ہے پس دراصل یہ تفسیر نہیں بلکہ ایک قسم کا قیاس ہے جو اصطلاح میں اعتبار کہلاتا ہے دوسروں کے قصہ سے عبرت حاصل کرنا اور عبرت حاصل کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اپنی حالت میں غور کر کے دیکھا جائے کہ میرے اندر تو اس قصہ کے مشابہ کوئی حالت نہیں ہے اگر ہے تو جو نتیجہ قصہ کے اندر مذکور ہے اس سے متنبہ ہونا چاہیئے۔

اور اعتبار کا حق تعالیٰ نے امر فرمایا ہے کہ قرآن کے قصوں سے عبرت حاصل کرو چنانچہ ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں :

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب

کہ ان لوگوں کے قصہ میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے اور اس صورت میں مدلول ظاہری بھی منتفی نہ ہوگا بلکہ عبرت حاصل کرنے کے لئے اصل قصہ کو بحال خود رکھنا لازم ہوگا۔ غرض ہر آیت کے اسی طرح دو معنی ہیں ظاہر اور باطن اور ہر معنی نہایت عجیب و لطیف ہیں اسی باب میں کہا گیا ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد ؛ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

قرآن عجیب کلام ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے موافق حصہ لیتا ہے اہل ظاہر ظاہری معنی سے اور اہل باطن باطنی و ظاہری دونوں سے ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس ؛ رونمائے رب ناس آمد بہ ناس

حرف، حرفش راست در بر معنیٔ ٭ معنیٔ در معنیٔ در معنیٔ

اسی طرح حدیث کو سمجھ لیجئے، غرض ہر نص کا ایک ظاہر ہے ایک باطن یا یوں کہئیے کہ ایک صورت ہے ایک حقیقت۔

اسی طرح یہاں بھی قربانی کا سنت ابراہیم ہونا جو کہ مقصودِ حدیث ہے اس کا ایک ظاہر ہے ایک بطن یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو مدلول ظاہری تو اس کا بھی ذبح ولد تھا اور بطن وہ ہے جو کہ رات میرے ذہن میں آیا ہے جس کی تفصیل ابھی آتی ہے۔ سنئے کہ جب صحابہ نے اضحیہ کی حقیقت دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا سنۃ ابیکم ابراھیم یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔

تعلیم پدری اور آداب فرزندی

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ باپ کا طریقہ کیا ہے سو ظاہر ہے کہ باپ کا طریقہ وہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے پس اس طریقہ کو قرآن ہی سے تحقیق کرنا چاہئے پس قرآن کا جو مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ طریقہ ولد کو ذبح کرنا ہے کیونکہ دنبہ کے ذبح کا حکم قرآن میں مذکور نہیں بلکہ اولاً بیٹے ہی کے ذبح کا قصہ مذکور ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد ہی تھا نہ کہ ذبح کبش پس نص قرآنی کا ظاہر یہی ہے کہ یہ سنت ابراہیم جو حدیث میں مذکور ہے ذبح ولد ہو۔

چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کا خواب دیکھا تھا چونکہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے لہذا اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو مذبح میں لے گئے اور وہاں ان سے اپنا خواب اس طرح بیان کیا :

یا بنیّ انی اریٰ فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تریٰ

اے میرے پیارے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ سو دیکھو اسمیں تمہاری کیا رائے ہے ــــــــ؟

سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا عجیب اور سہل طریقہ ہے کہ مخاطب پر بالکل بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ ان سے سوال کرتے ہیں اور اس طریقہ خاص کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بشاش ہو کر تعلیم کو ضرور قبول کر لیتا ہے۔ یہ طرز تعلیم نہایت موثر ہوتا ہے، باوجود کہ

ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ ذبح اسمعیل علیہ السلام کا پختہ تھا مگر پھر بھی یوں نہیں فرمایا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے میں تجھ کو یہاں ذبح کرنے کیواسطے لایا ہوں تو ذبح کے لیے تیار ہو جا آپ نے اس مضمون کو جو طبعاً نہایت سخت اور خوف میں ڈالنے والا تھا کس سہل عنوان سے بیان فرمایا کہ اے بیٹے میں نے یہ خواب دیکھا ہے بولو تمہاری کیا رائے ہے گویا ان سے مشورہ لیا اور اسکی تعبیر پوچھی

اب بھی اگر کوئی شخص اس طرز تعلیم کو اختیار کرے تو نہایت مؤثر اور نافع مخلوق ہوگا چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے وعظ میں ایک شخص حاضر ہوا آپ نے دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے جب وعظ ختم ہوا اور لوگ چلنے لگے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں مجھ کو آپ سے ایک کام ہے جب سب چلے گئے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے تم کو اس لئے روکا ہے کہ بھائی ذرا میرے پاجامہ کو دیکھو مجھ کو شبہ ہو جاتا ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے آیا یہ میرا خیال ہی خیال ہے یا واقعی ٹخنوں سے نیچا ہے کیونکہ جس کا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہوگا وہ دوزخ میں جلائے گا وغیرہ وغیرہ تو بھائی دوزخ کا سخت عذاب ہے مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ذرا اچھی طرح میرے پاجامہ کو دیکھ لو۔ یہ سنتے ہی وہ شخص شرما گیا اور پیروں میں گر پڑا اور کہا کہ حضرت آپ کا پاجامہ تو نہیں لٹکتا ہے البتہ مجھ نالائق کا لٹکتا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہ ہوگا۔

غرض نرمی سے تدبیر سے بہت کام بنتا ہے اس لئے اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

قل لعبادی یقولوا التی هی احسن

یعنی اے نبی میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بات کریں جو بہتر ہو یعنی اس میں خشونت استعمال نہ ہو یعنی بلا ضرورت اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسمعیل علیہ السلام کو علیحدہ لے گئے اور خواب بیان کر کے فرمایا کہ اسمیں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس عنوان کو اختیار کیا اور صاف صاف جو بات تھی وہ نہ کہی گو اسمیں بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس احتمال کا شبہ ہو سکتا ہے کہ اسمعیل علیہ السلام کا بچپن ہے کہیں ذبح سے گھبرا کر خلاف نہ کہنے لگیں مگر ان کا یہ خیال راسخ تھا کہ

شاباش آں صدف کہ چنیں پرورد گہر — آبا ز دو مکرم و ابنا عزیز تر

یہ ایسا واقعہ تھا جیسا کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے خرچ میں بھی اضافہ فرما دیجئے کیونکہ اب تو فتوحات زیادہ ہونے لگی ہیں اسوقت یہ آیت نازل ہوئی :

یا ایھا النبی قل لا زواجك الخ

چونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے آپ کو خاص محبت تھی اس لئے آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہ رضؓ کو مضمون آیت مذکورہ کا سنایا یعنی اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی طالب ہو تو میں تم کو کچھ دے کر علیحدہ کر دوں پھر مجھ سے تمہارا کچھ تعلق نہ رہے گا اور اگر دنیا کو چھوڑ کر مجھ کو اور اللہ کو اختیار کرو تو تمہارے واسطے اللہ نے آخرت میں بڑے بڑے اجر لکھے ہیں چونکہ حضرت عائشہ کم سن تھیں کیونکہ جب وہ آپ کے گھر میں آئی تھیں تو انکی نو سال کی عمر تھی اور جب حضورؐ کی وفات ہوئی تو اٹھارہ سال کی تھیں، اور چونکہ اس عمر میں تدبر اور تجربہ عادۃً کم ہوتا ہے اس لئے حضورؐ کو احتمال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ عائشہ رضؓ بلا سوچے سمجھے دنیا کو اختیار کر لیں تو فرمایا اے عائشہؓ جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر کے جواب دینا اور ماں باپ کے متعلق یہ شبہ نہ تھا مگر حضرت عائشہ رضؓ کی نسبت حضورؐ کا یہ خیال درجہ احتیاط میں تھا ورنہ ہر ایک کے سینہ میں حضورؐ کی محبت اعلیٰ پیمانہ پر ایسا جوش مار رہی تھی جس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ تھی۔

یہ سنتے ہی فوراً حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارہ میں میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی :

قد اخترت اللہ و رسولہ والدار الاخرۃ

میں نے اللہ کو اور آپؐ کو اور دار آخرت کو اختیار کیا چونکہ حضرت عائشہ رضؓ کا بچپن تھا اسلئے ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ یا رسول اللہ کہ اگر دوسری بیویاں آپ سے دریافت کریں کہ عائشہ رضؓ نے کیا جواب دیا تو آپ نہ بتلائیں آپ نے فرمایا اے عائشہ اگر کسی نے پوچھا تو میں بتلا دوں گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے احکام کا ظاہر کرنیوالا بنا کر بھیجا ہے اسی طرح اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ مشورہ کرتے ہوئے کچھ خیال ہوا بھی ہو کہ دیکھئے اسمٰعیل کیا جواب دیتے ہیں تو وہ درجہ احتیا

میں ہو گا ورنہ خود انکی استعداد فطری میں اس احتمال کی گنجائش نہ تھی۔

عظیم آزمائش

چنانچہ حضرت اسمٰعیل نے فوراً یہی عرض کیا کہ میں اس کا جواب ہی کیا دوں بس اللہ نے جو حکم آپ کو دیا ہے کر گزریئے اور اگر آپ کو یہ شبہ ہو کہ میں اسوقت تو پختہ ہوں مگر شاید عین وقت پر ثابت قدم نہ رہوں تو

ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین

یعنی انشاء اللہ مجھ کو آپ ثابت قدم پائیں گے۔ بس یہ سن کر ابراہیم علیہ السلام ذبح کے لئے تیار ہو گئے اور زمین پر لٹا کر تیز چھری حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر زور زور سے پھیرنے لگے لیکن چھری تھی کہ نہیں چلتی تھی اُسوقت اُدھر سے یہ ہوا:

وناديناه ان يا ابراهيم قد صدقت الرؤيا انا كذالك نجزي المحسنين ان هذا لهو البلٰؤ المبين وفديناه بذبح عظيم ،

یعنی ہم نے اُن کو پکارا کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھلا دیا۔ بیشک کھلا ہوا بڑا امتحان تھا اور ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے ساتھ بدلہ کر کے چھڑا لیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جنت سے ایک دنبہ لایا گیا جو اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلہ میں ذبح ہوا واقعی اُسمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سخت امتحان تھا۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص حالت مغلوبیت و بدحواسی میں اپنے ایسے فرزند کو جو بہت تمناؤں کے بعد بڑھاپے میں پیدا ہوا ہو ذبح کر دے لیکن ہوش و حواس کی حالت میں ہرگز ہمت نہیں ہو سکتی بلکہ ذبح ولد کے بجائے خودکشی نہایت آسان ہے اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل نہایت درستی حواس میں تھا بدحواسی اور مغلوبیت کا یہاں شبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کبھی اس درجہ مغلوب الحال نہیں ہوتے کہ حقائق ان کے ادراک سے غائب ہو جاویں۔ البتہ اولیاء بعض اوقات بیشک اس درجہ مغلوب الحال ہو جاتے ہیں۔

دوسرے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

یا ابراہیم قد صدقت الرؤیا

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو حکم کی تعمیل کی نیت سے قصداً کیا جیسا صدقت کی اسناد سے معلوم ہوتا ہے اور غلبۂ حال میں قصد کامل نہیں ہوتا۔ تیسرے آگے فرماتے ہیں ——— ان ھذا لھو البلٰؤ المبین کہ یہ بڑا صریح امتحان تھا اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے باختیار خود بحالت درستی حواس یہ کام کیا تھا کیونکہ امتحان اسی کا ہوتا ہے جو ہوش و حواس میں ہو بدحواس آدمی جو کچھ کرتا ہے بے اختیاری میں کرتا ہے اور وہاں منجانب اللہ کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ غرض بدحواسی سے انبیاء معصوم ہیں۔

ہاں اولیاء کو بعض اوقات یہ حالت پیش آتی ہے چنانچہ حسین بن منصور علیہ الرحمۃ مغلوب الحال تھے کہ غلبۂ حال میں انا الحق کہہ گئے اور گو وہ اسمیں معذور تھے مگر یہ حالت زیادہ کمال کی نہیں اسی لئے شیخ عبدالحق ردولوی رح نے ان کے باب میں فرمایا ہے منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد برآمد۔ اینجا مردانند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نزنند۔ حالانکہ یہ بزرگ ردولوی رح بھی مغلوب الحال تھے کہ عمر بھر گھر سے جا کر مسجد میں نماز پڑھی لیکن کبھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا ہمیشہ خادم آگے آگے حق حق کہہ کر مسجد میں لیجاتا تھا نیز حضرت مخدوم احمد صابر بھی مغلوب الحال تھے مگر باوجود اس حالت کے شریعت کے خلاف کوئی امر سرزد نہیں ہوا۔ شریعت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ بخلاف اس زمانہ کے صوفیوں کے کہ باوجود مغلوب و معذور نہ ہونے کے ان کا بڑا مایۂ کمال یہی ہے کہ وہ وجد و حال میں شریعت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے۔ جماعت کا وقت ہے لیکن صوفی صاحب حال وقال میں ہیں کچھ خبر نہیں کہ جماعت کدھر ہے اور نماز کدھر ہے کئی کئی وقت کی نمازیں ترک کر دیتے ہیں۔ اور اگر کسی نے پڑھی بھی تو بعض دفعہ اتفاقاً بیہوش ہو کر گر بھی پڑے مگر پھر بھی اسی حالت سے اٹھے اور نماز پڑھ لی حالانکہ بیہوش ہو کر گرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر ان کو شریعت کی بالکل خبر نہیں۔ وضو تک کے مسائل بھی یاد نہیں پھر باوجود اس کے علماء سے پوچھتے بھی تو نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے البتہ اہل وجد و سماع میں سے ایک درویش نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا کہ میں نے ایک شخص کو بددعا دی تھی وہ مر گیا میرے ذمہ خون تو نہیں

ہوا عمر بھر میں یہ ایک شخص ایسا ملا جس کو باوجود سماع میں مبتلا ہونے کے شریعت کا پاس تھا۔
یہاں سے یہ جواب دیا گیا کہ اگر محض بددعا تھی اور قلبی ہمت کو کچھ دخل نہیں تھا تو اگر وہ محل بددعا نہ تھا تو محض بددعا کا گناہ ہوا قتل کا نہیں ہوا اور اگر دل سے بھی ہمت کی تھی تو قتل کا بھی گناہ ہوا اگر وہ شخص شرعاً مستحق قتل نہ ہو۔ غرض زمانہ حال کے متعارف صوفیہ میں ایسے بہت کم ہیں جو خدا سے ڈریں۔ اکثر تو زمانہ حال کی صوفیت کا مآل کسبِ دنیا ہے جس قدر مریدین کی کثرت ہو گویا جائیداد بڑھتی ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ فرماتے تھے آجکل پیروں کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مرید ان کی خدمت میں آتا ہے اگر اس نے اتفاق سے سر بھی کھجلایا تو معاً پیر صاحب کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید عمامہ سے نذرانہ نکالتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسی مغلوبیت شانِ ولایت ہے انبیاء کی یہ شان نہیں۔
حاصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مغلوب الحال نہ تھے اسی لئے آپ کا یہ فعل بہت بڑا امتحان تھا۔

اب سنئے کہ اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام سے دو فعل صادر ہوئے ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش۔ شاید یہ شبہ ہو کہ دو فعل کہاں ہوئے کیونکہ یہاں تو فقط دنبہ ذبح ہوا تھا نہ کہ بیٹا یہ شبہ ایک شرعی قاعدہ کے سننے کے بعد بالکل رفع ہو جائے گا وہ یہ کہ شریعت میں ثواب و عقاب کا دارومدار ارادۂ مصمم فعل اختیاری پر ہے خواہ وہ فعل کسی مانع یا عدم شرائط کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے ایسی صورت میں چونکہ اس شخص کی طرف سے فعلِ اختیاری کا ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا موجب ثواب یا عقاب ضرور ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ارادۂ مصمم زنا کا کر کے چلا اور خاص موقع پر پہنچا اور زنا کرنے کو تیار ہو بیٹھا اتفاق سے چھت گر پڑی اور دب کر مر گیا تو حالانکہ اس شخص نے زنا نہیں کیا مگر چونکہ ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا شرعاً زانی ہو کر مرا علی ہذا نماز کا مصمم ارادہ کر کے کھڑا ہوا اور اسی طرح زلزلہ سے چھت گر گئی تو نماز کا اجر اس کو مل گیا۔
پس اسی طرح یہاں ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ذبح ولد کا ہوا تو انہوں نے فوراً ارادہ بھی مصمم کر لیا اور اس فعل ذبح کو کر بھی ڈالا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ اور فعل دونوں وقوع میں آ گئے کیونکہ ذبح کے معنی ہیں امرار السکین علی الحلقوم یعنی چھری کا گلے پر پھیرنا اور یہ فعل

ابراہیم علیہ السلام سے بطریق اتم صادر ہوا تو پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ولد کو ذبح بھی کر ڈالا اور مستحق اجر عظیم ہوئے۔

رہا اس ذبح کرنے کے بعد ولد کا ذبح بھی ہو جانا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل نہیں بلکہ اثر ہے فعل کا جس پر ثواب وعقاب کا دار و مدار نہیں۔ نہ یہ فعل کوئی ضروری ہے یہ ایک جدا امر ہے ——— اور قاعدہ شرعیہ مذکورہ کو باری تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے:

ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ

یعنی تمہارے دلوں میں جو ارادے ہیں ان کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ سب کا محاسبہ کرے گا۔ ان ارادوں سے مصمم ارادے مراد ہیں۔

مقصودِ قربانی

دوسرے انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور انبیاء کی وحی سچی ہوتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کو خواب میں دیکھا تھا تو یہ وحی بھی سچی ہو گی لہذا ذبح ولد کو ثابت ماننا پڑے گا شرعاً بھی اور لغۃً بھی گو انذباح کا وقوع نہ ہوا ہو پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے بجائے اسمٰعیل علیہ السلام کے دنبہ ذبح کرا دیا یہ تو اس اضحیہ کا ظاہر ہوا اور اس کا بطن یہ ہے کہ حقیقت میں نفس کا ذبح کرنا مطلوب تھا جو بذریعہ ذبح ولد حاصل ہوا۔ لکل آیۃ ظھر و بطن کے اصل پر یہ بطن ہے اضحیہ کا یعنی جس طرح ہر عبادت کی ایک صورت ہوتی ہے یعنی ظہر اور ایک روح ہوتی ہے یعنی بطن اسی طرح اس اضحیہ کی بھی جیسے ایک صورت ہے جو سب کو معلوم ہے اسی طرح ایک روح بھی ہے یعنی ذبح نفس کہ وہی ذبح ولد کی بھی روح ہے تو حقیقت قربانی کی فناء نفس ہوئی اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد کا حکم ہوا نہ کہ اپنی ذات کے ذبح کا اس لئے کہ اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنا جس قدر نفس پر شاق اور سخت ہے (اور واقعی بہت ہی بڑا سخت فعل ہے کہ تصور سے بھی دل کانپتا ہے) اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ لینا اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ کوئی باپ بحالت ہوش وحواس کبھی اس فعل کو گوارا نہ کرے گا بلکہ اپنی جان دے دینا نہایت آسان اور سہل سمجھے گا اور فناء نفس کے یہی معنی ہیں کہ اپنی نفس کی مخالفت کرنا اور یہ معنی ذبح ولد میں خود اپنے کو ذبح کرنے سے بہت زیادہ موجود ہیں۔

پس اب بتلایئے یہ باطن کون سی نفس کے خلاف ہے یاد رکھو کہ محققین صوفیہ کی کوئی بات قرآن و حدیث کے خلاف نہیں ہوتی اگر ہو تو وہ تصوف نہیں زندقہ ہے مگر ان حقائق کے سمجھنے کے لئے صحبتِ محققین کی ضرورت ہے کتابوں کے دیکھنے سے معلوم نہیں ہوتے اور نہ محض فن دانی سے یہ معانی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ تصوف کوئی کتابی فن نہیں بلکہ یہ تو مجموعہ ہے علم و عمل کا اور یہ دونوں جب حاصل ہوتے ہیں کہ کسی شیخ کامل کے اپنے آپکو سپرد کرے اور علم و عمل میں اس کا اتباع کامل کرے ۔

قال را بگذار مرد حال شو ؛ پیشِ مرد کاملے پامال شو

اور سپردگی کے بھی یہی معنی ہیں کہ جس طرح شیخ کامل اس نفس متکبر کی اصلاح فرمائے خواہ ظاہری بد اخلاقی کی چھری سے خواہ خوش اخلاقی سے یہ طالب سب کو برداشت کرے اور سب کو اپنے لئے نہایت نافع خیال کر کے خوش ہو بلکہ ایسے پیر کا زیادہ احسان مند ہو جس کو عام لوگ بد اخلاق سمجھتے ہیں حقیقت میں اس نفس متکبر کا علاج یہی ہے جس کو لوگ بد اخلاقی سمجھتے ہیں ۔

محبت و اطاعت بعض لوگ اپنے پیر سے محض اس بناء پر منحرف ہو جاتے ہیں کہ وہ مریدوں کے ساتھ رسمی خوش اخلاقی کا معاملہ نہیں کرتا یہ محض نادانی ہے ۔ چنانچہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پیر تو سخت مزاج ہیں کسی خوش اخلاق پیر سے مرید ہونا چاہیئے یہ بڑی سخت غلطی ہے اور ایسی پیری مریدی محض برائے نام ہے کچھ بھی نافع نہیں ۔ پیری مریدی کا حاصل اصلاح نفس ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ تم اپنے کو پیر کے بالکل سپرد کر دو کہ وہ حسب حال جس تدبیر سے چاہے اصلاح فرمائے سب کو قبول اور برداشت کرنا چاہیئے ورنہ اگر اسکی تدابیر اصلاح کی برداشت کی قوت نہ ہو تو کسی پیر سے مرید ہی نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اگر کسی وقت پیر نے اصلاح کے لئے زجر و توبیخ فرمائی اور مرید کے نفس متکبر نے برداشت نہ کیا تو پیر کی برائی اس کے دل میں آئے گی پھر بجائے اصلاح کے طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہو جائے گا ایسے شخص کو یہی بہتر ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے

ور بہر زخمے تو پر کینہ شوی ؛ پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

جس شخص کو آپریشن کا تحمل نہ ہو اس کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی نہ چاہیے اور اگر جاؤ گے اور اس کے نزدیک آپریشن کی کیا ضرورت ہے تو وہ ضرور ایسا کریگا ورنہ وہ ڈاکٹر نہیں مکر و زن ہے

مولانا نے یہ شعر ایک قصہ کے اندر فرمایا ہے وہ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی گودنے والے مصور سے کہا تھا کہ میرے بدن پر شیر کی تصویر بنادے اس نے کہا بہت اچھا اور ایک سوئی کا چوکا بدن میں لگایا تو اس شخص نے سسکی بھر کر کہا کہ میاں کیا بناتے ہو۔ کہا دُم بنا رہا ہوں بولا کہ میاں دم کو چھوڑ دو دوسری شئے بناؤ۔ دُم نہ ہوئی تو کیا۔ شیر لنڈورا بھی تو ہوتا ہے۔ گودنے والے نے کان کا نقشہ گودنا شروع کیا پھر سسکی بھری اور پوچھا کیا بناتے ہو۔ کہا کان کہنے لگا کہ اگر کان نہ ہوئے تو کیا شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے۔ کانوں کو چھوڑ دو اور کچھ بناؤ پھر اس نے اور جگہ سوئی لگائی تو وہ پوچھتا ہے کہ اب کیا بناتے ہو کہا پیٹ کہنے لگا اسکو پیٹ کی کیا ضرورت ہے اس کو کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے۔ گودنے والے نے تنگ آکر سوئی پھینک دی اور کہا کہ صاحب میں نے ایسا شیر نہیں دیکھا جس کے سر کان پیٹ اور دم کچھ بھی نہ ہو۔

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید ∴ ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فرید

بس مجھے معاف رکھئے آگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن ∴ از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

اور فرماتے ہیں۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی ∴ پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

غرض جیسا کہ یہ شخص عدم تحمل کی وجہ سے نقشہ شیر سے محروم رہا ایسے ہی وہ لوگ جو پیر کی اصلاح کی برداشت نہیں کرتے اصلاح نفس سے محروم اور محض کورے رہ جاتے ہیں حاصل یہ ہے کہ ۔ جو پیر حسب حال مرید کبھی زجر و توبیخ سے پیش آتے اور کبھی شفقت سے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا پیر مریدین پر بہت ہی مہربان ہے اسکو مریدین کا نفع مدنظر ہے اپنی منفعت سے کچھ علاقہ نہیں۔

حضرت ابو سعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جب بارادہ بیعت گنگوہ سے بلخ کو چلے جب اس شہر کے قریب پہنچے تو شیخ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کو جن کی خدمت میں جا رہے تھے خبر ہوئی تو شیخ اور اس شہر

کا حاکم صاحبزادہ ابو سعید علیہ الرحمتہ کے استقبال کو آئے کیونکہ یہ شیخ نظام الدینؒ کے دادا پیر شیخ عبدالقدوسؒ کے پوتے تھے پس یہ سن کر کہ صاحبزادے تشریف لائے ہیں نہایت شاندار استقبال کے ساتھ ملاقات کی اور نہایت تلطف اور اخلاق سے پیش آئے اسلئے کہ آخر صاحبزادے ہی تھے ــــــ بعد ملاقات، وغیرہ کے دریافت کیا کہ صاحبزادے کیسے تکلیف فرمائی؟ عرض کیا بارادۂ بیعت حاضر ہوا ہوں یہ سنتے ہی فوراً تیور بدل گئے۔ اب کہاں کا اخلاق کہاں کی شفقت کہا بہت بہتر جاؤ باورچی خانہ کی خدمت تمہارے سپرد ہے اور فرمایا فلاں مدت تک میرے سامنے نہ آنا چونکہ آدمی بنانا مقصود تھا اور ہمیں بدون تیور بدلے ہوئے کام نہیں چل سکتا تھا اصلاح کا مل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ؎

نازپروردہ تنعم نہ بردراہ بدوست ؛ عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

اور جو پیر کہ مرید کے مرضی کا لحاظ رکھے ہر امر میں موافقت کا اظہار کرے جو مرید کے لئے سم قاتل ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ پیر دنیادار اور رہزن ہے دکاندار ہے جو فقراء کا لباس پہن کر اور کچھ صوفیہ کے چٹکلے یاد کر کے لوگوں کو مکر و فریب میں مبتلا کر کے اپنی دکان چلا رہا ہے ؎

نقد صوفی نہ ہمہ صافی وبیغش باشد ؛ اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

ایسے ہی لوگوں کے حق میں مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

حرف درویشاں بدزدو مردِ دوں ؛ تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

اور فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند ؛ ازسخنہا عالمے را سوختند

یاد رکھو محض باتیں بنانے سے آدمی صوفی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے باطن میں معرفت الٰہی ہونا شرط ہے ؎

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست ؛ نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

اور معرفت کے آثار میں سے ہے استغناء، اور کسی کو دھوکہ نہ دینا اور اسرار کو نااہل سے مخفی رکھنا ؎

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ⁂ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اور اُن کا تو یہ حال ہوتا ہے ؎

عجب داری از سالکان طریق ⁂ کہ باشند در بحر معنی غریق

دما دم شراب الم در کشند ⁂ وگر تلخ بینند دم در کشند

غرض فقراء کی سی صورت بنانے سے فقراء کا سا لباس پہننے سے نہ آدمی فقیر ہی بنتا ہے اور نہ فقیری آتی ہے البتہ دُکان خوب چلتی ہے عوام جہلاء خوب پھنستے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر محبوب حقیقی کی طلب صادق ہے تو شیخ کامل کی ان تدابیر کی جو موصل الی الحق ہیں برداشت کرنا چاہیئے گو کیسی ہی نفس کو ناگوار ہوں۔ دیکھو مخلوق کی طلب میں کیسے کیسے مصائب اُٹھائے جاتے ہیں سبکی برداشت کی جاتی ہے اور بخوشی گوارا کیجاتی ہیں تو کیا محبوب حقیقی کی طلب میں اتنی مشقت بھی برداشت نہ ہو عجیب بات ہے ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود ⁂ گوئے گشتن بہراو اولےٰ بود

خلاصہ یہ کہ جن حقائق کا اسوقت بیان ہو رہا ہے وہ ایسے حضرات کی صحبت و اطاعت سے منکشف ہوتے ہیں۔

روح قربانی

اب عود الی السابق کرتا ہوں کہ ہر عبادت کی ایک روح ہے اور روح قربانی کی فنا نفس ہے جو بذریعہ ذبح ولد واقع ہوئی تھی اور فنا نفس یہ ہے کہ خلاف خواہش کام کرنا اگر نفس کی آرزو چار نوافل کی ہو تو آٹھ پڑھے علیٰ ہذا القیاس اگر صوم نفل سے اعراض کرے اور صلوٰۃ نفل پر خوش ہو تو صوم نفل کو اختیار کرے۔

ایک بزرگ کو جہاد فی سبیل اللہ کی خبر پہنچی تو نفس کی خواہش ہوئی کہ چلنا چاہیئے، مگر متردد ہوئے کہ کہیں اس ارادہ میں نفس کا شائبہ نہ ہو حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس تقاضا کی حقیقت بتلا دی جائے چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ نفس کی خواہش جہاد کی طرف اس بنا پر ہے کہ ایک دفعہ ہی جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا یہ روز کے مجاہدوں اور جھگڑوں سے تو نجات مل جاوے گی پس فوراً جہاد کو ملتوی کر دیا اور اس شغل میں جو نفس کے خلاف نفس کشی کا تھا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یار دیکھا بھی نہیں ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ÷ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

حکم ہوا اے نوح دیکھو اپنی بنائی ہوئی چیز کا تم کو کس قدر تعلق ہوا اب سوچو کہ ہم نے تمہارے کہنے سے اپنی بنائی ہوئی مخلوق کو ایک دم غرق کر دیا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے جب جانور بنائے اور ان کے حقوق ثابت کئے اور ان پر رحم کرنے کی بھی تاکید فرمائی اور پھر بھی قربانی کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ قربانی خلاف رحم نہیں۔

مسلمان میں صفتِ رحم

اور غالب خاصیت عادۃً رحم کی یہی ہے کہ اگر کوئی عارض قوی نہ ہو تو تکلیف سے بچاتے ہیں تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بظن غالب جانوروں کو ذبح ہوتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنا غم کیا جاتا ہے یعنی طبعی موت سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ کم ہوتی ہے یہ تو حکم طبعی ہے اور ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اتنی کم ہوتی ہو کہ مثل نہ ہونے کے ہو کیونکہ عاشق کے لئے بڑی خوش نصیبی ہے کہ محبوب کے سامنے گردن جھکے اور اس کے نام پر قربان ہو جائے اور خدا تعالیٰ سے محبت ہر چیز کو ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ محبوبانِ خدا سے ہر شئے کو محبت ہوتی ہے ان مقدمات پر نظر کر کے تو یہ کہا جائے گا کہ ذبح کے وقت قربانی کے جانور کا یہ حال ہو گا ؎

سر بوقت ذبح اپنا اسکے زیر پائے ہے ÷ کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

جس وقت جانور کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہوتا ہوں تو خوشی میں مست ہو جاتا ہے یہی نکتہ ہے اسمیں کہ بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا جائے کہ اس سے جانور مست ہو جاتا ہے اور کچھ تکلیف نہیں ہوتی چنانچہ اسکی ایک نظیر بھی ہے کہ شہداء کو خدا کے نام پر سر دینے کی خاص خوشی ہوتی ہے اور انکو کچھ تکلیف نہیں ہوتی البتہ جانور اپنی مستی کو بوجہ بے زبان ہونے کے ظاہر نہیں کر سکتا مگر شہداء کی مستی تو ظاہر بھی ہو جاتی ہے لوگوں کے سامنے سینہ سپر ہونا اور بے تحاشا معرکہ میں گھس جانا ہر شخص کو نظر آتا ہے یہ تو شہادت کے مبادی ہیں جن میں مجاہد کی لذت ظاہر ہوتی ہے۔

باقی خود شہادت کے متعلق خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ شہدا کو قتل ہونے پر ایسی تکلیف

ہوتی ہے جیسے کہ ایک چیونٹی نے کاٹا ہو اور خوشی اور مستی کیوں نہ ہو وہ تو بزبان حال یوں کہتے ہیں ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

پس اسی طرح جانوروں کو بھی ذبح سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ چونکہ انکی آرزو ہے کہ ہم اللہ کے نام پر قربان ہوں اس وجہ سے انکی قربانی کر کے ان کو راحت پہنچائی جاتی ہے پس جاہل ہے وہ شخص جو بے رحمی کے خیال کی وجہ سے قربانی چھوڑتا ہے۔

اسی طرح قربانی کو دیکھ کر بعض مخالف قوموں کا یہ کہنا کہ مسلمان بے رحم ہیں یہ ان کی سخت غلطی ہے اس لئے کہ رحم ایک کیفیتِ وجدانی ہے، ہر ایک شخص کو اپنی کیفیت معلوم ہے دوسرے کی کیفیت ہرگز نہیں معلوم ہو سکتی باوجود عادت ذبح کے مسلمانوں کے صفتِ رحم کی یہ بین دلیل ہے کہ مسلمان باوجودیکہ قربانی کرتے ہیں مگر پھر بھی انکے دل میں اس قدر رحم ہے وہ کسی جانور کی تکلیف کو دیکھ نہیں سکتے بلکہ واللہ مسلمان تو عین ذبح کرتے ہوئے بھی جانور پر رحم کرتے ہیں۔ اور ذبح کی حالت دیکھ کر اُن کا دل پگھل جاتا ہے۔

قربانی اور مجاہدہ

چنانچہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے ایک دفعہ ایک گائے کی قربانی کی تھی جسکی قیمت اسّی روپیہ تک قصائی دیتے تھے مگر مولاناؒ نے نہیں دی اور قربانی کر دی لیکن حالت یہ سُنی گئی تھی کہ مولانا روتے جاتے تھے اور قربانی کرتے جاتے تھے۔ دیکھئے یہ کتنا بڑا مسلمانوں کا مجاہدہ ہے کہ دل پانی پانی ہوتا ہے اور قربانی کرتے ہیں۔ واللہ یہی نفس کی قربانی ہے کہ نفس کے خلاف کام ہو۔

میں نے ایک صوفی سے جس نے سماع کے متعلق مجھ سے سوال کیا تھا کہا کہ بتلاؤ مجاہدہ کیا ہے نفس کے خلاف کرنا میں نے کہا کہ سچ بتلاؤ تمہارا دل گانا سننے کو چاہتا ہے کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر گانا سُننا تو مجاہدہ کے بالکل خلاف ہوا پھر گانا کیوں سنتے ہو وہ اس کا جواب کچھ نہ دے سکا محض ساکت رہا۔

حضرت سلطان جی کی حکایت ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک جوگی تھا جس کسی بیمار پر نظر ڈالتا وہ اچھا ہو جاتا ہے حضرت بیمار ہوئے متعلقین نے عرض کیا کہ حضرت فلاں جوگی سلب مرض کرتا ہے

اگر حکم ہو تو اس کو بلالیں آپ نے ناراضی ظاہر فرما کر انکار کر دیا۔ اتفاق سے حضرت ایک روز زیادہ بیہوش ہو گئے تو متعلقین بوجہ غایت محبت و تمنائے صحت کے حضرت کو حالت بیہوشی میں اُس جوگی کے گھر لے گئے۔ اس نے نظر ڈال کر سلب مرض کرنا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت کو ہوش آگیا اور اچھے ہو گئے۔

گو وہاں لایا جانا حضرت کو ناگوار تو ہوا مگر اس پر بھی یہ چاہا کہ جوگی کے احسان کی مکافات کریں اور اُسکو بھی کسی مرض سے اچھا کر دیں تو آپ نے اُس جوگی سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ عمل کس طرح حاصل کیا ہے جوگی نے عرض کیا کہ میرے گرو نے کہا تھا کہ ہر کام نفس کے خلاف کیا کر بس یہ اس کا اثر ہے تو آپ نے توجہ ڈال کر اس سے دریافت فرمایا کہ بتلا تیرا دل اسلام لانے کو چاہتا ہے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا پھر اسمیں نفس کے خلاف کیوں نہیں کرتا، یہ تو تیرے مجاہدہ میں کسر رہی جاتی ہے اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔ اور فوراً مسلمان ہو گیا۔

ایسا ہی جواب میں نے اس صوفی کو دیا تھا کہ تم خاک مجاہدہ کرتے ہو کہ نفس نے سماع کا تقاضا کیا اور سُن لیا۔ دیکھو مجاہدہ ہم کرتے ہیں کہ بعض دفعہ چشتیت کے اثر سے سماع کا تقاضا اندر سے ہوتا ہے مگر دل کو مار کر رہ جاتے ہیں اور نہیں سنتے۔ سو حضرت یہ مسلمان ہی کا دل ہے کہ نفس کی خواہشوں پر خاک ڈالتا ہے اور باوجودیکہ رحم سے پانی پانی ہوتا ہے پھر قربانی کرتا ہے۔ واللہ یہ اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ ہے۔

گائے کے ذبح کا قرآنی ثبوت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا ذبح اور اس کا کھانا قرآن سے ثابت نہیں۔ اسکی وجہ قرآن سے ناواقفیت ہے۔ قرآن میں گائے کا ذبح کرنا اور اس کا کھانا دونوں موجود ہیں دیکھو قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن الانعام حمولة وفرشا كلوا مما رزقكم الله ولا تتبعوا خطوات الشيطان انه لكم عدو مبين. ثمانية ازواج من الضان اثنين ومن المعز اثنين قل الذكرين حرم ام الانثيين اما اشتملت عليه

ارحام الانثیین نبئونی بعلم ان کنتم صادقین
ومن الابل اثنین ومن البقر اثنین الی اخر الآیۃ

اس آیت سے گائے کا ذبح اور اس کا کھانا بالتصریح ثابت ہو رہا ہے۔

نیز یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہر شئے میں درجہ اعتدال مطلوب ہوا کرتا ہے حد اعتدال میں جب تک شئے رہتی ہے ٹھیک اور درست رہتی ہے اور جہاں حد اعتدال سے نکلی معاً خراب اور مضر ہو جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس رحم بھی اگر حد اعتدال میں رہے تو ٹھیک و درست ہوگا ورنہ مضر ہوگا دیکھو اگر ہر جگہ رحم کیا جائے جیسا ہنود دعویٰ کرتے ہیں تو اعتدال نہ رہے گا افراط ہوگا جیسے بعض لوگ سانپ بچھو کو بھی نہیں مار سکتے اور اس کا نتیجہ خراب یہ ہوگا کہ اشرف مخلوق یعنی انسان پر تو ظلم ہوگا اور دوسری اشیاء پر جو ارذل مخلوق ہیں یعنی سانپ بچھو وغیرہ ان پر رحم ہوگا جو بالکل عقل و نقل کے خلاف ہے۔ پس بحمد اللہ ذبح جانور کے متعلق جو شبہات تھے وہ سب رفع ہو گئے اگرچہ یہ تقریر مناظرانہ نہیں مگر ہمکو خود مناظرہ کا ڈھنگ ہی پسند نہیں نہ ہم کو غیروں کے اعتراضوں پر نظر نہ اُن کے مذہب پر جس کی مناظرہ میں ضرورت ہے۔

البتہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اگر کوئی ہمیں یہ کہے کہ تم کانے ہو تو یہ ضرور نہیں کہ ہم جواب میں یہ ثابت کریں کہ تم اندھے ہو بلکہ محض یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگر ہم کانے ہیں تو تم ہماری اچھی آنکھ کو بند کر لو دیکھو پھر بھی ہم کو دوسری آنکھ سے جس کو تم کانی بتاتے ہو نظر آتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جو لوگ مناظرہ کرنیوالے ہیں جن کی دوسرے مذاہب کی اندرونی حالت پر بھی کافی نظر ہے وہ تو یوں بحث کرتے ہیں کہ مخالف نے ان کو کانا کہا اور انھوں نے اس کا اندھا ہونا ثابت کر دیا اور ہم یہ کرتے ہیں کہ اپنا بے عیب ہونا ثابت کر دیتے ہیں ہم کو مناظرہ کا زیادہ شوق نہیں بس ہم کو تو پرانا ڈھنگ آتا ہے اور یہی کافی ہے۔

علاوہ ازیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہم کو تو خدا و رسول کے حکم کا اتباع کرنا ہے اور کسی کے جرح قدح سے کیا مطلب۔ باقی میں نے جو مخالفین کے شبہات کا کچھ جواب دیدیا ہے یہ محض تبرع ہے کیونکہ بعض ناواقف مسلمان ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی قوت اسلامی کے ضعیف ہونے کی دلیل ہے ورنہ اگر جاہل مسلمان بھی پکا مسلمان ہو تو قیامت

تک کسی فلسفی کے باپ سے بھی متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ اسکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اس کے پاس تمام اعتراضوں کا ایک جواب یہ ہوتا ہے کہ احمق ابھی تو حضورؐ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ اپنے جانور ذبح کر دو بخدا اگر حضور ہمیں یہ حکم دیتے کہ اپنی اولاد اور بیبیوں کو ذبح کر دو تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہ ہوتا۔

ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم ولو انھم فعلوا مایوعظون بہ لکان خیرا لھم واشد تثبیتاً :

جانور کی جگہ قیمت دینا

اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے وہ یہ کہ ایک شخص تھے کہ ایام قربانی میں جانور ذبح نہیں کرتے تھے بلکہ اسکی قیمت خیرات کر دیا کرتے تھے کسی رات کو وہ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ میدان قیامت برپا ہے اور پل صراط قائم ہے اور دوسرے کنارے پر جنت ہے بہت لوگ اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو ہو کر پل صراط کو طے کرتے ہیں اور جنت میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہ شخص حیران اور پریشان کھڑا ہے کہ میں کس طرح گزروں، نہ میرے پاس سواری ہے نہ اور کوئی حیلہ ہے اور یہ شخص یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ سواریاں لوگوں کے پاس کہاں سے آتی ہیں اور کون دیتا ہے۔ اچانک آواز آئی کہ یہ سواریاں ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے لئے تیار کی تھیں یعنی یہ سواریاں قربانی کے جانور ہیں چونکہ تم قربانی نہیں کرتے ہو لہذا تم سواری سے محروم ہو۔ جب آنکھ کھلی بہت متاثر ہوئے اور قربانی نہ کرنے سے توبہ کی۔ اور قربانی کرنے لگے۔ صاحبو! قربانی کا یہ نتیجہ ظاہر ہے حدیث میں اسکی صراحت ہے

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ گھٹیا جانور کی قربانی کرتے ہیں حالانکہ قربانی جائے اولاد کے ہے جیسا کہ بناء قربانی کا واقعہ اس پر شاہد ہے اس لئے چاہیئے کہ عمدہ سے جانور کی قربانی کی جاوے۔ غرض یہ ہے کہ اچھا جانور ذبح کرنا چاہیے۔

قربانی میں وسعت کا لحاظ

بعض ایسا کرتے ہیں کہ باوجود وسعت کے ایک ہی جانور کی قربانی کرتے ہیں اگر کسی کو وسعت کافی ہو تو اس کو چاہیے گو واجب نہیں مگر آخر حقوق بھی کوئی چیز ہیں اس بناء پر مناسب ہے کہ

اپنے بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرے اور ایک قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کرے آپ کو اُمت کے ساتھ کیسی محبت تھی کہ آپ اپنی طرف سے تو قربانی کرتے ہی تھے ایک قربانی زیادہ کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ اُن لوگوں کی طرف سے ہے کہ جو میری امت میں سے قربانی کی وسعت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں ہے کہ عن محمد و امته اور ایک روایت میں ہے هذا عمن آمن بی و صدقنی (کذا فی جمع الفوائد) دیکھئے کیسی محبت تھی حضورؐ کو ہمارے ساتھ حالانکہ ہم اسوقت موجود بھی نہ تھے مگر آپ کو ساری امت سے غائبانہ محبت تھی ؎

ما نبودیم و تقاضا ما ہم نبود	لطف تو ناگفتۂ ما می شنود
؎ ادائے حق محبت عنایت ست زدوست	ورنہ عاشق مسکین بہیچ خورسند ست

قربانی کی کھال

ایک ضروری مسئلہ یہ ہے کہ قربانی میں اتباع رسم جائز نہیں مثلاً پائے کسی کے اور سری کسی کی کھال کسی کی یہ بالکل خلافِ شرع ہے۔ ہم تو ایسا کہتے ہیں کہ نائی سقہ وغیرہ کو اسکی محنت کی مزدوری الگ دے دیتے ہیں اور اسکے ساتھ کبھی بطور ہدیہ کے سر بھی دے دیتے ہیں اور کہہ بھی دیتے ہیں کہ تمہارا حق نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ قربانی کی کھال مسجد کے ملا کو دے دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا حق خدمت ہے۔ یہ بھی جائز نہیں اس میں بھی وہی صورت کرنا چاہیئے کہ ان کا حق الخدمت علیٰحدہ ہونا چاہیئے اور کھال کے اندر آپ مختار ہیں کبھی ان کو دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ آپکا حق نہیں اور کبھی نہ دیجئے۔ اور جب ملا کو مسجد میں رکھیں تو اُسی وقت صاف کہہ دیں کہ تم کو کھال نہ ملے گی باوجود اس کہنے کے پھر اگر دے دیں تو جائز ہے۔ غرض کبھی دیدو اور کبھی نہ دو۔ التزام ہی سے ذہنوں میں یہ حق ہو گیا ہے جیسے آجکل مریدین پیر کی نذر کو اپنے ذمہ لازم سمجھتے ہیں یہ بھی خلافِ قاعدہ بلکہ مضر ہے کیونکہ پیر کو اس کی عادت ہو جاتی ہے اور یہ عادت موجب اشرافِ نفس ہے جو پیر کے لئے مضر ہے یہ کیا انصاف ہے کہ وہ تو تمہارا دین سنواریں اور تم انکو بگاڑو اس سے پیروں کو بہت نقصان پہنچا ہے پیر کے دل میں دنیا طلبی آجاتی ہے اور وہ ننگ ہو جاتے جیسا ایک قصہ ہے

کہ ایک مرید نے اپنا خواب پیر سے بیان کیا کہ حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری انگلیاں پاخانہ میں بھری ہیں اور آپ کی انگلیاں شہد میں بھری ہوئی ہیں۔ پیر جی خوش ہو کر بولے کیوں نہ ہو تو دنیادار ہے اور ہم پرہیزگار ہیں مرید نے عرض کیا کہ حضرت اس سے آگے کچھ اور بھی دیکھا ہے پیر صاحب نے کہا وہ کیا۔ مرید نے عرض کیا کہ حضرت وہ یہ ہے کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی، تب تو پیر صاحب بہت شرمندہ ہوئے، تو اسکی واقعی تعبیر یہ تھی کہ پیر تو مرید سے دنیا حاصل کر رہا تھا اور مرید پیر سے دین حاصل کر رہا تھا۔

اور پیروں میں یہ دنیا طلبی کا مضمون زیادہ تر مریدوں کے التزام ہدیہ سے آگیا ہے اس کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اسی طرح مسجد کے ملّا کو التزاماً کھال نہ دو ورنہ وہ اُس کو اپنا حق سمجھ کر پھر تمہاری کھال کھینچے گا۔

گوشت کی تقسیم

باقی رہا گوشت کا حکم تو اسمیں اختیار ہے آپ جس کو چاہیں دیں، خواہ غنی کو خواہ فقیر کو سب جائز ہے مگر قصائی کو گوشت کاٹنے کی اجرت میں ہرگز نہ دیا جائے کہ یہ اُجرت میں داخل ہو کر ثواب اضحیہ کو باطل کر دے گا۔ اور گوشت بانٹنے میں اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے خرچ کے موافق نکال کر باقی فقرا اور عزیز واقارب کو تقسیم کر دیا جائے اور ان لوگوں کا لحاظ خصوصیت کے ساتھ زیادہ رکھنا چاہیئے جو بوجہ عدم وسعت کے قربانی نہیں کر سکے اور یہ جو آجکل ادلا بدلا ہوتی ہے یہ تو بالکل ہی خلافِ عقل ہے جب ان اہل مبادلہ میں ہر شخص کے یہاں قربانی ہوتی ہے تو پھر ایک دُوسرے کے یہاں خواہ مخواہ ہی بھیجنا ہے۔

الا ان یکون لحم احدھما اطیب وازکی فلا باس

بلا رسالہ الی صدیقہ الذی قد ضحی (۱۲ جامع) فقط واخر

دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ

خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ

اجمعین : اشرف علی

ج ۱ سنہ ۱۳۵۵ھ

تکمیل الانعام

فی صورۃ

ذبح الانعام

ذبح کی صورت میں انعامِ خداوندی کی تکمیل

۲؍ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۲ گھنٹے پچاس منٹ کھڑے ہو کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

الوعظ المسمی بہ

تکمیل الانعام فی صورۃ ذبح الانعام

خطبہ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم : اما بعد : فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم کذلک سخرھا

لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم وبشر المحسنین۔

تمہید: اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہدایا اور ضحایا کی حکمت بیان فرمائی ہے اور جو اس سے مقصود ہے اس پر متنبہ فرمایا ہے اس سے پہلے چند آیتوں میں یہ مضمون مذکور ہے چنانچہ اس سے اوپر یہ آیت ہے:

ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فالٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم اٰیاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون۔

مجموعۂ آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایا اور ضحایا سے مقصود تقرب الی اللہ ہے جس کو کہیں بعنوان ذکر اسم اللہ بیان فرمایا ہے کہیں تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے بمقصود مشترک سب میں تقرب الی اللہ ہے اور یہی راز ہے سب عبادتوں کا مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے گو اس جگہ حج کی قربانی کا ذکر ہے مگر جو حکمتیں اس جگہ مذکور ہیں ان کو حج ہی کی قربانی سے خصوصیت نہیں بلکہ وہ سب قربانیوں میں مشترک ہیں گو حج کے انضمام سے اس میں اور قوت بڑھ جاوے گی جیسے تقرب یوں تو تمام طاعات میں مشترک ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ قوت کے ساتھ ہے پس اس میں شک نہیں کہ جو قربانی حج کے ساتھ ہوگی اس میں برکات اور زیادہ ہوں گی مگر یہ مقصود اور حکمتیں جو اس جگہ مذکور ہیں اُسی کے ساتھ خاص نہیں اور میں نے قربانی کے روح کا بیان کرنا اس وقت اسلئے اختیار کیا ہے کہ اس سے پہلے بھی چند بیان ہو چکے ہیں جن میں بعض اعمال کی ارواح کا ذکر ہوا تھا چنانچہ رمضان کے بیانات میں اعمال رمضان کی روح مجاہدہ اور عید کے بیان میں اعمال حج کی روح مشاہدہ ہونا ثابت کیا تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ قربانی کی بھی روح بیان کر دوں۔

ترتیب فرعی و عقلی | چنانچہ اسکی روح تقرب الی اللہ ہے جس کے دو درجے

ہیں ایک فنا۔ ایک بقا۔ اول فنا ہوتی ہے پھر بقا حاصل ہوتی ہے اور ان سب ارواح میں ترتیب وقوعی کی ساتھ ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جیسے عقلاً مجاہدہ پہلے ہوتا ہے اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے ایسے ہی یہاں وقوعاً رمضان کے بعد حج ہوتا ہے۔ جسکی حقیقت مشاہدہ ہے گو شوال میں افعال حج مشروع نہیں ہوتے مگر احرام جو شرط اعظم ہے شوال ہی سے شروع ہو جاتا ہے یعنی سُنیت اسکی شوال سے ہوتی ہے اسی طرح یہاں قربانی کا زمانہ حج کے بعد ہے کیونکہ وہ دسویں ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے اور حج عرفہ کے دن نویں کو ہوتا ہے یہ تو ترتیب وقوعی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترتیب وقوعی کے ساتھ حج و قربانی کی ارواح میں ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جو روح مطلق اعمال حج کے متعلق ہے وہ قربانی کی روح سے مقدم ہے یہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالیٰ نے ہماری ساتھ اکثر ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرمایا ہے تو اب دیکھیے کہ جب ہم کسی بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں تو اول مجاہدہ ہوتا ہے مثلاً چلنے کی مشقت کوشش اور سفارش کی مشقت اور بادشاہ کے ملاقات کے قابل کسی ہنر کے حاصل کرنے کی مشقت اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے جس مشاہدہ کے بھی ہم قابل ہوں خواہ بلا حجاب خواہ من وراء حجاب اس کے بعد پھر تقرب خاص کا معاملہ ہوتا ہے کہ ہم بادشاہ کے سامنے نذرانہ پیش کرتے ہیں پھر بادشاہ کی طرف سے ہم پر عطا ہوتی ہے اور بادشاہ کی عطا ہمارے نذرانہ سے بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ خزانۂ عامرہ کا مالک ہے اور کریم بھی ہے نیز یہ بھی دستور ہے کہ شاہانِ دنیا نذرانہ کی اشرفی پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے ہیں لیتے نہیں ہیں پھر اپنے خزانے سے خود بہت کچھ دیتے ہیں اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کا برتاؤ ہماری ساتھ ہمارے مذاق کے موافق ہے تو ممکن ہے کہ وہاں بھی یہی ترتیب ہو چنانچہ رمضان کے اعمال مجاہدہ تھے اور حج مشاہدہ ہے اس کے بعد یہاں بھی چاہیے کہ کچھ نذرانہ ہماری طرف سے اور ادھر سے عطا ہو تو حج جو کہ مشاہدہ ہے اس کے اعمال میں سب سے بڑا عمل وقوف عرفہ ہے کہ بدون اس کے حج ہو ہی نہیں سکتا اور یہ ایسا رکن ہے کہ اگر کسی سے یہ فوت ہو جائے تو پھر دوسرے سال تک حج کا موقعہ

[illegible]

کہ اگر ہم لوگوں پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جان دے دو یا گھروں سے نکل جاؤ تو بجز تھوڑے آدمیوں کے ایسا کوئی نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جان دینا بہت دشوار ہے انسان کو یہ سب سے زیادہ پیاری ہے۔ اور خروج من الدیار بھی نفس اور جان ہی کی وجہ سے دشوار ہے کیونکہ گھر سے بے گھر ہونے میں روح کو تکلیف ہوتی ہے بلکہ قتل میں تو جان پر ایک ہی بار تصرف ہوتا ہے اور خروج من الدیار میں ہر وقت کا سوہان روح ہے دل پر آرے سے ہر وقت چلتے ہیں یہی تو وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھ کو تمام انبیاء سے زیادہ ایذا پہنچی ہے اس پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ آپ تو قتل نہیں ہوئے اور بعض انبیاء تو قتل بھی ہوئے ہیں جواب ظاہر ہے کہ قتل کی ایذا ایک دفعہ ہی ہو جاتی ہے اور حضور کو منجملہ اور اذیتوں کے ہجرت کر کے گھر سے بے گھر ہونا پڑا یہ اس سے اشد ہے الغرض انسان کو جان سب سے زیادہ پیاری ہے تو مشاہدہ حق جیسی دولت کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے نذرانہ میں ہم اپنی جان پیش کرتے مگر خدا تعالیٰ نے اس میں سہولت کر دی ہے کہ بڑی چیز کے بدلہ میں چھوٹی چیز لے لی ہے مگر وہ چھوٹی چیز ایسی ہونی چاہیے جس کو انسان کی جان سے مناسبت ہو سو ظاہر ہے کہ جان سے مناسبت جان ہی کو ہے جسم کو نہیں اس لئے نفس انسانی کا فدیہ کوئی نفس ہی ہو سکتا ہے۔ لہذا ذبح حیوان ہی اس کا بدلہ ہوا اور یہی قربانی ہے پس وقوف عرفہ کے بعد جتنے بھی افعال ہیں ان میں قربانی کے سوا اور کوئی فعل نذرانہ بننے کے قابل نہیں کیونکہ اصلی نذرانہ کے ساتھ اسی کو مناسبت ہے اور گو یہ اصلی نذرانہ کا بدل ہے مگر اس میں ثواب انشاء اللہ وہی ملے گا جو اپنی جان دینے میں ملتا۔

آثارِ کرم

جیسا کہ لیلۃ المعراج میں نمازیں اول پچاس فرض ہوئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غایت عبدیت کی وجہ سے چپکے ہی چلے آئے مگر واپسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ کا گزر ہوا تو انہوں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے آپکی امت پر کیا فرض کیا آپ نے فرمایا پچاس وقت کی نمازیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ حق تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کریں۔

کیونکہ آپکی امت میں اتنی طاقت نہیں یہ مطلب نہیں کہ کسی سے بھی نہ ہوسکے گا بلکہ مطلب یہ
تھا کہ اکثر سے نہ ہوسکے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کیونکہ بہت سے مسلمان پانچ وقت کی
نمازیں بھی نہیں پڑھتے پچاس وقت کی تو بہت ہی کم لوگ پڑھتے اور یہ بھی حضرت موسیٰ
علیہ السلام کا ہم لوگوں پر غائبانہ احسان تھا کہ انہوں نے ہمارے لئے تخفیف کا مشورہ دیا
چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے فرمانے سے واپس ہوئے۔ اور تخفیف
کی درخواست کی آپ کا دربارِ حق سے اولاً خاموش چلا آنا یہ بھی کرم کا اثر تھا اور حضرت
موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے لوٹنا بھی کرم کا اثر تھا کیونکہ کرم کے آثار مختلف ہیں کریم
کو حاکم کے احکام میں چون چرا کرنے سے خجلت ہوتی ہے اور کسی کے مشورہ کرنے
کو رد کرنے سے بھی حیا آتی ہے ہمارے حاجی صاحب کو جو کوئی مشورہ دیتا تو ہر
شخص کے مشورہ پر فرمادیتے اچھا جیسی مرضی چاہے وہ حضرت کی رائے کے موافق
ہو یا خلاف کسی کی دل شکنی نہ فرماتے تھے ہر ایک کے جواب میں اچھا جیسی مرضی
ہی فرماتے تھے اسی طرح حضور کو موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کے رد کرنے سے حیا
آئی اور واپس تشریف لے جاکر تخفیف کی درخواست کی یہ اشکال نہ کیا جائے کہ
خجلت عن الحق پر حیاء عن موسیٰ کیسے غالب آگئی خجلت عن الحق کیوں نہ غالب
ہوئی جواب یہ ہے کہ آپ صاحب حال ہونے کی ساتھ عارف بھی ہیں آپ کو یہ
بھی معلوم تھا کہ حق تعالیٰ مانگنے سے بہ نسبت نہ مانگنے کے زیادہ خوش ہوتے اس
لئے اسوقت آپ نے واپسی کو ترجیح دی کیونکہ واپس نہ ہونے میں موسیٰ علیہ السلام
کی دلشکنی کا احتمال تھا اور واپس ہونے میں حق تعالیٰ کی ناراضی کا اندیشہ
نہ تھا صرف اپنی طبیعت اور مذاق کی مخالفت تھی تو حضور نے موسیٰ علیہ السلام
کی دلجوئی کے لئے اپنے مذاق کی مخالفت گوارا فرمائی اسوقت حضور پر عجب
پس وپیش کی حالت گزری ہوگی کہ ادھر حق تعالیٰ سے بھی خجلت تھی ادھر
موسیٰ علیہ السلام سے بھی حیا تھی چنانچہ قدرے تخفیف ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام
نے دوبارہ مراجعت کا مشورہ دیا یہاں تک کہ بار بار کی آمد و رفت میں پینتالیس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

استغفار وشفاء کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور مرض کو اپنی طرف اس لئے هو الذی یمرضنی ولیشفین نہیں فرمایا بلکہ اذا مرضت فهو یشفین کہا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفاء دے دیتے ہیں گویا بیمار تو میں خود اپنی کسی بے اعتدالی کی وجہ سے ہوتا ہوں پھر وہ شفا دے دیتے ہیں چونکہ بیماری طبعاً ناگوار ہے اس لئے ناگوار شئی کو محبوب کی طرف منسوب نہیں کرتے اگرچہ حافظ یوں فرماتے ہیں کہ ؎

دردِ از یار است و درماں نیز ہم ؛ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

یہ درد اور درماں دونوں کو محبوب کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام حافظ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز ممکن ہے حضرت حافظ کے وارد وقت کا بھی مقتضاء ہو اور اصل میں مرض کو اپنی ہی طرف منسوب کرنا زیادہ ادب ہو۔ مگر ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد یوں بھی فرماتے ہیں۔ والذی یمیتنی ثم یحیین یہاں امانت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ موت ایسی ناگوار چیز نہیں جس کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہو گویا موت بیماری سے بھی کم ہے کہ وہ تو ناگوار ہے اور یہ ناگوار نہیں بلکہ موت تو مرغوب شئی ہے حدیث میں آتا ہے الموت تحفة المؤمن۔ موت مومن کے لئے ایک تحفہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحفہ مرغوب ہی شئی ہو سکتی ہے نامرغوب کو تحفہ کوئی نہیں کہتا اور جب ہر مومن کے لئے موت تحفہ ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو بالخصوص تحفہ ہے کیونکہ وہ تو سید المومنین ہیں ان کو موت کیونکر ناگوار ہو سکتی ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ گنہگار مسلمان کے لئے بھی موت تحفہ ہے گو کچھ دنوں کے لئے اس کو عذاب بھی بھگتنا پڑے کیونکہ موت ہی کے ذریعے سے اس کو کسی وقت خدا کا قرب حاصل ہوگا رہا یہ اشکال کہ کیا مقرب کو عذاب بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں ہاں ہوتا ہے جیسے تم بادشاہوں کے پاس کپڑوں میں گوبر لگا کر جاؤ تو وہ تم کو حمام میں بھیج دیں گے جہاں گرم پانی سے خوب مل دل کر تم کو غسل دیا جائے

گا اسی طرح مسلمانوں کے لئے دوزخ جیل خانہ اور حوالات نہیں بلکہ مثل حمام کے ہے۔ دوسرے گنہگار مسلمانوں کو دوزخ کے عذاب کا بہت زیادہ احساس بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ حدیث مسلم میں ہے یمیتہم اماتۃ کہ حق تعالیٰ جہنم میں مسلمانوں کو ایک قسم کی موت دیدیں گے اور اگر عذاب بھی ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ جس نعمت کے زوال کی ہر دم توقع ہو وہ اس نعمت سے افضل ہے جس کے زوال کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا ہو پس مسلمان کے لئے موت ہر حال میں اچھی ہے کیونکہ دنیا کی راحت میں زوال کا خطرہ لگا ہوا ہے اور آخرت کی تکلیف کے منقطع ہونے کی ہر دم توقع ہے پس موت ناگوار چیز نہیں اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے یمیتنی ثم یحیین میں احیاء کی طرح اماتت کو بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور ایوب علیہ السلام نے کلفت مرض کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا۔

رب انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب

یہ تو نسبت الی الشیطان کا ایک نکتہ درمیان میں بتلا دیا۔

غایت محبوبیت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایوب علیہ السلام نے جس وقت یہ دیکھا کہ اب حق تعالیٰ دعا کو پسند کرتے ہیں اسوقت دعا کی اور جب تک اظہار صبر پسند تھا اسوقت تک صبر کیا اور دعا نہ کی تو یہ حضرات تجلیات و شیون الٰہیہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے مقتضیات کے موافق عمل کرتے ہیں بلا تشبیہ یوں کہیے کہ یہ حضرات مزاج شناس ہوتے ہیں اسی طرح واقعہ معراج میں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا کہ حق تعالیٰ کو مراجعت پسند ہے اسوقت حیاء سے مغلوب نہیں ہوئے اور مراجعت فرماتے رہے اور جب دوسری تجلی منکشف ہوئی تو حیاء غالب ہوگئی کیونکہ اس تجلی کا مقتضا بھی تھا اب اس کے مناسب حالت غالب ہوگئی بہرحال اخیر میں آپ کا یہ فرمانا کہ اب مجھ کو حیاء آتی ہے غلبۂ حال کا اثر تھا اور یہی جواب دیا ہے حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے تعدد رکوعات کا صلوۃ کسوف میں کہ اسوقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلیات

کا غلبہ تھا کبھی آپ پر ایک تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضا طول قیام تھا کبھی دوسری تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضا رکوع تھا رکوع سے فارغ ہو کر پھر وہ تجلی غالب ہو گئی جو قیام کو مقتضی تھی اس لئے پھر قیام فرمایا اس کے بعد پھر تجلی مقتضی رکوع کا غلبہ ہو گیا اسی غلبہ تجلیات میں آپ نے متعدد بار قیام اور متعدد رکوع کئے اور جو فعل شارع سے تشریعاً صادر نہ ہو بلکہ غلبہ حال سے صادر ہو وہ مامور بہ نہ ہوگا لہذا صلوٰۃ کسوف میں تعدد رکوعات مشروع نہیں جب آپ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرما دیا کہ اب میں کچھ نہیں کہتا اسوقت آواز آئی:

امضیت فریضتی وخففت عن عبادی وھی خمس وھن خمسون

میں نے اپنے فرض کو نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف بھی کر دی پس فرض نمازیں پانچ ہیں اور یہ پانچ درحقیقت میں پچاس ہی ہیں کیا رحمت ہے کہ جب حضور خود ہی رک گئے اسوقت فرمایا امضیت فریضتی اس سے پہلے نہ فرمایا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ حق تعالیٰ پینتالیس کم ہونے کے بعد ہی خود فرما دیتے کہ بس اب اس سے زیادہ کمی نہیں ہو سکتی آئندہ درخواست نہ کیجئے مگر حق تعالیٰ حضور کی طبیعت پر ذرا بھی بوجھ نہیں ڈالتے جب خود آپ ہی معاملہ کو ختم کر چکے اسوقت فریضہ کو محکم کیا گیا سبحان اللہ کس درجہ محبوبیت ہے اور حق تعالیٰ کو آپکی رضا کی کس قدر رعایت ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا ۔ من العنایۃ رکنا غیر منھدم

ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ایسا محبوب نبی عطا فرمایا جس کے راضی کرنے کا حق تعالیٰ کو اسقدر اہتمام و رعایت ہے پھر آپ اسوقت تک تھوڑا ہی راضی ہوں گے جب تک سب مسلمان جنت میں نہ پہنچ جائیں اس لئے ہم کو بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نماند بعصیاں کسے در گرو ٭ کہ دارد چنیں سید پیش رو
چہ غم دیوار است را کہ دارد چو تو پشتیباں ٭ چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں

ازدیادِ ثواب

پھر اس کے بعد دوسری رحمت ہے کہ اب پانچ کو پچاس کی برابر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے عام قانون ہوگیا۔ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا کہ ایک نیکی دس نیکیوں کی برابر ہے نماز کا حساب اس قانون پر موقوف نہیں تھا بلکہ میرا ذوق یہ ہے کہ یہ قانون خود واقعہ صلوٰۃ سے مقرر ہوا۔ پھر تیسری رحمت یہ ہے کہ دس پر انحصار نہیں رکھا گیا بلکہ یہ تو کم از کم ہے اس سے زیادہ بھی ثواب ہو سکتا ہے چنانچہ ایک آیت میں ہے:

مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللّٰہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مأۃ حبۃ

اس سے معلوم ہوا کہ سات سو تک تضاعف ہوتا ہے مگر اس پر بھی حد نہیں اس کے بعد فرماتے ہیں۔ واللّٰہ یضاعف لمن یشاء کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے (یعنی سات سو سے) بھی زیادہ دیتے ہیں مگر یہاں یہ مضمون مصرح نہیں محتمل ہے مگر ایک حدیث میں یہ مضمون مصرح ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ صدقہ کے چھوارہ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں جیسے وہ خود ہیں ویسا ہی ان کا ہاتھ ہے انکی ذات ادراک عقول سے بالا ہے تو ان کے ہاتھ کی حقیقت کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے ے

تو ندیدی گھے سلیماں را ٭ چہ شناسی زبان مرغاں را

اس لئے ہم کو ایسی باتوں میں گفتگو نہ کرنا چاہیے ہم کیا ہیں جو خدا کی صفات کو سمجھیں گے ے

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ٭ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

بس ہم اسکی حقیقت بیان نہیں کر سکتے ہاں ہمارا اتنا عقیدہ ضرور ہے۔

لیس کمثلہ شئ کہ حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اسلئے خدا کا ہاتھ ہمارے اور تمہارے ہاتھ جیسا نہیں ہے دیکھئے یہاں حق تعالیٰ نے لیس ھو کمثل شئ نہیں فرمایا کیونکہ حق تعالیٰ تو قدیم ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں ہوسکتا کہ ان کا وجود کسی شئ کے وجود کی مماثلت پر قائم ہوا ہو اسلئے لیس ھو کمثل شئ کہنے کی ضرورت نہ تھی ہاں دوسری اشیاء حق تعالیٰ کے وجود سے متاخر ہیں ان میں یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ شاید ان میں سے کسی شئ کا وجود یا صفت اور ذات حق تعالیٰ کے وجود یا ذات وصفات کی مثل بنائے گئے ہوں اسکی نفی فرمادی گو مماثلت طرفین سے ہوتی ہے اور جب ایک طرف سے مماثلت کی نفی ہو گی تو جانب آخر سے بھی نفی ہوگی اس لئے لیس کمثلہ شئ کا مفہوم لیس ھو کمثل شئ کے معنے کو بھی مستلزم ہے مگر پھر بھی جو صورت نفی تشبیہ کی قرآن میں ہے وہ اکمل ہے جس کا نکتہ میں نے بتلادیا بہرحال حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں نہ وہ کسی کے مثل ہیں لہذا اتنا اعتقاد تو ضروری ہے کہ خدا کا ہاتھ کسی مخلوق کے ہاتھ جیسا نہیں اور بعض صفات میں جو بظاہر مماثلت کا شبہ ہوتا ہے جیسے رحمت و علم وغیرہ تو یہ اشتراک محض لفظی ہے حق تعالیٰ کی رحمت وعلم کی وہ حقیقت نہیں جو آپ کی رحمت وعلم کی حقیقت ہے چنانچہ ایک فرق پر تو علماء نے بھی متنبہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ پر ان صفات کا اطلاق باعتبار غایات کے ہے باعتبار مبادی کے نہیں پھر حق تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں حتیٰ کہ وہ احد پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث سے میں یہ سمجھا ہوں کہ سات سو تک بھی حد نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تضاعف ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ سے تمر کو وہ نسبت ہے کہ اس میں تو لاکھوں کروڑوں تمرات ہوں گے اسی کو فرماتے ہیں ؎

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد   آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل می خری گلزار را

اور یہی خیال میرا لیلۃ القدر کے متعلق ہے کہ وہاں جو الف شھر فرمایا ہے

وہ الف تحدید کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کے لئے ہے گو وہ فی الواقع خدا کے نزدیک ضرور محدود ہو گا کیونکہ کل شیء عندہ بمقدار منصوص ہے اور جب خدا کے نزدیک محدود ہے تو واقع میں بھی محدود ہی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے (بلکہ یوں کہیے کہ واقع خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے ۱۲) پس واقع میں تو ثواب لیلۃ القدر محدود ہے مگر یہاں تحدید مذکور نہیں اور اگر غیر محدود و غیر متناہی بمعنے لا تقف عند حد کہو تو یہ فی نفسہ ممکن ہے مگر لیلۃ القدر کے ثواب کا بایں معنی غیر متناہی ہونا محتاج دلیل ہے اور اس پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے جب دلیل نہیں تو اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا پس ظاہر یہی ہے کہ وہ واقع میں محدود بمعنے موقوف عند حد ہے مگر وہ حد الف نہیں اب یہ سوال رہا کہ جب الف کی تحدید نہیں تو الف شہر کیوں فرمایا اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ لغت عرب میں عدد کے لئے الف سے زیادہ کوئی لغت موضوع نہیں جیسے ہمارے یہاں مہاسنکھ سے آگے کوئی لفظ نہیں اس سے آگے کوئی شمار کرے تو ایک مہاسنکھ دو مہاسنکھ سو مہاسنکھ کہے گا کوئی اور لغت نہیں بیان کر سکتا اسی طرح اہل عرب الف کے آگے جس عدد کو بیان کریں گے لفظ الف ہی کے ذریعہ سے بیان کریں گے جیسے الف الف مائۃ الف وغیرہ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ الفاظ عدد کا منتہی عرب میں الف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو عدد تمہارے نزدیک اعداد کی غایت اور منتہی ہے لیلۃ القدر اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر لفظ خیر اسم تفضیل ہے معنے یہ ہوئے کہ بہت بڑھ کر ثواب تو اگر الف تحدید کے لئے بھی ہوتا تب بھی خیر عدم تحدید پر دال ہے خبر تضاعف الی غیر المعدود تو قانونی طور پر نہیں بلکہ بطریق فضل ہے مگر دس گونہ ملنا تو قانون ہے جو کہ واقعہ صلوٰۃ میں مشروع ہوا۔

قربانی کا ثواب تو میں کہتا ہوں کہ جیسے یہاں خدا تعالیٰ نے پچاس نماز و لا کا بدل پانچ کو قرار دیا ہے اور وہ پچاس ہی کی برابر ہیں

اسی طرح یہاں قربانی میں حق تعالیٰ نے ہماری جان کے بدلے جانور کی جان مانگی ہے اور اسکو ہماری جان کا بدل قرار دیا ہے تو اسمیں بھی وہی ثواب ہوگا جو اپنی جان نذر کرنے میں ہوتا ہے پس اپنی جان دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر خوشی سے بھی دینا چاہے تو ممانعت ہے:

لا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما ط

اگر کہو کہ مقاتلہ میں تو جان دینے کا حکم ہے تو میں کہتا ہوں بالکل غلط بلکہ وہاں تو دوسرں کی جان لینے کا حکم ہے البتہ اس میں اس قدر ثبات کا امر ہے کہ اگر وہ تمہاری بھی جان لے لے تب بھی نہ بھاگو۔ غرض مقاتلہ میں قتل کرنے کا حکم ہے قتل ہونے کا حکم نہیں نہ یہ مقصود ہے اسی لئے جہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے مقتول ہونے کا ذکر فرمایا ہے وہاں پہلے یقتلون فرمایا ہے بعد میں ویقتلون فرمایا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تو قاتل بننا ہے تبعاً کبھی مقتول ہونے کی بھی نوبت آجاتی ہے پس جان دینا کہیں بھی مقصود نہیں اور اگر کوئی خوشی سے بھی دینا چاہے تو منع کیا جائیگا اسمیں راز یہ ہے کہ یہ جان ہماری ملک نہیں بلکہ خدا کی جان ہے اسلئے ہم کو از خود تصرّف کرنے کا کچھ حق نہیں اور اس بنا پر چاہیے تھا کہ نفس کی اضافت ہماری طرف نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اسکو اپنی طرف اس لئے منسوب نہیں کیا کہ اس صورت میں تم مچل جاتے اور کہتے واہ جان تو ہماری ہے اسواسطے فرمایا کہ ہاں بھائی ہاں جان تمہاری ہے مگر اپنی جان کو قتل نہ کرو ان اللہ کان بکم رحیماہ اللہ تعالیٰ کو تم پر رحم آتا ہے تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو حق تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اکثر اس کے فہم کے موافق کلام فرمایا ہے یہاں بھی اسی کے موافق انفسکم فرما دیا ہے یہی کلام خود اس قابل ہے کہ اسپر جان ہی دے دی جائے گو اسمیں جان دینے کی ممانعت ہے مگر جان نکلنا اور ہے اور جان دینا اور ہے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اسکو سنکر عشاق کی جان نکل جائے تو بجا ہے چنانچہ بعض آیات کو سنکر بعض عشاق کی جان نکل گئی اور اگر کسی نے خود جان دی ہے تو وہ پاگل

یا مغلوب الحواس تھے اُن کا فعل حجت نہیں گو وہ خود معذور ہوں ان کو اولیاء مستہلکین کہتے ہیں انکی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کسی وجہ سے اپنے درجہ سے گر گئے اس لئے عجم میں جان دیدی اور بعض وہ ہیں جو ترقی سے رہ گئے ایک ہی مقام پر ایک ہی مقام پر اٹک گئے اور شطحیات اُن سے صادر ہونے لگیں جن کی وجہ سے لوگوں نے قتل کر دیا۔ منصور بھی اولیاء مستہلکین میں سے تھے حضرت غوث اعظم قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہ کی اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو میں ان کو اس ورطہ سے نکال دیتا ہمارے حاجی صاحب نے بھی اپنے بعض معاصرین کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ایک مقام پر اٹک گئے اگر میرے پاس آجائیں تو میں ان کو اس سے نکال دوں۔ واللہ حاجی صاحب بھی اپنے زمانہ میں عجیب چیز تھے آخر کوئی تو بات تھی جو تمام عالم اُن کے کمال کو تسلیم کئے ہوئے ہے۔ بہر حال جان دینا تو ممنوع ہے البتہ حق تعالیٰ نے تمہاری جان کے بدلے میں تم سے جانور کی جان مانگی ہے اور جب یہ اُس کا بدل ہے تو انشاء اللہ اسمیں بھی وہی ثواب ہوگا جو اپنی جان پیش کرنے میں ہوتا۔

اسرار کی تلاش

مگر یہ سب اسرار و حکم ہیں جو حجت نہیں ہیں مگر میں اپنا جی خوش کرنے کے لئے بیان کر رہا ہوں یہ اسرار نہ خود صاحب وارد کے لئے باعث قناعت ہو سکے ہیں نہ اُس کے متعلقین کے لئے مگر ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ خود تو اسرار کی تلاش میں کاوش نہ کرے اور جو بیساختہ کوئی بات قلب میں آجائے اور قواعد شرع کے خلاف نہ ہو تو اسکو بیان کر دے جس سے یہ نفع ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے انا عند ظن عبدی بی۔ پس اگر کوئی شخص ان اسرار پر جزم نہ کرے بلکہ امید کے درجہ میں مثلاً اس کا معتقد ہو کہ ہم کو قربانی جانور میں اپنی جان کی قربانی کا ثواب ملے گا تو اس گمان نیک کی بناء پر عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اس سے بھی معاملہ فرمائیں باقی از خود کاوش کر کے اسرار بیان کرنا مجھے پسند نہیں حافظ فرماتے ہیں ؎

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ✣ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

اس میں جستجو کی ممانعت ہے مگر منتظر آمدن کی اجازت بھی ہے اور اصل میں تو عارف شیرازی راز دہر کی کاوش سے منع فرماتے ہیں یعنی امور تکوینیہ کی تلاش سے مگر اسرار حکم بھی اسی حکم میں ہیں۔ تلاش اور کاوش دونوں میں نہ چاہیئے مگر گاہے گاہے ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے قدرے ذکر کی اجازت بھی ہے مثلاً کسی مصلحت سے مجذوبین سے کشف کی بات پوچھ لی جائے اور مصلحت کی حد یہ ہے کہ امور تکوینیہ میں ایک جانب تسلی حاصل کرنا چاہے اسپر جزم و اعتقاد نہ کرے تو اس کا مضائقہ نہیں حافظ نے ایک مقام پر اس اجازت کو بھی ایک توجیہ پر بیان فرمایا ہے کہتے ہیں ؎

راز درون پردہ زرندان مست پرس ؛ کیں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را

لیکن جو اولیاء مسند رسول پر ہیں ان سے کشفیات اور تکوینیات کا سوال نہ کرے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت ایسے امور کے بیان کی نہ تھی اور گو حضور سے پیشین گوئیاں امور تکوینیہ کی بھی بہت ثابت ہیں مگر وہ آپنے بضرورت از خود بیان فرمائی ہیں کسی کے پوچھنے پر نہیں فرمائیں بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی باتوں کا پوچھنا آپ کو ناگوار ہوتا تھا اسی لئے صحابہؓ بجز مسائل و احکام کے آپ سے کچھ نہ پوچھتے تھے۔ اسی طرح اولیاء وارثان رسول سے امور تکوینیہ کے متعلق سوال نہ کرنا چاہیئے ہاں وہ از خود بیان کر دیں تو سن لو ۱۲)

علی ہذا اسرار و حکم بھی اُن سے خود نہ پوچھنے چاہئیں ہاں اگر بے ساختہ ان کے قلوب پر اسرار کا ورود ہوگا تو وہ خود ہی بتلا دیں گے۔

طریقہ ابراہیمی

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم

خدا کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کے پاس تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے یہ تو ترجمہ ہوا اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس جگہ تقویٰ کے کیا معنے ہیں عام معنے تو تقویٰ کے یہ ہیں کہ سب اعمال شریعت

کے مطابق ہوں اور اعمال میں تقرب الی اللہ کی نیت ہو یہ تو یہاں مراد ہیں ہی کیونکہ معنے عام کا تحقق ہر فرد میں ہوا کرتا ہے مگر اس مقام پر تخصیص ذکری سے ذوقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں تقویٰ سے مراد بہت ہی بڑا کامل تقویٰ ہے جس کو اس مقام سے خصوصیت ہے اور خصوصیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ تقویٰ کا معنے عام گو تمام اعمال میں مشترک ہے پھر یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کو دوسرے عمل سے خاص امتیاز حاصل ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ ہر عمل کے ساتھ جو تقویٰ متصل ہے اس کو بھی دوسرے عمل کے تقویٰ سے امتیاز حاصل ہو (جیسے حیوانیت انسان اور جملہ حیوانات میں مشترک ہے مگر امتیاز نوعی کی وجہ سے ہر حیوان کی حیوانیت برابر نہیں بلکہ بعض کی حیوانیت کامل اور بعض کی ناقص ہے کسی میں مادۂ حیات، وحس وحرکت زیادہ ہے کسی میں کم ہے الغرض ہر نوع میں جو جنس ہے اسکو دوسری نوع کی جنس سے بھی خاص امتیاز ہوا کرتا ہے خواہ ماہیت کے اعتبار سے ہو خواہ آثار کے اعتبار سے کیونکہ ماہیات میں تشکیک کا ہونا نہ ہونا مختلف فیہ مسئلہ ہے ۱۲)

پس جیسے قربانی کو دوسرے اعمال سے خاص امتیاز ہے اسی طرح اس میں جو تقویٰ ہے وہ بھی خاص قسم کا تقویٰ ہونا چاہیئے۔ اب دیکھئے کہ وہ خاص قسم کا تقویٰ کیا ہے سو دوسری آیت میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ۔ میرے ذوق میں لا تموتن الا وانتم مسلمون حق تقاتہ کی تفسیر ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ کامل تقویٰ یہ ہے کہ اسلام پر موت ہو جائے اسلام کے معنے کیا ہیں اسلام کے معنے یہ ہیں کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے یہ معنے دوسری آیت سے حل ہوتے ہیں:

ومن احسن دینًا ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن

واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا ط

اور اس شخص سے اچھا کس کا دین ہے جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اخلاص نیت کے ساتھ اور ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کا اتباع کرے جو خالص خدا کے ہو رہے تھے جب اسلام کے معنے یہ ہیں تو تقویٰ کامل یہ ہوا کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا کہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ذبح ولد پر آمادہ ہو گئے تھے اور جو شخص ذبح ولد پر آمادہ ہو جائے وہ اپنی جان دینے پر تو ضرور آمادہ ہوگا کیونکہ بیٹے کا ذبح کرنا اپنے ذبح سے اشد ہے پس کامل تقویٰ یہ ہے کہ خدا کیواسطے جان دیدے یعنی جان کو اس کے سپرد کر دے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسا کام کرے جس میں جان خرچ ہو جائے تیسری آیت میں اسکی اور زیادہ تصریح ہے فرماتے ہیں

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللہ واللہ رءوف بالعباد ط اور یہ آیت اتفاق سے آیات حج ہی سے مرتبط ہے ۔ اور قربانی کو بھی حج سے تعلق ہے اس لئے یہ دلیل بہت ہی واضح ہے اور وہ ارتباط یہ ہے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے حجاج کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے کہ حج میں دعا کرنیوالوں کی چند قسمیں ہیں اور گو ان اقسام کا ذکر حج کے ساتھ ہو رہا ہے مگر یہ تقسیم حجاج ہی کی ساتھ خاص نہیں بلکہ عام تقسیم ہے جس کا تحقق موقع حج میں بھی ہو جاتا ہے پہلی قسم تو یہ ہے :

ومن الناس من یقول ربنآ اتنا فی الدنیا وما لہ فی الاخرۃ من خلاق ؕ

بعض لوگ تو وہ ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا ہی میں دے دے اور ان کے آخرت میں کچھ حصہ نہیں یہ فرقہ تو منکر آخرت ہے کیونکہ جو شخص آخرت کا قائل ہوگا وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو سب کچھ دنیا ہی میں دے دے آخرت میں دینے کی ضرورت نہیں اور

دوسری قسم وہ ہے جو یوں کہتے ہیں:

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔

کہ اے رب ہم کو دنیا میں بھی حسنہ دے اور آخرت میں بھی حسنہ دے اور ہم کو عذاب نار سے بچا۔ افسوس ہے کہ بعض محرفین نے اس آیت میں حسنہ اول کو انگریزی سے مفسر کیا ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ حسنہ کہتے ہیں اچھی حالت کو یعنی خوشحالی کو اور خوشحالی آجکل صرف انگریزی پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے وہی حسنہ کا مصداق ہے میں کہتا ہوں کہ لفظ حسنہ اس آیت میں دو جگہ آیا ہے وفی الاخرۃ کے ساتھ بھی حسنہ ہے تو کیا آخرت میں بھی حسنہ سے انگریزی ہی مراد لو گے سو جنت میں تو انگریزی ہو نہیں سکتی کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ جنت والوں کی زبان عربی ہو گی ہاں جہنم میں انگریزی ہو تو ممکن ہے جیسے ایک خانساماں کو کسی انگریز نے دھمکایا تھا کہ دور ہو چلے جاؤ اس نے کہا حضور کہاں جاؤں بولا جہنم میں جا وہ چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آکر کہنے لگا کہ حضور جہنم کے دروازہ پر تو صاحب لوگوں کا پہرہ ہے ہندوستانی کو جانے نہیں دیتے بلکہ یوروپین ہونے کا سارٹیفکٹ مانگتے ہیں تو شاید یہی مطلب ان لوگوں کا ہو گا کہ ہمیں بھی آخرت میں انگریزی والوں کا ساتھ نصیب ہو۔

صاحبو! یہ محض تحریف ہے بلکہ یہاں حسنہ سے مراد اعمال حسنہ ہیں اور دونوں جگہ یہی معنے مراد ہیں مگر ایک جگہ باعتبار صورت کے اور ایک جگہ باعتبار حقیقت کے کیونکہ نعمائے جنت کی حقیقت بھی اعمال حسنہ ہیں اور ان میں فرق کا مضائقہ نہیں بلکہ کچھ فرق تو ضروری ہے کیونکہ نکرہ کے اعادہ میں مغائرت فی الجملہ لازم ہے چنانچہ حسنہ سے اعمال حسنہ مراد لینے میں اور ایک جگہ صورت اعمال اور دوسری جگہ حقیقت اعمال سے تفسیر کرنے میں اتحاد کے ساتھ مغائرت فی الجملہ بھی موجود ہے دوسرے یہاں حسنہ سے دنیوی خوشحالی مراد لینا اس لئے بھی غلط

ہے کہ آیت میں دنیا کو حسنہ کا ظرف بنایا گیا ہے اور ظرف و مظروف میں تغائر لازم ہے تو فی الدنیا حسنۃ" کا لفظ چاہتا ہے کہ یہ حسنہ دنیا سے مغائر ہے ورنہ کلام کی تقدیر یہ ہوگی ربنا اتنا فی الدنیا دنیا اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور دنیوی خوشحالی بھی دنیا ہی ہے وہ دنیا سے مغائر نہیں اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں ہوسکتی پس انگریزی کو حسنہ کا مصداق بنانا بالکل غلط ہے یہاں تک دو قسمیں مذکور ہوئیں پہلی قسم کا مصداق تو کافر ہے۔ اور دوسری قسم کا مصداق عام مومنین ہیں اور چونکہ سباق کلام بتا رہا ہے کہ تقسیم موقع حج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور عام آدمیوں میں بعض منافق بھی ہوں گے اسلئے تیسری قسم منافقین کی بھی ذکر کر دی گئی:

ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا و یشھد اللہ علی ما فی قلبہ وھو الد الخصام واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل ط واللہ لا یحب الفساد ط واذا قیل لہ اتق اللہ اخذتہ العزۃ بالاثم فحسبہ جھنم ولبئس المھاد

آگے چوتھی قسم بیان فرماتے ہیں جس کا مصداق مومن کامل ہے اور اس کو اس لئے الگ بیان فرمایا تاکہ پہلی صورت کو یعنی:

من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ

کو کوئی مومن کامل کی ساتھ مخصوص نہ کرے پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مومن کامل کو مستقل بیان فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے:

ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ و اللہ رءوف بالعباد ط:

اور بعض آدمی وہ ہے جو اپنی ذات کو اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے بیچ دیتا ہے اسمیں دو قول ہیں کہ شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے یشری کو بمعنی یشتری کہا ہے یعنی ومن الناس من یشتری نفسہ

من المهالك والمخاوف اور یہ ایسا ہوگا جیسے بئسما اشتروا به انفسهم میں اشترا رنفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو اعمال صالحہ کر کے اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے خرید لیتا ہے یعنی بچا لیتا ہے مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشترا ر تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنے مراد لینے میں بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے میں مجاز صرف یہ ہوگا کہ بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اسکی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جسطرح چاہیں تصرف کریں۔

رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بُعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مبیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ بیع بلا تسلیم بھی ہو جاتی ہے دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ تسلیم کے لئے دوسرے کے قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسکو قادر کر دینا کافی ہے جس کو فقہاء تخلیہ سے تعبیر کرتے ہیں پس مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس پر ہر طرح قادر ہیں اب یہ انکی عنایت ہے کہ وہ بیع کر کے ہمارے ہی پاس امانت چھوڑ دیں۔ غرض یشری نفسه میں بیع کے معنی بعید نہیں ہیں البتہ مالیت کے اعتبار سے مجاز ضرور ماننا پڑے گا۔

ہاں ایک اشکال یہ ہوگا کہ جیسے اشترا میں مشتری وہ شی ہوتی ہے جو پہلے سے اپنے پاس نہ ہو ایسے ہی مبیع وہ شی ہوتی ہے جو پہلے سے مشتری کی ملک نہ ہو اور ہماری جان تو پہلے ہی سے حق تعالیٰ کی ملک ہے جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے مگر چونکہ

ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اسلئے ہمارے زعم کیموافق بیع کا اطلاق صحیح ہے اور جو لوگ اپنی جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں انکو یہ علم کہ مخاطبین جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں بعد سماع لفظ بیع کے حاصل ہوا ہے پہلے حاصل نہیں ہوا۔ ابن عطار کا قول ہے کہ

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ، ——— کو سن کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلہ میں ہماری جانیں خرید لی ہیں ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہمارے اندر دعویٰ مالکیت تھا جبھی تو اشتری فرمایا اس سے میرے جواب کی تائید ہو گئی کہ یہاں ہمارے مذاق کی رعایت کی گئی ہے پس راجح یہی ہے کہ یشری نفسہ میں بیع مراد ہے میں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ بعض وہ لوگ جو طلب رضا الٰہی کے لئے اپنی جان (تک) بیچ دیتے ہیں یہ تک میں نے اس لئے بڑھایا ہے کہ شان نزول اس آیت کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو آرہے تھے رستہ میں کفار نے گھیر لیا تو انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں (تیر اندازی کے فن میں یہ بہت مشہور تھے) اگر مقابلہ کرو گے تو میں تیروں سے سب کو مار ڈالوں گا باقی اگر تم کو مال کی ضرورت ہو تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لاؤ میں تم کو رقعہ لکھ دوں تم جا کر میرے وکیل سے مال لے لو۔ کفار نے اسی کو غنیمت سمجھا کیونکہ مقابلہ میں انکو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے رقعہ لکھ دیا اور وہ سب واپس چلے گئے۔ سو یہاں تو حضرت صہیب نے جان بچائی تھی اور جان بچانے کو مال دیا تھا جان دی نہیں تھی۔ سو شان نزول کو دیکھ کر معنے بیع پر اشکال ہوتا ہے کہ واقعہ نزول میں جان کی بیع کہاں ہوئی تھی بلکہ وہاں تو جان کو بچایا گیا تھا اسی وجہ سے بعض مفسرین نے یشری نفسہ کی تفسیر یشتری نفسہ من المھالک والمخاوف کی ہے۔ مگر میں نے لفظ تک بڑھا کر اشکال کو رفع کر دیا ہے۔ کہ گو حضرت صہیب نے اس واقعہ

ہیں بظاہر مال ہی دیا تھا مگر حقیقت میں وہ اپنی جان تک کو اللہ کی رضا کے لئے بیچ کر چکے تھے جسکی دلیل یہ ہے کہ وہ تن تنہا ہجرت کے لئے چل کھڑے ہوئے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کر چکا ہو کیونکہ کفار کے نرغہ میں سے تن تنہا ہجرت کرکے نکلنا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چلنا ہے پھر یہ تو ایک اتفاقی بات تھی کہ کفار مال لینے پر راضی ہوگئے۔ اگر وہ مقابلہ پر آمادہ ہوتے تو حضرت صہیب اللہ کے لئے جان دینے پر بھی تیار تھے اور اس کے لئے تیار ہو کر ہی نکلے تھے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ حضرت صہیب مقابلہ کرتے تو واقعی کمال تھا یا مال کو صدقہ کرتے تو یہ بھی ایک کمال تھا باقی جان بچانے کو مال دے دینا کیا بڑا کمال ہے یہ تو ہر شخص کیا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے تو جان بچاتے ہیں اپنی جان کی کی محبت سے اور حضرت صہیبؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان بچائی تھی جیسا کہ ابتغاء مرضاۃ اللہ سے معلوم ہو رہا ہے۔

خالی نیت

اور یہ بات محض اتنی نیت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ میں اللہ کے واسطے جان بچاتا ہوں بلکہ غلبۂ حال سے حاصل ہوتی ہے کہ یہ امر اس کا حال بن جائے کہ جان میری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی ہے جسکی حفاظت و خدمت میرے ذمہ ہے بدون اس حال کے خالی نیت کی وہی مثال ہوگی جیسے ایک مولوی لٹھ مار نے ساڈھورہ کے ایک پیرزادے کو جبراً نماز کے لئے کھڑا کیا تھا جب اسکو نیت کا طریقہ بتلایا تو وہ کہتا ہے نیت کرتا ہوں چار رکعت نماز فرض کی اللہ کیواسطے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر، وہ بیچارہ سچا آدمی تھا کہ اس نے اللہ کے واسطے کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور ہم لوگ اپنے دل کے روگ کو ظاہر نہیں کرتے ہم کام کرتے ہیں نفس کے ظلم سے اور کہتے یہ ہیں کہ اللہ کے واسطے کرتے ہیں صاحب جس پر یہ حال غالب ہوتا ہے وہ بہتیا نہیں ہے انکی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الٰہیہ میں ذرا سستی نہیں کرتے خدا کے احکام میں سب سے زیادہ چست ہوتے ہیں۔ اور جب حق تعالیٰ حفاظت

نفس کا حکم دیتے ہیں اسوقت وہ سب سے زیادہ اپنی حفاظت کرتے ہیں اُن کو اپنی جان سے اس لئے محبت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جان ہے بلکہ اس لئے محبت ہے کہ یہ خدا کی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں طاعات کی توفیق ہوتی ہے۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ٭ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ٭ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

پس حضرت صہیبؓ کا فعل ظاہر میں تو معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اس نیت و حال کیوجہ سے وہ حق تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا ہے اُن کی یہ نیت مقبول ہو گئی اور آیت میں ان کی مدح کی گئی خواہ مال کہیں پہنچے جیسے کسی کے گھر میں آگ لگ گئی ہو تو گو اس کا مال جل گیا صدقہ میں نہیں گیا مگر ثواب تو ملا کیونکہ آیت

ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس ـــــ میں آفات اضطراریہ پر بھی ثواب کا وعدہ ہے جبکہ صبر کیا جائے۔

روح قربانی

بہر حال تقویٰ کامل کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے یہی اس جگہ مراد ہے اسکو صوفیہ کی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں میرے نزدیک قربانی کی روح یہی ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں تمہاری قربانیوں کے لحوم و دماء حق تعالیٰ کے یہاں نہیں پہنچتے۔ بلکہ تقوے پہنچتا ہے یعنی وہ دل کی حالت کو دیکھتے ہیں کہ قربانی کے وقت یہ اپنی جان کو بھی ہمارے سپرد کر چکا ہے یا نہیں اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں نیت ہی پہنچتی ہے صورت شئی نہیں پہنچتی اس سے محرم کی رسم شربت کا غلط ہونا بھی ثابت ہو گیا جو لوگ محرم میں شربت پلاتے ہیں وہ یوں سمجھتے ہیں کہ شربت کا ثواب شربت ہی کی صورت میں پہنچتا ہے اور چونکہ حضرات شہداء کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے اس لئے یہ لوگ شربت ہی کا تصدق کرتے ہیں تاکہ انکو شربت پہنچ جائے سو اول تو یہی غلط ہے کہ شربت تصدق کرنے سے وہاں شربت ہی پہنچے گا دوسرے اس فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے

نزدیک حضرات شہداء نعوذ باللہ اب تک پیاسے ہی ہیں عوام میں اس کے متعلق ایک حکایت بھی مشہور ہے کہ خیر آباد کے ایک بزرگ تھے جن کے مرید نے زندہ پیر کی فاتحہ دلوائی تھی اور فاتحہ میں گرم گرم کھیر تقسیم کی تھی جب وہ پیر کے پاس آیا تو انہوں نے کہا میاں ذرا فاتحہ کے وقت گرم ٹھنڈا تو دیکھ لیا کرو تم نے گرم گرم کھیر دے دی جس سے میرے منہ میں چھالے پڑ گئے یہ حکایت کسی کی گھڑی ہوئی ہے ایسی ہی اختراعات کی بناء پر عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ جو چیز صدقہ کی جائے مردہ کو وہی پہنچتی ہے حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں نیت اور تقویٰ پہنچتا ہے لحم و دم نہیں پہنچتا۔

حقیقت قربانی

تقویٰ کے جو معنی اس مقام پر میں نے بیان کئے ہیں یعنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کا دوسرا عنوان فنا ہے اسکی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ حضرات صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض سے کیا۔ ماھذہ الاضاحی یارسول اللہ کہ یہ قربانی کیا چیز ہے اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ ما سوال عن الحقیقۃ کے لئے موضوع ہے تو اس کلام میں صحابہ نے حقیقۃ اضحیہ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سنۃ ابیکم ابراہیم سنت سے مراد طریقہ ہے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ حقیقت اضحیہ وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور ان کا خاص مذاق ہے اب دیکھنا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کا فعل کیا تھا اگر دنبہ کا ذبح کرنا مراد لیا جائے تو یہ بعید ہے کیونکہ وہ ان کا فعل قصداً نہ تھا بلکہ بغیر قصد تھا ان کا اصل فعل تو وہی تھا جو قرآن میں مذکور ہے یابنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری قال یابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین فلما اسلما وتلہ للجبین ونادینٰہ ان یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا

انا کذلک نجزی المحسنین ان ھذا لھو البلؤ المبین وفدینا ہ بذبح عظیم :

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصلی فعل ذبح ولد تھا اور دنبہ کا ذبح کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدل اور فدیہ تھا باقی اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ وہ ولد ذبیح کون ہیں اسمٰعیل علیہ السلام ہیں یا اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح ہے جسکی ایک دلیل تو یہ ہے کہ ذبح ولد کا قصہ بیان فرما کر حق تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے وبشرناہ باسحق نبیا من الصلحین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بشارت اسحاق سے مقدم ہے اس لئے وہ ذبیح نہیں ہو سکتے۔

دوسری لطیف دلیل یہ ہے کہ یقیناً جس ولد کو ذبح کیا گیا ہے بلوغ سے پہلے کیا گیا ہے کیونکہ نص میں یہ قید مذکور ہے فلما بلغ معہ السعی کہ جب وہ لڑکا چلنے اور دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا اور یہ حالت بلوغ سے بہت پہلے ہو جاتی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اسکے ساتھ یہ ملایئے کہ اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کی ساتھ تو ان کا صاحب اولاد ہونا بھی بتلا دیا گیا تھا ومن وراء اسحٰق یعقوب اور وحی قطعی ہوتی ہے تو اب اگر ان کے ذبح کا امر ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کو عین ذبح کیوقت وحی سابق کیوجہ سے انکی عدم موت کا پورا یقین ہوتا کہ یہ صاحب اولاد ہونے سے پہلے کسی طرح نہیں مر سکتے پھر اس ذبح میں بلاء مبین اور امتحان ہی کیا ہوتا اور اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی بشارت کوئی نہ تھی کہ یہ صاحب اولاد ہونگے اس لئے صحیح یہی ہے کہ ذبیح اسمٰعیل علیہ السلام ہیں بہرحال ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد تھا تو اب حضور کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ الاضحیۃ ذبح الولد یعنی قربانی کی حقیقت ذبح ولد ہے۔

سنتِ ابراہیمی کا مصداق

اور اگر لفظ سنت پر نظر کی جائے تو یوں

معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم کی سنت نہیں کیونکہ سنت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے پس سنّت ابراہیم کا مصداق وہ فعل ہونا چاہیے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلام نفس ہے یعنی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جسکو فنا کہتے ہیں یہی حضرت ابراہیم کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین اور ذبح ولد اس کی صورت تھی گو اسلام نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ انکو قتل نفس کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتل نفس سے بھی اشد ہے چنانچہ ہر صاحب حس سمجھتا ہے خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کلفت سے سہل ہوتی ہے اولاد کی حفاظت کیلئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے یہ تو اشدیت فی نفسہ ہے نیز اس وجہ سے بھی اشد ہے کہ اپنا قتل تو ایک ساعت کی کلفت ہے اور ذبح ولد عمر بھر کے لئے سانحہ جانکاہ ہے کسی کا بچہ اس کے ہاتھ سے ذبح ہو جائے تو عمر بھر اس کے دل پر آرے چلیں گے اس لئے اسلام نفس کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے اب یہ اشکال ہوگا کہ قربانی تو جانور کی ہوتی ہے نہ کہ ولد کی پھر یہ سنت ابراہیم کیونکر ہوئی جواب اس کا پہلے کلام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے اپنی عنایت سے تمہاری جان کا عوض حیوان کی جان کو بنا دیا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نفس اسمٰعیل کا جو حکماً عین نفس ابراہیم تھے فدیہ ذبح کبش کو قرار دیا گیا تھا اور اجر میں وہ ذبح ولد کے برابر تھا اسی طرح جانور کی قربانی بھی ثواب میں اپنی جان دینے کے برابر ہے اور یہی بذل نفس قربانی کی رُوح ہے جس کے واسطے میں نے یہ شعر پڑھا تھا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر : کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

کہ حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی رحمت و عنایت ہے کہ چند روپے خرچ کرنے میں اتنا

بڑا اجر دیتے ہیں ۔

جانور کا انتخاب مگر جب قربانی کا جانور آپکی جان کا عوض ہے تو اس کو کچھ تو ایسا ہونا چاہئے کہ محبوب اور پیارا ہو اب جو لوگ سڑیل سے سڑیل اور گھٹیا سے گھٹیا جانور خریدنے کی فکر کرتے ہیں یہ زیبا نہیں لیکن اگر عمدہ مال ہو اور سستا مل جائے تو اس کا مضائقہ نہیں یہ تو عاجل بشریٰ المومن اور غنیمت بارد ہے ہم خرما و ہم ثواب لیکن بعض لوگ تو چھانٹ کر خراب جانور خریدتے ہیں سو اسکی ممانعت ہے جیسا کانپور میں ایک شخص نے بکرا قربانی کیا تھا جس میں سارے عیوب تھے مگر ہر عیب تہائی سے کم تھا حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں۔

ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون ولستم باخذیه ط

اسمیں تیمم اور قصد کی ممانعت ہے کہ اللہ تعالیٰ کیواسطے چھانٹ کر بری چیز کا قصد نہ کرو تیمم کی قید میں بھی رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ بعض لوگ غریب بھی ہونگے جن کے پاس گھٹیا ہی مال ہوگا تو اگر وہ گھٹیا دیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ وہ گھٹیا کا انتخاب اور قصد نہیں کرتے بلکہ اس لئے گھٹیا دیتے ہیں کہ اُن کے پاس اور ہے ہی نہیں پھر آگے اس کا معیار بتلاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائیگا کہ ہر شخص کے اعتبار سے گھٹیا کا درجہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ولستم باخذیہ یعنی بس یہ دیکھ لو کہ اگر ایسی چیز کوئی تم کو دے تو تم بھی خوشی سے اسکو لے سکتے ہو لحاظ کا لینا معتبر نہیں اسلئے آگے الا تغمضوا فیہ بھی بڑھا دیا پس جو چیز تم دوسرے سے خوشی کے ساتھ لے سکتے ہو اسکو اللہ کے نام پر بھی دے سکتے ہو اور ظاہر ہے کہ جس غریب کے پاس سب گھٹیا ہی مال ہے وہ دوسرے سے بھی اس جیسی چیز کو لے سکتا ہے لہذا انکو گھٹیا جانور کی قربانی جائز ہے اور جو لوگ ایسے نازک ہیں کہ بیمار اور دُبلے جانور کا گوشت کبھی نہیں لیتے ہمیشہ عمدہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اگر یہ دبلا پتلا جانور قربانی کریں گے تو اسکی ممانعت ہوگی کیا رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے معیار بھی خود ہی بتلا دیا تمہاری رائے پر نہیں چھوڑا!

آگے فرماتے ہیں واللہ غنی یعنی خدا تعالیٰ غنی ہے اسکو تمہارے مال کی ضرورت نہیں پس خدا کے نام پر ایسا مال دو جیسا اغنیار کو دیا کرتے ہیں اسپر شاید کوئی یہ کہے کہ جب خدا تعالیٰ کو احتیاج نہیں پھر ہم جیسا چاہیں خرچ کر دیں تو فرماتے ہیں حمید یعنی گو انکو احتیاج نہیں مگر کرتے تو انہی رضا کے لئے ہو جب یہ ہے تو وہ محمود بھی ہیں اس لئے اس کے نام پر ہر حال میں مال محمود ہی خرچ کرنا چاہئے پھر بعض کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے کہ اللہ کے لئے مالِ محمود خرچ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ غنی حمید ہے مگر عمدہ مال میں روپے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں پھر محتاج ہو جاویں گے اس کا جواب دیتے ہیں الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء کہ یہ شیطان کا دھوکہ ہے وہ تم کو فقر سے ڈراتا اور بیحیائی کی بات بتلاتا ہے فحشاء سے مراد یہاں مفسرین کے نزدیک بخل ہے واقعی یہ کیسی بیحیائی کی بات ہے کہ خدا ہی کا مال اس کے حکم سے بھی دینا نہیں چاہتا آگے زیادہ ہمت بڑھاتے ہیں واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا اور اللہ تعالیٰ تم سے (انفاق پر) مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں اور ترقی (مال و دولت) کی اُمید دلاتے ہیں پس مطمئن رہو کہ صدقہ خیرات سے مال میں کمی نہ آئے گی بلکہ ترقی ہو گی (حدیث میں اسکی زیادہ تصریح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا ۱۲) آگے واللہ واسع علیم بھی ایک اشکال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ بڑے وسعت والے ہیں ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اسلئے وعدہ فضل پر شبہ نہ کرو اور وہ ہر شخص کے عمل کو خوب جانتے ہیں اس لئے یہ وسوسہ نہ کرو کہ اتنے آدمیوں میں ہمارے عمل کی کیا خبر ہو گی اُن سے ذرہ برابر کسی کا عمل مخفی نہیں فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ آگے توفیق پر حوالہ کرتے ہیں: ——— یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا ط وما یذکر الا اولوا الالباب

یعنی حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں فہم دیتے ہیں اور جس کو فہم عطا ہو گئی اس کو خیر کثیر مل گئی اور عقل والے ہی بات کو سمجھتے ہیں اس میں اُن لوگوں کو متنبہ فرما دیا

جو اعمال صالحہ کر لیے ہیں کہ وہ اس پر ناز نہ کریں اعجاب وتکبر اختیار نہ کریں یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے جو تم کو دین کی سمجھ دی اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائی بہر حال فقر کا اندیشہ نہ کرو اور خدا کے نام پر جہاں تک ہو سکے عمدہ جانور ذبح کرو جس کو ذبح کر کے کچھ تو دل دُکھے جیسا کہ اپنی جان کو پیش کرتے یا بیٹے کو ذبح کرتے تو دل دُکھتا اب ویسا تو کہاں دل دُکھے گا لیکن کچھ تو مال ایسا ہو جس کو ذبح کر کے دل پر کچھ چوٹ لگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون :

مراد بر کامل ہے کہ بر کامل تم کو اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک محبوب اشیاء کو خرچ نہ کرو۔ وما تنفقوا من شئ فان اللہ بہ علیم میرے نزدیک اس آیت میں من شئ مما تحبون کا بیان نہیں بلکہ اس کا مقابل ہے اور مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو محبوب شی ہی کے انفاق سے حاصل ہوگا اور یوں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے کچھ نہ کچھ ثواب مل ہی جاوے گا انفاق محبوب کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار قربانی کی تھی۔ آپ نے قربانی سے کئی مہینے پہلے ایک گائے خریدی اور اسکو خوب دانہ کھلایا پلایا اور عصر کے بعد جنگل میں اپنے ساتھ لیجا کر دوڑایا کرتے تھے قربانی کے وقت تک وہ اتنی تیار ہو گئی کہ اس ارزانی کے زمانہ میں بھی قصائی اسکی قیمت اسی روپے دے رہے تھے آج کل گرانی کے زمانہ میں تو نہ معلوم کتنی قیمت ہوتی مگر مولانا نے کسی کو نہ دی اور قربانی کے دن ذبح کیا جب وہ ذبح ہوتی تو مولانا کے دل پر اثر ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ عرصہ تک ساتھ رکھنے اور پرورش کرنے سے اسکی ساتھ محبت ہو گئی تھی اسپر کوئی یہ نہ کہے کہ رنج کے ساتھ ذبح کرنا تو اچھا نہیں بلکہ خوشی کے ساتھ ذبح کرنا چاہیئے کیونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

یا فاطمۃ احضری اضحیتک وطیبی بھا نفسا

لہذا ایسا جانور ذبح کرنا چاہیئے جس کے ذبح سے خوشی ہو کہ اچھا ہوا پاپ کٹا

سو یہ خیال غلط ہے حدیث میں طیب نفس کا امر ہے وہ خوشی عقلی ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں کہ ایسا جانور ذبح کرے جس سے دل دکھے یہ رنج طبعی ہے جو عقلی خوشی کے منافی نہیں۔

مشاہدہ کے بعد نذرانہ

غرض قربانی کا زمانہ بعد حج کے ہے اور حج کی روح مشاہدہ ہے اور مشاہدہ کے بعد نذرانہ دیا کرتے ہیں تو یہ قربانی نذرانہ ہے اب قاعدہ ہے کہ سلاطین نذرانہ کو رکھا نہیں کرتے بلکہ اسپر ہاتھ دھر کر واپس کر دیتے ہیں یہاں بھی یہی معاملہ ہے چنانچہ گوشت تو فوراً ہی دیدیا گیا کہ کھاؤ اور کھلاؤ اور غریبوں کو دو دوستوں کو دو یا سارا اپنے خرچ میں لے آؤ سب جائز ہے پہلی امتوں کو قربانی کا گوشت کھانا جائز نہ تھا بلکہ ذبح کر کے پہاڑ پر رکھ دیتے تھے غیب سے ایک آگ آکر جلا دیتی تھی یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اس کو قربانی کا گوشت واپس کر دیا گیا کہ جو چاہو کرو اور دوسری واپسی یہ ہے جس کا دوسری آیت میں ذکر ہے:

وما انفقتم من شیئ فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین۔

کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو حق تعالیٰ اس جگہ اس کا عوض عطا کر دیتے ہیں اور وہ سب دینے والوں میں بہتر ہیں تو جو عوض دیں گے وہ اصل سے بہتر ہوگا پس قربانی میں صورۃً تو آپ جانور کی جان پیش کرتے ہیں اور حقیقۃً اپنی جان پیش کرتے ہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا کہ اسکی حقیقت اسلام نفس ہے وہاں سے اس کے بدلہ میں آپ کو دوسری جان ملتی ہے۔ جو اس سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جس کی حقیقت دو مثالوں سے سمجھئے ایک تو آصف الدولہ کی حکایت ہے کہ اس نے بڑھیا کی سِل کو سونا بنا دیا تھا واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ نے ایک بڑھیا کو دیکھا کہ اصطبل میں ایک سِل لئے ہوئے گھوڑے کے سم سے رگڑ رہی تھی پوچھا مائی کیا کرتی ہو کہا بیٹیا میں نے سنا ہے کہ آصف الدولہ کے گھوڑے کا سم اگر پتھر پر پڑ جائے وہ سونا ہو جاتا ہے کہنے لگا سچ ہے مگر تم کو رگڑنا نہیں آتا تم سِل چھوڑ جاؤ میں سونا بنا

دوں گا وہ چھوڑ کر چلی گئی حکم دیا کہ اس سِل کی برابر ایک سونے کی سِل بنوا کر رکھ دو جب وہ بڑھیا آئی اسکو حوالہ کر دی اور کہا لو تمہاری سِل سونے کی بن گئی اور دوسرا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ ایک دیہاتی بہت غریب تھا جس پر فاقے گزرتے تھے اس کے گاؤں میں قحط شدید ہوا کہ کنوئیں اور تالاب خشک ہو گئے اسکی بیوی نے ایک دن کہا کہ خلیفہ بغداد سنا ہے بہت کریم ہے تم اس کے پاس جاؤ شاید تمہارا فقر و فاقہ زائل ہو جائے اس نے کہا کہ خلیفہ کے پاس جانے کے لئے کوئی ہدیہ اور نذرانہ بھی تو ہونا چاہیئے خالی ہاتھ کیونکر چلا جاؤں اور میرے پاس اس کے لائق ہدیہ کہاں ہے بیوی نے کہا ہمارے فلاں گڑھے میں جو صاف و شفاف کچھ پانی مجتمع ہے ایسا پانی خلیفہ نے کہاں دیکھا ہوگا تم یہ پانی ایک گھڑے میں بھر کر لے جاؤ یہ رائے مرد کی بھی سمجھ میں آگئی چنانچہ گھڑا بھر کر لے چلا ــــــ اور عورت نے مصلیٰ بچھا کر اس پاس پانی کے صحیح سالم پہنچنے کے لئے دعا کرنا شروع کی اسکو مولانا فرماتے ہیں ؎

زن مصلیٰ باز کردہ از نیاز ؛ رب سلم ورد کردہ در نماز

ادھر وہ تمام راستے رب سلم رب سلم کا ورد کرتا ہوا چلا کہ الٰہی اس گھڑے کی خیر رہے اور میرے قدموں کی بھی خیر رہے کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے کیونکہ اس بیچارہ کے پاس تو سب کچھ یہی تھا میں کہتا ہوں اسیطرح انبیاء علیہم السلام پل صراط پر اپنی امتوں کے لئے رب سلم رب سلم کے ساتھ دعا فرمائیں گے کہ الٰہی مسلمانوں کے قدموں کو لغزش سے بچائیے کہیں جہنم میں نہ گر جائیں پھر خدا خدا کر کے سلامتی کے ساتھ وہ گھڑا لیکر بغداد پہنچا اور دربار میں اطلاع و اذن کے بعد حاضر کیا گیا خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے تو وہ بدوی کہتا ہے ھذا ماء الجنۃ یہ جنت کا پانی ہے ایسا پانی کسی نے کبھی نہ پیا ہوگا۔ خلیفہ نے گھڑے کے کھولنے کا حکم دیا چونکہ عرصہ کا بند کیا ہوا تھا اس لئے کھولتے ہی دربار سڑ گیا۔ صاحبو! یہی حالت ہمارے اعمال کی ہے کہ وہ حقیقت میں سڑے ہوتے ہیں مگر خلیفہ کا کرم دیکھئے کہ اس نے

ذرا بھی کسی انداز سے بدوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کو اسکی بدبو سے اذیت ہوئی ہے بلکہ کمال یہ کیا کہ سر دربار اس میں سے ایک گلاس بھروا کر چکھا اور بہت تعریف کی کہ نہایت نفیس ولطیف پانی ہے اسکو خاص اہتمام سے فلاں جگہ رکھا جائے چنانچہ اس وقت تو اٹھوا کر کسی جگہ رکھ دیا گیا اور بعد میں اسکے غیبت میں گرا دیا گیا یہی معاملہ بلاتشبیہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہمارے اعمال تو سڑے ہوئے ہیں مگر حق تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی قدر فرماتے ہیں

پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اس بدوی کا گھڑا سونے کی اشرفیوں سے بھر کر واپس کیا جائے اور خدام سے کہا کہ اسکو دجلہ کے راستہ سے لے جانا تا کہ تکان دور ہو اور فرحت ہو نیز اسکو اپنے ہدیہ کی حقیقت اور ہمارے کرم کی عظمت کا مشاہدہ ہو جائے چنانچہ جب وہ دجلہ پر پہنچا ہے اور اسکی لطافت وشیرینی کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ اللہ اللہ یہ خلیفہ کیسا کریم ہے اس کو میرے گدلے اور متعفن پانی کی کیا ضرورت تھی جس کے شہر میں ایسی صاف وشفاف وشیریں نہر چل رہی ہو اور اب معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اس کے ہدیہ کی جو کچھ تعریف کی تھی وہ محض اسکی دلجوئی تھی ۔

صوفیہ کی کمائی

صاحبو ! یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے کہ ہمارے حسنات حقیقت میں سیئات ہیں مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ ان کو طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں اور ہم کو مطیعین میں داخل کر لیتے ہیں یہ ہے یبدل اللہ سیاتھم حسنات اور جیسے خلیفہ نے سڑے ہوئے پانی کے بدلہ میں سونے کی اشرفیاں دی تھیں ایسے ہی یہاں تم جو اپنی جان پیش کرتے ہو وہ سڑی ہوئی ہے کیونکہ صفات رذیلہ سے متصف ہے اور حق تعالیٰ اس کے عوض تم کو ایسی جان عطا فرماتے ہیں جو لطیف وشفیف ہے کیونکہ اب وہ متصف بصفات اللہ ہو جاتی ہے اسی کا نام فناء وبقاء ہے یہی صوفیہ کی تحصیل ہے کہ اول وہ اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں یہ تو فنا ہے اور اسوقت وہ جان صفات رذیلہ سے متصف

تھی پھر حق تعالیٰ اسکو اپنی صفات سے متصف کر کے واپس کر دیتے ہیں۔ بقاء ہے اور گو اسوقت بھی وہ جان حقیقت میں پہلی ہی جان ہوتی ہے مگر اسوقت کی اور پہلی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اسکی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کیمیاوی طریقہ سے تانبہ کو سونا بنا دیا جائے تو گو مادہ وہی ہے جو پہلے تھا مگر اسکی صورت اور حالت اور خاصیت اس درجہ بدل گئی ہے کہ اسکو وہی کہنا دشوار ہے بلکہ اب دوسری شے ہو گئی ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی ٭ گرچہ جوئی خوں بود نیلش کنی

اسی طرح یہاں فناء کے بعد تمہاری روح کی حالت ایسی بدل جاتی ہے کہ گویا دوسری روح ہے اب یہ اس کا مصداق ہو جاتی ہے کہ بی یسمع وبی یبصر وبی ینطق وبی یبطش وبی یمشی اس کا چلنا پھرنا بولنا سب خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتا کیونکہ خودی کو تو فنا کر چکا ہے یہی ہے روح قربانی کی کہ اول تم اپنی جان پیش کرتے پھر ادھر سے دوسری جان عطا ہوتی ہے گویا روح قربانی فنا و بقا ہے فنا اپنا فعل ہے اور بقاء حق تعالیٰ کا عطیہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ فناء و بقاء کتنی بڑی دولت ہے کہ صوفیہ کی ساری کمائی یہی ہے تو اس سے قربانی کی عظمت بھی معلوم ہو گئی اور کچھ قربانی ہی کی تخصیص نہیں بلکہ تمام اعمال کی روح یہی فنا و بقاء ہے ہر عمل میں اول حق تعالیٰ کے حکم سے بندہ اپنی جان کو پیش کرتا ہے پھر وہ اس کے بدلہ میں دوسری جان خود عطا فرماتے ہیں، اب جیسی فنا ہو گی ویسی ہی بقا ہو گی اگر فنا کامل ہے بقا بھی کامل ہے ورنہ اس کے مناسب بقا ہو گی مگر بہ نسبت اور اعمال کے اس فنا و بقاء کا ظہور قربانی میں زیادہ ہے اس لئے میں نے قربانی کے ساتھ اس روح کو بیان کیا ہے ورنہ فنا و بقا خود مقصود ہے خواہ قربانی کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے ہو پس یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قربانی کا وقت نکل جانے کے بعد پھر فنا و بقا کا حصول نہیں ہو سکتا نہیں ہر زمانہ میں ہر عمل کے ساتھ اس کا حصول ہو سکتا ہے پس اس کا اہتمام کرنا چاہیئے اب ترتیب اس تربیت کی یہ ہونا چاہیئے کہ اول

کسی کامل کے پاس رہ کر مجاہدہ میں مشغول ہو پھر مشاہدہ نصیب ہوگا پھر فنا و بقا حاصل ہوگا۔

حقیقت وصول

اور تم یہ مت سمجھنا کہ ہم اس قابل کہاں۔ ارے حق تعالیٰ بڑے کریم و جواد ہیں تم ایک دفعہ طلب میں مشغول تو ہو انشاء اللہ وصول بھی ہو جائے گا وہ اپنے طالب کو محروم نہیں کیا کرتے خود ارشاد فرماتے ہیں:

من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا ومن تانی یمشی اتیتہ ھرولۃ یہ انکی عنایت ہے کہ جب تم چلنا شروع کرتے ہو تو وہ خود تم سے زیادہ قریب ہو کر مسافت کو کم کر دیتے ہیں ورنہ انسان سے یہ راستہ کیونکر طے ہوتا یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں وصول انسان کے چلنے سے نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ خود آ کر اس سے مل جاتے ہیں تو در اصل واصل وہ ہیں یہ واصل نہیں ہے مگر یہ بھی انکی رحمت ہے کہ وہ طالب کو واصل کا لقب دیتے ہیں ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں ٭ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

اسی طرح یہ غایت کرم ہے کہ وہ ہم کو اپنا محب فرماتے ہیں:

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

حالانکہ حقیقت میں محب حق تعالیٰ ہیں کیونکہ محبت معرفت سے ہوتی ہے سو حق تعالیٰ کو تو ہماری معرفت ہے ہمکو انکی معرفت کہاں پس ہماری محبت جو کہ بلا معرفت ہے محض برائے نام محبت ہے ورنہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کو ہم سے محبت ہے مگر کس درجہ عنایت ہے کہ وہ ہم کو اپنا محب فرماتے ہیں واللہ بات بات میں انکی رحمت ہے کس کس بات پر جان فدا کی جائے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر کہ عاشق دیدیش معشوق داں ٭ کو بہ نسبت ہست ہم ایں و ہم آں

یعنی یہ مت سمجھو کہ تم ہی عاشق ہو بلکہ دراصل حق تعالیٰ تم کو چاہتے ہیں اُن کے چاہنے کے بعد تم نے ان کو چاہا ہے مگر دونوں میں فرق اتنا ہے کہ ؎

میل معشوقاں نہاں ست و ستیر ؎ عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر

انکی محبت مخفی ہے جس میں جوش و خروش نہیں کیونکہ وہ اضطرار سے پاک ہیں اور تمہارے عشق نے عالم میں ادھم مچادیا اور فرماتے ہیں ؎

ہم بد لہا می نماید خویش را ؎ ہم بدوزد خرقۂ درویش را

یعنی وہ خود ہی عشاق کے دلوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں جس کے بعد یہ عشق کا دم بھر نے لگتے ہیں پھر ان کی طلب اور ان کا عشق ناتمام ہوتا ہے تو وہ خود ہی اسکو کامل بھی کر دیتے ہیں کیونکہ اس طرح کہ دن بدن معرفت میں ترقی کرتے جاتے ہیں جس سے طلب و محبت کامل ہوتی جاتی ہے اور یہ کچھ اسی محبت کی ساتھ خاص نہیں مولانا عموماً دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاں بھی محبت ہوتی ہے اوّل محبوب کی طرف سے ہوتی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں ؎ آب ہم جوید بعالم تشنگاں

اور ایک بزرگ تو بطور کلیہ کے فرماتے ہیں ؎

اگر از جانب معشوق نباشد کششے ؎ طلب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

خیر اور جگہ تو ہو یا نہ ہو مگر حق تعالیٰ کے ساتھ تو واقعی یہی ہے کہ ہمکو اوّل محبت نہیں ہوئی بلکہ انہی کو اول محبت ہے پھر وہی خود ہم سے مل بھی جاتے ہیں بالکل ایسی مثال ہے جیسے بچہ کو ماں بلاتی ہے اور وہ چلنے پر قادر نہیں مگر دوڑنا چاہتا ہے تو ایک دو قدم تو وہ اٹھاتا ہے پھر ماں خود دوڑ کر اسکو گود میں اُٹھالیتی ہے۔ بلا تشبیہ یہی حال یہاں ہے کہ بندہ ایک دو قدم چلتا ہے پھر خود ہی اس کے پاس چلے آتے ہیں اور آغوش رحمت میں لے لیتے ہیں ورنہ انسان سے حق محبت کیا ادا ہوسکتا ہے ؎

ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست ؎ وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خرسند ست

ہمارا کیا حق تھا کچھ بھی نہیں جو کچھ بھی ہم کو مل جاتا کافی تھا مگر یہ اُنکی عنایت ہے کہ وصول بھی عطا فرماتے ہیں محبت سے بھی نوازتے ہیں، یہ ہیں کام کرنے کے ان میں کوشش کرو۔ وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ان دولتوں سے نوازیں اور اعمال صالحہ کی توفیق دیں ـــــــ وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین ؕ

:- فقہی مقالات :-

فقیہ اسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی فقہی بصیرت محتاجِ تعارف نہیں ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق پوری طرح سے ادا کر دیتے ہیں، موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔

"فقہی مقالات" دورِ حاضر کے اہم اور پیچیدہ علمی مسائل پر وہ گرانقدر کتاب ہے جس میں شریعت کے اصول و ضوابط کی روشنی میں درج ذیل عنوانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

کاغذی نوٹ اور کرنسی کا حکم
قسطوں پر خرید و فروخت
حقوق مجردہ کی خرید و فروخت

کرنسی کی قوتِ خرید
شیئرز کی خرید و فروخت
مغربی ممالک کے چند جدید مسائل

:- اسلامی بینکنگ کے چند مسائل :-

تمام اہلِ علم اور مسندِ افتاء کے رونق بخشنے والے حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اس نادر تحفہ کو پہلی فرصت میں حاصل کریں۔ قیمت =/۶۰

عود العید

عید کی خوشبو

یہ وعظ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے بیان سے قبل خود تحریر فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الوعظ المسمّٰی بہ

عُودُ العِیدْ

*

(بضم عین عود)

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ احقر مدعا طراز ہے کہ جس روز اس تقریر کے بیان کرنے کا ارادہ تھا اتفاق سے کوئی ضبط کرنیوالا نہ تھا اور باوجود گنجائش زمانہ کے بعض مشاغل کی تنگی تاخیر کی اجازت دیتی نہ تھی اس لئے خود احقر نے اس کو قبل بیان بہت مختصر ضبط کرلیا اور وعظ کے وقت اسی کو کسی قدر لبط کیساتھ بیان کردیا اجزاء ما بہ البسط چونکہ اصل تقریر کے درجہ میں ضروری نہ تھے اس لئے اُن کا ضبط نہ ہونا مضر نہیں سمجھا گیا بس اُسی تحریر شدہ تقریر کو داخل مواعظ کیا جاتا ہے۔ گو اور وعظوں سے صورۃً یہ بہت چھوٹا ہو گا لیکن "ما قل ودل" کا مصداق ہونے سے معناً یہ کسی سے چھوٹا نہیں۔

کتبہ : اشرف علی عفی عنہ

۲۶ ذیقعدہ ۱۳۲۵ھ، مقام تھانہ بھون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولٰکن ینالہ التقویٰ منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم وبشر المحسنین :

تکبیر و تعظیم اس آیت میں کچھ مضمون قربانی کے متعلق مذکور ہے قرب ذی الحجہ کے سبب اس بیان کو اختیار کیا جاتا ہے کہ سامعین ابھی سے اس کے اہتمام کے لئے آمادہ ہو جاویں ، حاصل اس آیت کا قربانی کی بعض غایتوں اور حکمتوں کا بیان فرمانا ہے اور گو آیت موقع ذکر حج میں وارد ہے مگر خود ان حکمتوں کے بیان میں تخصیص حج کی مقصود نہیں گو حج کو بھی شامل ہے اور حاصل ان حکمتوں کے دو امر ہیں ایک امر باطنی ایک امر ظاہری ، امر باطنی نیّت تقرب و اخلاص ہے جس کو ایک عنوان عام یعنی تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ دونوں یعنی نیّت تقرب و اخلاص اس کے اعلیٰ شعبوں سے ہیں اور باطنی ہونا اس کا ظاہر ہے مشاہدہ بھی ہے کہ فعل قلب ہے اور حدیث میں بھی ہے ان التقویٰ ھھنا واشار الیٰ صدرہ اس کی مقصودیت کو اوپر کی آیتوں میں تعظیم شعائر سے کہ وہ بھی امر مبطن ہے اور اس آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے لن ینال اللہ لحومھا الخ اور امر ظاہری ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا جس کو اوپر کی آیتوں میں

لیذکروا اسم اللہ علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام

سے اور اس آیت میں لتکبروا اللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب و اخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال و مدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہر چند کہ ظاہراً علیٰ ما ھداکم مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے علیٰ ما ھداکم من الذبح اللہ تعالیٰ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکالتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے مگر نیت درست نہ ہوتی یا تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہو گی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہو گی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈھتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو۔ بس یہ تفسیر ہے علیٰ ما ھداکم کی اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک تو عید کا دوگانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تو تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نماز دل میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائدہ بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی ہیں۔ جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اسکی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ

تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ عید گاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے ؎

معنی تکبیر این ست اے امیم کای خدا پیش تو ما قربان شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی ❊ ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی
گوی اللہ اکبر واین شوم لا سر ببر تا وا رہد جاں از عنا
تن چو اسمٰعیل وجاں ہمچوں خلیل ❊ کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل
ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ ❊ شاد وخنداں پیش تیغش جاں بدہ

اور اگر لتکبروا اللہ کو جو کہ آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوٰتیہ وغیر صلوٰتیہ کے لئے عام لے لیا جاوے جیسا کہ واذکروا اللہ فی ایام معدودات بیں ان ایام کے سب اذکار وتکبیرات بالاجماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہوگی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہم کو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوٰتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورۂ بقرہ کی آیت شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن الخ میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ھداکم واقع ہے اس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس ادھر دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور ادھر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر جملہ سورۂ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملۂ سورۂ حج کے مشتمل بصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے۔

پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی ذو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی یہ تعبیریں ہیں نیت تقرب واخلاص وتعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی

پر تعبیریں ہیں صلوٰۃ تکبیرات تسمیہ علی الذبیحہ پس سامعین کو ان ایام میں دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کر لیا اور بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد نری گمراہی ہے وعظ روح الارواح اس جامعیت کی ضرورت کے بیان میں قابل ملاحظہ ہے اور خود قرآن ہی کیسا اس میں واضح ہے کہ آیت میں دونوں امر سے تنصیصاً تعرض ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور دونوں طاعتوں کے جمع کی توفیق دے۔

وجہ تسمیہ وعظ اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام عود العید رکھتا ہوں اس لئے کہ عود کے دو معنے ہیں ایک خوشبوئے خاص دوسرے ساز خاص اور چونکہ یہ تقریر مشتمل ہے دو طاعت کے بیان میں ایک ذبح جس میں اراقۃ دم ہوتا ہے اور یہ دم فی سبیل اللہ ہے اور بعض دماء فی سبیل اللہ کی نسبت حدیث میں ہے لونہ لون الدم وریحہ ریح المسک پس اس دم ذبیحہ کو بھی مشابہت دم شہید کے سبب حکماً خوشبو قرار دے کر عود سوختنی سے تشبیہہ دی گئی اور عود سے یہ مناسبت سمجھی گئی کہ ایک تو عود کو آگ سے مناسبت ہے اور دم طحال وکبد ولحم ذبیحہ کو بھی بوجہ پکائے جانے کے آگ سے تلبس ہے دوسرے اس عمل کی جزا جنت میں ہے اور جنت میں عود کا سلگنا حدیثوں میں آیا ہے سو طاعت اراقۃ کو تو عود کے ایک معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت ہے اس لئے ان معانی کی رعایت سے اس کا یہ نام مناسب ہوا نیز لفظی لطافت اس نام میں یہ ہے کہ اس کے متصل والی عید الفطر کے متعلق جو بیان ہوا تھا اس بیان کا نام عود العید رکھا گیا ایک حرکت کی تبدیلی کے بعد گویا وہی نام اس کا ہو گیا اور اس میں یہ مشتبہ نہ کیا جاوے کہ عود تو آلات محرمہ سے ہے طاعت کو اس سے تشبیہہ دینا خلاف

ادب ہے بات یہ ہے کہ مجازات و استعارات و تشبیہات میں ایسی تنگی نہیں خود قرآن مجید میں متاع کی مذمت ہے اور حدیث میں امراۃ صالحۃ کو خیر المتاع فرمایا گیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عید ہی کے متعلق ارشاد ہے۔ لکل قوم عید وھذا عیدنا ظاہر ہے کہ قوم کفار کی عید بمعنی لہو ولعب ہے تو ذوق لسانی یہ ہذا عیدنا کا صاف مدلول یہ ہے کہ ہذا لعبنا تو مجازاً اس کو یوم اللعب کہہ دیا گیا اور حضرت علیؓ کا قول ہے ؎

السیف والخنجر ریحاننا ۞ اف علی النرجس والآس
شرابنا من دم اعدائنا ۞ وکاسنا جمجمۃ الراس

بہر حال یہ کوئی شبہ کی بات نہیں۔

ازالۂ شبہ بحمد اللہ اصل تقریر تو ختم ہو چکی اب ایک مختصر شبہ کا رفع کرنا باقی ہے بس پھر مجلس ختم ہے وہ شبہ بھی ایسے شخص کو ہوگا جس نے میری تقریر حدیث سنۃ ابیکم ابراہیم کے متعلق جو ابھی پرسوں کیرانہ میں ہوئی ہے جس کا نام میں نے سنتِ ابراہیم رکھا ہے سنی ہوگی یا بعد ضبط اسکی نظر سے گذرے گی اول میں اس تقریر کا خلاصہ عرض کرتا ہوں پھر اس سے جو شبہ ہو سکتا ہے اسکو ظاہر کروں گا پھر اس کا جواب دوں گا وہ تقریر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے عرض کیا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں آپ نے فرمایا سنۃ ابیکم ابراہیم سو احقر نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت لغوی نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے پس جواب یہ ہوا کہ التضحیۃ سنۃ خاصۃ لابراہیم لیس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہیے کہ وہ سنت خاصہ کون سا فعل ہے سو قرآن میں جو اس کے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں ان کے دو فعل منقول ہیں ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش فدیہ اور

عودالعید ج

ہر چند کہ سرسری نظر میں جو آپ کا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے
سنت ابراہیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بنا پر کہ اصل مامور بہ ذبح ولد
تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونے کا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ سنۃ ابراہیم ذبح الولد
جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہ سمجھا جاوے کیونکہ ذبح
بمعنے ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح
شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیاء علیہم السلام کا خواب
وحی ہے اور وحی میں غلط کا احتمال نہیں اور خواب میں انی اذبحک نص ہے تو ضرور ذبح
کو واقع کہا جاوے گا پس جب یہ اس کا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہوئی
کہ التضحیۃ ذبح الولد اور ظاہر ہے کہ یہ حمل ظاہراً صحیح نہیں اور تصحیح ضروری ہے
کیونکہ دونوں مقدمے صحیح ہوں تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیۃ ذبح الولد اور
اس کو نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے صغریٰ اور کبریٰ
کو اور یہاں سنۃ ابراہیم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات
اس کے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا بھی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے
مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیۃ سنۃ ابراہیم میں بجائے لفظ سنت ابراہیم
کے لفظ ذبح الولد رکھ دو تو عبارت یہ بن جاوے گی کہ التضحیۃ ذبح الولد اور یہی مدعا
تھا غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے پس اس کو
صحیح کرنا چاہئے یہاں موضوع و محمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس
حمل میں ہو سکتے ہیں ایک ۃ التضحیۃ صورۃ ذبح الولد دوسرا روح
التضحیۃ روح ذبح الولد تیسرا صورۃ التضحیۃ روح ذبح الولد
چوتھا روح التضحیۃ صورۃ ذبح الولد اور بجز ثانی کے سب کا بطلان
ظاہر ہے پس ثانی متعین ہو گیا یعنی ان دونوں فعل کی روح اور لب اور مغز ایک
ہے مطلب یہ ہے کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ وہ ہے جو ذبح ولد
کی حقیقت اور مغز ہے ۔

اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاوے گا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو مجھ پر کیا حالت گزرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گزرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کر ڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کر لینا ہو پس وہ امر جو گزرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فناء نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فناء نفس ٹھہرا۔ پس یہی فناء نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیۃ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیۃ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فناء نفس ہوا۔

اور میں نے اس پر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام و اعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریر سنۃ ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فناء النفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عود العید سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ سنۃ ابراہیم میں حقیقت بمعنے ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حمل اس کی دلیل ہے اور عود العید میں حقیقت بمعنی غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لتکبروا اللہ اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنی میں شائع ہے اس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہو گیا پس کچھ تدافع نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عود العید میں لفظ حقیقت کو بھی بچایا ہے۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فناء النفس پر متفرع کئے تھے یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب و اللسان ہے اور اس تکبیر کے لئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی

احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے خلاصہ یہ کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام النصوص علی احکام النفوس لازم عام ہے وعظ سنتِ ابراہیم کی حقیقت کے لئے اور وعظ عود العید کی غایت کے لئے سو اس طرح سے دونوں وعظوں کی تفریعات بھی متماثل ہوگئیں۔

بس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم صحیح اور توفیق عمل نصیب فرمادیں۔

آمین!

ترغیب الاضحیہ

قربانی کی طرف رغبت دلانا

قربانی کی ترغیب کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون ۱۰، ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ بروز جمعہ تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔
سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔
مولانا عبداللہ صاحب مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

ترغیب الاضحیہ

خطبہ ماثورہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ وَرَدَ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ قَالُوْا مَا ھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ:

ترجمہ: (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

تمہید | یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے فضیلت اضاحی میں۔ اس وقت ایک مختصر سا مضمون اضاحی کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ ہر چند کہ خستگی سفر کی وجہ سے تکان تھا مگر بعض عزیز مہمان اس وقت آئے ہوئے ہیں انکی وجہ سے خیال آیا کہ کچھ بیان ہو جائے اور اس قدر مقدم بیان کرنے کی اگرچہ ابھی ایام اضحیہ میں مدت زیادہ باقی ہے یہ وجہ ہے کہ پھر سفر کا ارادہ ہے خدا جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے اس وقت فقط ترغیب کے لئے فضیلت بیان کرنا مقصود ہے، باقی مفصل احکام اگر وقت ملا تو انشاء اللہ تعالیٰ قریب زمانہ میں بیان کر دیئے جائیں گے مضمون مقصود سے پہلے ایک مضمون بطور تمہید کے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے کریم ہیں کہ ہمارے نفع کی کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر تبلیغ کے نہیں چھوڑی۔ قربانی۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ یہ سب احکام اس وقت ہم کو ایک معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ہم کو ان کی کچھ قدر نہیں یعنی جیسی قدر کرنا چاہیئے اس درجہ قدر نہیں ہے۔

اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ہمیشہ سے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آئے ہیں جن لوگوں کو جستجو کے بعد یہ دولت ملی ہوگی انکی کیا حالت ہوئی ہوگی جیسے بھوکا آدمی اگر آدھی روٹی بھی مل جاتی ہے تو غنیمت سمجھتا ہے اور اگر معدہ فاسد ہو گا تو اس کو پلاؤ زردے کی بھی قدر نہ ہوگی چنانچہ صحابہؓ کے سوالات کے بعد جو جواب عنایت ہوئے ان کو تو بعد طلب ملے اور ہم کو مفت جیسا اس حدیث میں بھی ایسا ہی مضمون ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ہم کو بھی ان کی قدر کرنا چاہیئے اور یہ مضامین ثواب عذاب کے وہ ہیں کہ کوئی شئے ان سے زیادہ افضل وانفع ہمارے لئے نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے دریغ فرمایا اور کام کی بات چھپائی۔ حالانکہ یہ بات ممکن نہیں اور باوجود نافع ہونے کے سہل اس قدر ہیں کہ کسی قسم کی تنگی ان میں نہیں ہے بلکہ ان احکام کا سہل ہونا یہ خود دلیل انفع ہونے کی ہے اس لئے کہ قاعدہ تکوینیہ ہے کہ جو شئے زیادہ نافع

ہوتی ہے وہ نہایت سہل الحصول ہوا کرتی ہے دیکھو آدمی اور سب حیوانات کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے کہ اگر ایک منٹ بھی ہوا نہ ہو تو حیات ہی معرض ہلاک میں آجائے وہ ہی اس قدر ارزاں ہے کہ اسکی کچھ قیمت ہی نہیں اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے وہ اس قدر سستا نہیں ہے لیکن اور چیزوں کے اعتبار سے ارزاں ہے اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ گراں ہے اور جس شئے کی بالکل ہی ضرورت نہیں ہے وہ نہایت گراں ہے جیسے جواہرات کہ عمر بھر بھی اگر کسی کو نہ ملیں تو کچھ حرج نہ ہو چنانچہ صدہا آدمی ایسے ہیں کہ وہ جانتے بھی نہیں کہ لعل کیا ہے اور زبرجد کس چیز کا نام ہے۔ اسی طرح جس قدر علوم زیادہ نافع اور کارآمد ہیں وہ نہایت سہل ہوتے ہیں چنانچہ علوم شریعت بھی ایسے ہی ہیں کہ نہایت ضروری اور سہل ہیں اور ہر جگہ ان کے بتلانے والے موجود ہیں اور وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے اور یہی راز ہے اس میں قرآن شریف کی تعلیم کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضہ پر مل جاتے ہیں بخلاف دیگر علوم کے کہ وہ کم ہیں اور گراں ہیں۔ غرض دیکھنے کی چیز نفع ہے نہ کہ مضمون کی۔ دوسرے صفات مثل نایابی یا رنگینی یا لذت یا غموض ونحو ذالک اکثر لوگ رنگین مضامین ڈھونڈا کرتے ہیں چنانچہ وعظ میں بھی اس کا تجسس رہتا ہے کہ جس وعظ میں مزے دار اشعار ہوں اور نکتے اور لطائف وحکایات ہوں اس کو پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی واعظ مسئلے مسائل سنائے اس سے بھاگتے ہیں حالانکہ یہ زیادہ نافع ہے لیکن ان کو کیا معلوم ہے کہ ہمارے نفع کی کیا چیز ہے:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ

بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہے اور بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے نامناسب ہوتی ہے، حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ایسے ایسے مضامین ہم کو بتائے جو ہمارے کام آنے والے ہیں اور بے کار اور غیر ضروری مضامین ہم کو نہیں سکھائے۔ گو وہ رنگین ہوں یہ

تمام تقریر اس لئے عرض کی گئی کہ جو مضمون اس وقت بیان کیا جائے گا اس کو بیقدر اور معمولی نہ سمجھا جائے۔

حاصل یہ کہ ان مضامین نافعہ میں سے یہ مضمون بھی ہے کہ جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے ہم کو بتایا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قربانی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ یہ قربانیاں کیا چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اس مضمون کو سن کر لوگ کہیں گے کہ قربانی کی اس میں کیا فضیلت ہوئی لیکن سمجھدار کے لئے یہ بڑی بھاری فضیلت ہے بلکہ جس قدر فضائل قربانی کے آئے ہیں ان میں سب سے بڑی فضیلت یہی ہے۔ چنانچہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔

نکات حدیث قربانی

درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ سُنَّۃَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ کیوں فرمایا سنتہ ابراہیم فرما دیتے اَبِیْکُمْ کا لفظ کیوں بڑھایا اس کے متعلق دو اعتبار سے کلام ہے اول تصحیح کے اعتبار سے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تمام امت کا باپ کیسے فرما دیا۔ دوسرے غرض کے اعتبار سے کہ اس نسبت کی تصریح سے کیا فائدہ نکلا سو تصحیح کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ اَبِیْکُمْ فرمانا ایک تو اس طرح اس لئے صحیح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اکثر عرب کے باپ ہیں اس لئے کہ اکثر عرب بنو اسمٰعیل ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام بیٹے ہیں ابراہیم علیہ السلام کے اس لئے ابیکم فرمایا لیکن چونکہ آیت میں خطاب تمام امت کو ہے اس لئے کہ احکام مخصوص اہل عرب کے ساتھ تو ہیں نہیں اس لئے بہتر وجہ دوسری ہے کہ ابیکم سے مراد روحانی باپ لئے جائیں اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے روحانی باپ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب ہے نسباً بھی اور شریعۃً بھی نسباً تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور شریعۃً اس لئے کہ شریعۃً نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام شریعت ابراہیمی سے بہت ملتی جلتی

ہے اصولاً بھی اور فروعاً بھی اسی واسطے فرمایا ہے

وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا

یعنی اتباع کرو ملّت ابراہیم علیہ السلام کا یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تو تمام ملل و ادیان کی ناسخ ہے پھر ملّتِ ابراہیمی کے اتباع کا آپ کو امر کیوں فرمایا۔ جواب یہ ہے کہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا امر اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ملتِ ابراہیم ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ملّتِ ابراہیمی بھی اس کا ایک لقب ہے اور یہ لقب اس لئے ہے کہ یہ دونوں ملتیں آپس میں اصولاً و فروعاً باعتبار فروع کثیرہ کے متناسب و متوافق ہیں اور اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ اِتَّبِعُوْا اِبْرٰهِيْمَ کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتّباع کرو بلکہ اِتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ فرمایا اسکی ایسی مثال ہے جیسے کہا جائے کہ مذہب حنفی اختیار کرو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ شریعتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع شریعت میں جو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، وہ اختیار کرو اب یہاں سے ان معترضین کا اعتراض بھی جاتا رہے گا جو مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ یہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں۔

ابوّۃِ روحانی

الحاصل جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دینی بھی بہت قرب ہے اور نسبی بھی کہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے باپ ہیں تو اب یہ سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہیں اور اسکی تین دلیل ہیں اوّل وجہ عقلی ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کیا کیا کرتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ باپ کا کام یہ ہے کہ محنت مشقت جھیلتا ہے اپنے اوپر طرح طرح کے مصائب اٹھاتا ہے جس طرح اس سے ہو سکتا ہے اولاد کو پرورش کیا کرتا ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ روحانی پرورش فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے باپ کی طرح بلکہ

زیادہ قسم قسم کی تکالیف برداشت فرمائیں اور اُمت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا پس آپ روحانی باپ ہوئے۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ :

یعنی نبی مومنین کے ساتھ اُن کے نفوس سے بھی زیادہ قریب ہیں اور نبی کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں جب آپ کی بیبیاں ہماری مائیں ہیں حالانکہ وہ مربی ابتہ نہیں ہیں۔ صرف مربی کی بیبیاں ہیں تو خود آپ جو کہ مربی ہیں ضرور باپ ہیں اور اس ابوۃ وامومیت کو اس درجہ قوت ہے کہ نبی کی بیبیوں سے بعد وفات کے نکاح بھی حرام ٹھہرا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں لوگوں کو سنکر حیرت ہوگی کہ اس آیت سے باپ ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس سے تو ابوۃ کی نفی مستنبط ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے انشاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا کہ اس سے نہایت صاف طور سے ابوۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے۔ اول ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آگیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمایئے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے حالانکہ تضاد ہونا چاہیے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ

تو اس سے شبہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ نے ابوۃ کی نفی فرما دی تو حضور صلی اللہ علیہ

وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوں گے اسلئے آگے لٰکن سے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں کہ تمہاری رُوحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول کی دلالت معنی ابوۃ پر معتبر نہ کی جائے تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔ غرض عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی باپ ہیں تو ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے باپ کے باپ ہیں اس لئے کہ جب صرف زوجیت کے تعلق سے آپ کی بیبیوں کو ہماری مائیں فرما دیا تو نسبی تعلق تو اس سے زیادہ ہے اور قرآن شریف میں بھی آیا ہے مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ یہاں تو ظاہر ہی ہے کہ روحانی باپ مراد ہیں کیونکہ خطاب یقیناً عام ہے یہ کلام تو تصحیح میں تھا۔

اسلوب ترغیب

اب سمجھئے کہ غرض اور نکتہ اس لفظ کے بڑھانے میں کیا ہے کیا سُنَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ کافی نہ تھا بات یہ ہے کہ باپ شفیق بیٹے کو قسم قسم سے سمجھایا کرتا ہے اور ہر وقت اسی ذھن میں رہتا ہے کہ ایسے عنوان سے اس کو سمجھانا چاہیے کہ مؤثر ہو جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ باپ ہیں بلکہ باپ سے زیادہ شفیق ہیں اسلئے ترغیب کے مؤثر ہونے کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان کو اختیار فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کی طبعی بات یہ ہے کہ اس کو اپنے باپ دادے سے اور ان کے رسم و رواج سے نہایت تعلق ہوتا ہے اور اس رسم کا دل سے نکلنا بہت بھاری ہے چنانچہ جب کفار کو بت پرستی سے روکا جاتا تھا یا آج کل کی رسم مروجہ کو روکا جاتا ہے کو بڑا جواب یہ ہوتا ہے کہ اوپر سے اسی طرح ہوتی آئی ہیں غرض خاندانی بات کی بڑی پچ ہوتی ہے اور یہی حکمت ہے حدیث اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَیْشٍ میں کہ یہی تخصیص کی وجہ ہے وہ یہ کہ دین اسلام کا ظہور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوا اور آپ قریش میں ہیں تو گویا دین قریش کے گھر کی چیز ہے سو جس قدر ان کو حمایت دین کی ہوگی اس قدر دوسرے کو نہ ہوگی باقی یہ کہ بنی ہاشم کو خاص کیوں نہیں کیا تو وجہ یہ ہے کہ بنی ہاشم بہ نسبت قریش کے بہت کم ہیں اور قریش زیادہ، ممکن ہے کہ ان میں سے کسی وقت صاحب صلاحیت کی تلاش میں دقت ہوتی بہرحال اس حکمت سے تائید ہو گئی کہ خاندانی شے سے بہت تعلق

ہوتا ہے اور خصوصاً عرب میں کہ وہاں حمیت قومی کا بڑا جوش تھا جب یہ ثابت ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یہ قربانی کرنا تو کوئی باہر کی بات نہیں ہے یہ تو تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے یہ تو خاندانی مذہب ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر کس قدر شفقت ہے کہ طرح طرح کے عنوانات سے آپ ہم کو ترغیب دیتے ہیں کہ شاید عنوان مؤثر ہو جائے شاید وہ عنوان کافی ہو جائے اللہ اکبر۔ بہر حال مقصود فضیلت بیان کرنا ہے اضحیہ کی۔

اثبات فضیلت رہا یہ امر کہ اس سے فضیلت کیسے ثابت ہوئی تو اس کا سمجھنا چند مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے اول یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت جو فرمایا تو اسکی کیا وجہ ہے ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا تھا کہ جس کی وجہ سے اضحیہ سنت ابراہیمی ہوئی سو کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا کہ اسکو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے کیا کیا تھا انہوں نے یہ کیا تھا کہ بامر الٰہی اپنے پیارے بیٹے کے ذبح کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ عزم شئے اس شئے کے کر دینے کے حکم میں ہے جو ثواب یا عقاب کسی فعل کے ارتکاب کرنے پر مرتّب ہوتا ہے وہ ہی اس فعل کے عزم پر بھی مرتب ہوتا ہے دیکھئے اگر دولہا کے پاس جو بیوی کو پہچانتا نہ ہو کسی عورت کو اجنبی عورت کو کہہ کر بھیج دیا جائے۔ حالانکہ وہ اس کی منکوحہ ہو اور وہ اس سے مجامعت کرے تو زنا کا گناہ ہوگا اور اگر منکوحہ بتلا کر اجنبی کو بھیج دے تو کچھ گناہ نہیں ہے اسی طرح اگر حلال کھانے کو کسی نے مغصوب کہا تو اس کا کھانا حرام ہے اور اگر حرام کو حلال کہہ دیا اور اس کو کوئی شبہ تو یہ نہیں ہوا تو اس کا کھانا حلال ہے ان مسائل سے معلوم ہوا کہ ثواب و عذاب کا مدار عزم پر ہے تو گو ابراہیم علیہ السلام نے ذبح نہیں کیا لیکن عزم تو فرمایا بلکہ فعل کا وجود بھی ہوا گو اثر مرتب نہیں ہوا یعنی چھری پھیر دی اور یہی سمجھ کر چھری پھیری کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں لیکن حق تعالیٰ نے بجائے ان کے مینڈھے کو بھیج دیا۔

پس جب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح ولد کی حاصل ہو گئی۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے بیٹے کے ذبح کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شئے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝

(تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر بِر حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس بِر کا حاصل ہونا معلوم ہوا۔ فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی جواب یہ ہے کہ بِر سے مراد بِر کامل ہے اور دلیل اسکی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ،

یعنی یوں جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شئے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شئے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل وکثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شئے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن بِر خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ بِر سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شئے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجے کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہیے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔

اس کے بعد معلوم کرنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اضحیہ کو سنتِ ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے پھر اضحیہ سنتِ ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا کہ اے اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملے گا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھیئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے اُن کو اُن کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر اُن سے جو کم درجے کے ہیں اُنکو اسی درجے کا انعام ملے گا مثلاً وزراء وارکانِ دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپراسیوں اور خدام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہم السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام انکو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیئے یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے ادون ہو وہاں تو اُتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے کہ یہ عمل ہمارا ذبح ولد سے بدرجہا ادون ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتنا بڑا انعام ہے اور اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ برکت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کیسا لطف وکرم ہے یہ فضیلت تو اضحیہ کی ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمّہ واجب بھی نہ ہو تو اس ثواب کی تحصیل کے واسطے وہ بھی

نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے بغیر کئے نہ لیے۔

قربانی پر انعام آخر دنیا کے بہت سے کام بلا ضرورت محض تفریح کیواسطے کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اگر تھوڑا سا خرچ کر دو گے تو کیا حرج ہوگا اور اگر ضرورت ہی پر مدار رکھتے ہو اور یوں کہتے ہو صاحب جو فرائض و واجبات ہیں ہم تو وہی ادا کریں گے۔ تو دنیا کے کاموں میں اس پر عمل کیوں نہیں ضرورت تو اس قدر ہے کہ سدِّ رمق جَو کی روٹی اور گرمی سردی مہلک سے بچاؤ کے واسطے گاڑھے گزی کا کپڑا مل جاوے پھر یہ پلاؤ اور زردے اور کوفتے کیوں کھاتے ہو اور ململ و تن زیب و مخمل کیوں پہنتے ہو۔ اللہ اکبر نفس کے خوش کرنے کو تو غیر ضروری کام بھی کرلیں اور دین کے کام میں یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب کیا بہت ضروری ہے اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس کا ترک بہت بڑا حرج ہے تو اس کا اہتمام کریں ورنہ ترک کر دیں صحتِ اعتقاد کے لئے تو بیشک ضرور پوچھو کہ ضروری ہے یا نہیں کیونکہ ضروری کو ضروری اور غیر ضروری کو غیر ضروری اعتقاد رکھنا ضروری ہے لیکن کرنے کے لئے تو یہ پوچھنا کافی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوتے ہیں بلا تامّل نہایت مستعدی اور رغبت سے اس کو کرو بہت لوگ محبت دین کا دم بھرتے ہیں اور بدنی اعمال میں مستعد ہیں — لیکن روپیہ خرچ کرنے کا جہاں وقت آیا تو وہ حیلہ حوالہ کرتے ہیں اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بدو کو کسی نے دیکھا کہ نہایت پریشان بدحواس ہے اور رو رہا ہے اور بغل میں روٹیوں کا تھیلا بھرا رکھا ہے کسی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو کہا کہ میرا کتا مر رہا ہے اس شخص نے کہا کہ تھیلے میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں ہیں اس نے کہا کہ پھر اس کو کیوں نہیں دیتا کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں رکھتا کہ روٹی دوں کہ اس کو دام لگے ہیں صرف آنسو بہانے کی

محبت ہے کہ مفت کے ہیں تو بعض لوگوں کی محبت کا دعویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں ٹکا خرچ ہو وہاں صفر ہے اور یہاں تو درحقیقت خرچ بھی نہیں ہوتا کیونکہ صدقات وخیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ کہیں جاتا نہیں جو کچھ ہے اپنے ہی لئے ہے بلکہ قربانی تو ایسی شئے ہے کہ کچھ ہاتھ سے بھی نہیں نکلا اس لئے کہ ثواب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجزاء قربانی کے تقسیم ہی کر دو بلکہ اختیار ہے خواہ تقسیم کر دو یا خود منتفع ہو ہاں بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ غرض سب اپنے پاس رکھو جب بھی ثواب ملتا ہے۔

کیا قربانی خلافِ عقل ہے

اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ خرچ کرا کے لیتے بھی نہیں پھر کیا چیز مطلوب ہے کیوں خرچ کرواتے ہیں اس سے مقصود کیا ہے اگر کچھ گوشت کھلانا ہم کو منظور ہے تو منیٰ اور مکہ معظمہ میں ہزاروں جانور ذبح ہوتے ہیں ان کا کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا بالکل ضائع ہوتے ہیں۔ اور یہ عقل کے خلاف ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو خوش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شئے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپکا پیدا ہونا جس طریقے سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانہ میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلافِ عقل معلوم نہیں ہوتا تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلافِ عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا کہ چار روٹیاں۔ ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھا لو اور پی لو اور باتیں بنا لو۔ جب اتنی عقل

ہے تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں۔ ایسے ہی نفسِ اضحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابلِ انکار کیسے ہوگئی اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت و راز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہے اور شے محبوب کا انفاق مقصود ہے۔ اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اوّل تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کر دیا اور یہاں سے ایک امر اور بھی ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ جب قائم مقام ولد کے ہے تو اس جانور کے اندر ضرور ایسے صفات ہونا ضروری ہیں کہ جن سے قائم مقام ولد کے ہو وہ یہ کہ خوب موٹا تازہ جانور ہو کہ جس کو ذبح کرتے ہوئے کچھ تو دل دُکھے جیسے ذبح ولد میں دل دکھتا۔ بالکل مریل نہ ہو کہ جس کے ذبح ہو جانے کو غنیمت سمجھے کہ مرتا تو یہ ضرور خیر اچھا ہوا اس سے یہی کام نکل آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفیاں تھیں یہ جو لوگوں کی عادت ہے کہ رذّل خذّل کم قیمت جانور ذبح کر دیتے ہیں۔ یاد رکھو کہ وہاں بھی ایسا ہی ملے گا اور جب کہ وہ پھر تم کو ہی ملنے والا ہے تو جس قدر اس میں خرچ کرو گے اپنی ہی واسطے ہے۔

اضاعتِ مال کا شبہ اور یاد رکھو صدقہ سے مال گھٹتا نہیں حدیث شریف میں ہے لَا يَنْقُصُ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ قطّ اور اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر دس روپے پاس تھے تو دس ہی رہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ برکت ہوتی اور کام آتا ہے اگر صدقہ نہ دیتا تو وہ ادھر اُدھر ضائع ہو جاتا اور صدقہ دینے سے جس قدر باقی رہتا ہے وہ سب اسی کے کام آتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آج کل نو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سراسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہارِ محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

اور وہ اس میں حاصل ہے۔ بہرحال ضائع کہاں ہوا۔ اور اگر کہا جائے کہ جی دکھتا ہے کہ ہماری شئے جاتی رہی جواب یہ ہے کہ وہ تمہاری شئے ہے کہاں تم خود تو اپنے ہو ہی نہیں تمہاری شئے کہاں سے آئی تم خود مملوک ہو غلام کسی شئے کا مالک نہیں ہوا کرتا اگر کوئی کہے کہ ہم مملوک نہیں ہیں اول تو کون ایسا ہوگا جس کا یہ اعتقاد ہو کہ ہم اللہ کے مملوک نہیں ہیں دوسرے یہ کہ اسکی ایک دلیل بھی ہے وہ یہ کہ دیکھو خودکشی حرام ہے اگر تم اپنے مالک ہوتے تو اپنے اندر جو چاہتے تصرّف کر سکتے تھے پس آپ بھی خدا کے ہیں اور جانور بھی خدا کے اگر کوئی کہے کہ جناب مال خرچ کرنے سے تو دل تنگ نہیں ہوتا بلکہ اس سے دل دکھتا ہے کہ جانور کی جان ضائع ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ آپ بے فکر رہیئے جب خود مالک ہی ضائع کرائے تو آپ کون ہیں بڑے دردمند نکل کر آئے ہیں۔

ہر عیب کہ سلطان بپسندد ہنر ست (جس عیب کو بھی بادشاہ پسند کرے وہ ہُنر ہے)

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دین ؛ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

(اگر دین کا بادشاہ مجھ سے یہ خواہش کرے کہ میں لالچ اور حرص کروں تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈال دینا چاہیئے)

اور اگر کسی طرح اسکی حکمت سمجھ میں نہ آئے۔ تو اس طرح سمجھو کہ بعض دوائیں تو موثر بالکیفیت ہوتی ہیں اور بعض مؤثر بالخاصہ، ہم یہ کہتے ہیں کہ نصوص سے ثابت ہو گیا کہ یہ اعمال صالحہ مؤثر بالخاصہ ہیں ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ اضحیہ ہمارے لئے نافع ہے اس میں یہ خاصہ ہے ہم کو لم اور علت معلوم نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز محمد بن ذکریا طبیب اگر کہہ دیں کہ فلاں دوا میں یہ خاصہ ہے تو اس کے کہنے پر تو ایسا یقین رکھتا ہے کہ اس میں شبہ ہی نہیں ہوتا اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر کسی فعل کا خاصہ بیان فرما دیں تو اس میں تجھ کو شبہ ہوتا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ بقدرِ ضرورت فضیلت اضحیہ کی ثابت ہو گئی۔ اس وقت میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ فقط :

الضحایا

قربانی کے جانور

۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں "فضائل قربانی" کے موضوع پر ۲ گھنٹہ چالیس منٹ تک بیٹھکر بیان فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً دو صد تھی حضرۃ مولانا محمد عبداللہ گنگوہی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا

سلسلہ التہذیب کا ساتواں وعظ

الضحایا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلیٰ کل ضامر یاتین من کل فج عمیق لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر۔

تمہید یہ چند آیتیں ہیں جن کا موقع ہے تو حج کے متعلق مگر چونکہ حج مناسک میں بعض ایسے امور بھی ہیں کہ وہ غیر حج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ان آیات میں ان بعض مناسک کا ذکر ہے۔ بلکہ اس کے متعلقات کا بھی ذکر ہے اسلیے

ان آیتوں کو تلاوت کیا گیا اور وہ قربانی ہے جو ان آیتوں میں مذکور ہے اور اس کے بعض متعلقات بھی مذکور ہیں جس کے اندر غور کرنے سے اس کے فضائل بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کروں اول ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیئے وہ یہ ہے کہ عبادت کی فضیلت کے اسباب ہوا کرتے ہیں اور ان اسباب کی وجہ سے عبادت کے فضائل دو قسم کے ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ فضائل جو مشترک ہوں تمام عبادات میں۔ اور دوسرے وہ جو مختص ہوں پھر جو مشترک فضائل ہیں ان کی ہیں دو قسمیں۔ ایک وہ جو حقیقۃً عبادت کے اعتبار سے آویں۔ مثلاً عبادت مطلق کی حقیقت ہے۔ تذلل اور افتقار ظاہر کرنا مولائے بے نیاز کی درگاہ میں اس میں حقیقت میں تمام عبادات مشترک ہیں اور اس کے اعتبار سے جو فضائل ہوں گے۔ وہ مشترک ہوں گے۔ دوسرے وہ فضائل ہیں جو آثار و عوارض مشترکہ کے اعتبار سے ہیں۔ اور وہ بھی مشترک ہوں گے۔ اور ان عوارض و آثار میں غایات بھی داخل ہیں۔ مثلاً مطلق عبادت کی غایت ابتغاء مرضات اللہ ہے یعنی اللہ کی رضامندی کا طلب کرنا یعنی عبادت کا عبادت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس سے مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہو اگر یہ نہ ہو تو وہ عبادت عبادت نہیں ہے محض صورت عبادت ہے جیسے اگر کسی شخص نے بلا وضو نماز پڑھی یعنی نماز کی ہیئت بنائی۔ تو نماز کے اجزاء تو ظاہراً پائے گئے۔ مگر چونکہ اس میں ایک شرط مفقود ہے اسلئے اس کو نماز نہ کہیں گے جب شرط کے مفقود ہونے سے جو کہ اصلی مقصود بھی نہیں۔ نماز نہیں ہوتی۔ تو جو غرض اصلی ہے یعنی ابتغاء مرضات اللہ مفقود ہو تو نماز کیسے ہوگی۔ مثلاً نماز پڑھی اور مقصود یہ ہو کہ لوگ ہمارا اعتبار کرنے لگیں اور نمازی کہیں۔ تو یہ عبادت نہیں۔ لیکن چونکہ ابتغاء مرضات اللہ ایک امر مبطن ہے اسلئے اس نماز کو ایسا فاسد نہ کہیں گے جیسے ترتیب نہ ہونے سے یا مثلاً رکوع یا سجدہ نہ ہونے سے فاسد کہا جاتا ہے احکام دنیا میں ایسی نماز کو صحیح کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ نماز موجب نجات نہ ہوگی۔ حالانکہ صورت پائی گئی غرض یہ عارض یعنی غایت بھی تمام عبادتوں میں مشترک ہے۔ بہر حال بعض امور جو مدار فضیلت

ہیں۔ وہ ہیں جو حقیقت میں داخل ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو خارج ہیں مگر ہیں دونوں مشترک سو مجھے قربانی کے متعلق ایسے فضائل بیان کرنا مقصود نہیں ایسے فضائل تو بہت ہیں۔ مجھ کو بیان کرنا صرف ان فضائل کا ہے جو قربانی کے ساتھ مختص ہیں جو کہ فضائل کی دوسری قسم ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر عبادت کے اندر جیسے کہ فضائل مشترکہ عامہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اول بیان کیا گیا ہے اسی طرح ہر عبادت کے کچھ فضائل خاصہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ وہ ایسی عبادت کے اندر پائے جاتے ہیں مثلاً نماز کے کچھ خصوصیات ہیں کہ وہ روزہ میں نہیں۔ اسی طرح روزہ کی خصوصیات حج میں نہیں اور حج کے خصوصیات روزہ اور نماز میں نہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ عبادت خصوصیت کے ساتھ نظر شارع میں مقصود ہوا کرتی ہے۔ ورنہ اگر وہ خصوصیات مقصود نہ ہوتیں تو چاہیئے تھا کہ تلاوت کی جگہ نماز اور نماز کی جگہ روزہ۔ اگر کوئی کر لیتا تو کافی ہو جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

شرف قربانی

پس معلوم ہوا کہ عبادت صرف درجہ اطلاق ہی کے اعتبار سے مقصود نہیں ہے بلکہ ہر عبادت کی صورت نوعیہ بھی مقصود ہوتی ہے پس اسی طرح قربانی کے اندر بھی کچھ خصوصیات ہیں کہ وہ دوسری عبادات کے اندر نہیں پائی جاتیں میں انہیں خصوصیتوں کو بیان کروں گا۔ لیکن بیان مختصر ہی ہوگا۔ اول یہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی عبادت کے خواص کہ جو مبنیٰ فضیلت کے ہیں ان کی چند قسمیں ہیں۔ حصر عقلی تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن تتبع اور استقراء سے وہ پانچ خواص ہیں کہ جو فضائل مبنیٰ اور اسباب بن سکتے ہیں۔ اول سبب تو وہ ہے کہ جس کا مرجع اس عبادت کی حقیقت کی طرف ہے اسلیئے کہ ہر عبادت کی ایک حقیقت ہے اس کے اعتبار سے گا ہے اسی کو فضیلت ہی ہوتی ہے جیسے نماز کی حقیقت رکوع، سجدہ، قیام، قرات ہے۔ اور روزہ کی حقیقت امساک عن الاکل والشرب والجماع ہے۔ اسی طرح قربانی کی بھی ایک حقیقت ہے۔ اراقۃ الدم فی زمان مخصوص لوجہ اللہ۔ دوسری فضیلت کی وجہ زمانہ کی فضیلت کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی اس عبادت کا زمانہ چونکہ بابرکت ہے

اسلیئے اس کو فضیلت ہے۔ جیسے فرض روزہ کی فضیلت زمانہ کی فضیلت کی وجہ سے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ زمانہ حقیقت سے خارج ہے لیکن اس کو دخل ضرور ہے چنانچہ اس کے شرف سے عبادت کا شرف بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور بعض زمانہ ایسے بھی سمجھے گئے ہیں کہ ان میں عبادت منع ہے۔ تیسری وجہ مکان ہے کہ مکان عبادت کا ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ جس کے شرف سے اس عبادت کا شرف بڑھ گیا جیسے نماز ہے کہ فی نفسہ بھی اس میں فضیلت ہے لیکن مسجد میں ہو تو زیادہ فضیلت بڑھ جاتی ہے ہاں بعض عوارض کی وجہ سے جیسے کہیں اخفاء مقصود ہو۔ اس سے نوافل گھر میں افضل ہوجاتے ہیں اور اس قاعدہ سے سنن مؤکدہ بھی گھر میں ہی افضل ہونا چاہیئے لیکن ان کا مسجد میں ہی پڑھنا اسلیئے افضل ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک سنن تک معمول بہ نہیں ہیں۔ تو اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ شخص اسی فرقہ میں ہو باقی فرضوں کے لیئے یہی افضل ہے کہ مسجد میں ہو اور اس کی فضیلت اس لیئے ہے کہ مسجد ایک شریف جگہ ہے وہاں ملائکہ کا اجتماع ہوتا ہے اللہ تعالےٰ کی طرف اس کی نسبت ہے۔ علی ہذا حج کی فضیلت کہ وہ بوجہ مکان کے بھی ہے چوتھی وجہ فضیلت کی غایت ہے اور غایت سے مراد نمایت مختصر ہے اور وہ غایت خواہ دنیا میں مرتب ہو۔ جیسے روزہ میں قوت بہیمیہ کا انکسار ہے یا آخرت میں جیسے حدیث میں آیا ہے کہ صائمین جنت کے باب الریان سے جاویں گے اور اگر اس پر کوئی کہے کہ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھے اور روزہ رکھے تو باب الریان سے کیسے جاوے گا اسلیئے کہ ترک صلوٰۃ سے دوزخ میں جاوے گا۔ جواب یہ ہے کہ مطلب یہ ہے کہ روزہ کا فی نفسہ مقتضےٰ یہ ہے کہ وہ باب الریان سے جاوے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ اور یہاں ترک صلوٰۃ مانع ہے اور اگر یہ اشکال ہو کہ جو شخص نماز اور روزہ دونوں ادا کرے تو نماز کا اقتضا تو یہ ہے کہ باب الصلوٰۃ سے جاوے اور روزہ کا مقتضےٰ یہ ہے کہ باب الریان سے جاوے تو دونوں بابوں سے کیسے

جاوے گا۔ جواب یہ ہے کہ جو صفت جس پر غالب ہو گی اُس دروازے سے جاوے مثلاً اگر کسی کو نماز سے زیادہ دلچسپی ہے تو باب الصلوٰۃ سے جاوے گا۔ اور اگر روزہ سے زیادہ لگاؤ ہے تو باب الریان سے جاوے گا۔ پانچواں سبب فضیلت کا یہ ہے کہ بانی یعنی بادی اس عبادت کا ایک فضیلت رکھتا ہے یا تو وہ فعل اس نے خود کیا تھا اور اللہ تعالےٰ کو پسند آگیا۔ اور اس کو عبادت بنا دیا۔ اور یا ابتداءً اللہ تعالےٰ نے اس پر فرض کیا ہے۔ اور پہلی صورت میں اللہ تعالےٰ کے پسند آنے کی قید اسلیئے بڑھائی کہ کسی فعل کے عبادت ہونے کے لیئے محض رائے کافی نہیں ہے تاوقتیکہ وحی سے اس کی تاکید و تقویت نہ ہو۔

افعالِ عادیہ کی قبولیت

باقی رہا یہ شُبہ کہ جس نے اول کیا۔ اس نے محض رائے سے کیوں کیا۔ بات یہ ہے کہ اس نے اس کو علیٰ وجہ الخصوصیت عبادت سمجھ کر نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اپنے اجتہاد سے کسی کلی مصلحت سے کیا تھا۔ پھر وہ فعل اللہ تعالےٰ کو پسند آگیا۔ اور اس کو عبادت بنا دیا۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کا قصہ مجھ کو یاد آگیا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیرخوار بچے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہاجرہؓ کو مع ان کے بچہ کے مکہ معظمہ کے میدان میں چھوڑ دو۔ اللہ اکبر کیسے حکم کے امتثال کرنے والے تھے کہ اس وادی میں جہاں نہ پانی تھا نہ دانہ۔ ذرا خیال نہ آیا کہ ان کا کیا حشر ہو گا۔ فوراً ان کو وہاں لے جا کر چھوڑ دیا۔ خیر ابراہیمؑ تو پھر بھی مرد تھے۔ اور صاحب وحی تھے۔ لیکن ہاجرہؓ ان کی بی بی تو صاحب وحی نہ تھیں۔ اس حالت میں کہ دودھ پیتا بچہ ساتھ اور میدان ایسا کہ وہاں نہ دانہ نہ پانی اور احتمال یہ کہ کوئی بھیڑیا کوئی درندہ آکر کھا جاوے لیکن ان سب باتوں کا کچھ خیال نہیں کیا اور نہ اس کے متعلق کچھ سوال کیا۔ سوال تو کیا تو کیا کہ یہ پوچھا کہ ہم کو آپ یہاں اپنی رائے سے چھوڑے جاتے ہیں یا خدا کا حکم ہے فرمایا خدا کا حکم ہے کہنے لگیں اذاً لا یضیعنا۔ جب یہ خدا کا حکم ہے تو اللہ تعالےٰ ہم کو ضائع نہ کریں گے۔ دیکھئے کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس جملہ سے کہ یہ حکم خداوندی

ہے ان کو بالکل اطمینان ہوگیا کیسی قوت توکل حق تعالےٰ نے عطا فرمائی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام تھوڑا سا پانی ان کے لیے اور کچھ کھجوریں دے گئے تھے۔ پانی ختم ہوگیا۔ اب اسمٰعیل علیہ السلام کو پیاس لگی۔ وہاں دو پہاڑیاں تھیں صفا اور مروہ۔ ان کا اب بھی نشان باقی ہے، اسوقت جنگل میں تھیں۔ اب ان کے درمیان بہت بڑا بازار ہے حضرت ہاجرہؓ پریشانی میں پانی کی تلاش کے واسطے ایک پہاڑی پر چڑھیں تاکہ دیکھیں کہ کہیں پانی تو نہیں ہے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی ——— کہیں پانی نظر نہ پڑا۔ وہاں سے اتر دوسری پہاڑی کی طرف جانے لگیں۔ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو برابر دیکھتی جاتی تھیں۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان میں ایک نشیب تھا جب وہاں پہنچیں تو اسمٰعیل علیہ السلام نظروں سے غائب ہوگئے اسلیئے اس کو دوڑ کر قطع کیا تاکہ جلدی پھر وہ پیش نظر ہو جاویں اور وہاں سے نکل کر دوسری پہاڑی پر جاکر نظریں دوڑائیں لیکن کہیں پانی نہ ملا وہاں سے اتریں تو پھر صبر نہ آیا اور اسی طرح پھر پہلی پہاڑی پر پہنچیں کہ شاید اب پانی نظر آئے اسی بے چینی میں وہ سات مرتبہ ادھر سے اُدھر اور ادھر سے ادھر آئی گئیں۔ اس مضطربانہ حرکت پر حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاکر اسمٰعیل علیہ السلام کے لیئے اپنی بازو سے پانی زمین سے نکالو۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور جہاں اسمٰعیل علیہ السلام پیاس سے بے تاب ہوکر رو رہے تھے۔ ایڑی ماری وہاں سے پانی کا چشمہ اُبلا جس کا نام اس وقت زمزم ہے یہ تو قصہ ہے باقی میرا مقصود اس سے یہ ہے کہ حق تعالےٰ کو اپنے مقبول بندوں کا بعض فعل ایسا پسند آجاتا ہے گو وہ بطور عبادت کے بھی نہ ہو یوں ہی علی سبیل العادت ہی ہو۔ دیکھو تمہارے اولاد ہو یا کوئی عزیز ہو اور اس سے محبت ہو یا کوئی محبوب ہو تو اس کے کمالات تو پسند آتے ہی ہیں اس کے معمولی حرکات بھی پسند آتے ہیں حتیٰ کہ ٹھوکر کھا کر گرنا بھی پسند آتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے سے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم ؎ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

(سر سے لیکر پاؤں تک جہاں نظر پڑتی ہے کرشمہ دل کا دامن کھینچتا ہے کہ یہی جگہ سب سے زیادہ حسین ہے)

اور یہاں تک کہ اس کا موت اور گوہ بھی پسند آتا ہے مثلاً بچہ کو قبض ہوگیا۔ اب تم بے چین ہو حکیم صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے دوا دی۔ اور ماں نے اُسی روز عمدہ جوڑا بدلا تھا اس نے اسی پہ پاخانہ پھیر دیا تو ماں ذرا بھی چیں بچیں نہ ہوگی بلکہ شکر کریگی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے میرے بچہ کو صحت ہوئی اور کپڑوں کی کیا پرواہ ہے اللہ تعالیٰ اور دیں گے جبکہ ماں کی یہ کیفیت ہے تو اللہ تعالےٰ کو تو ماں سے بھی زیادہ محبت ہے اگر اس کو بھی اپنے مقبول بندوں کے عادی حرکات پسند ہوں۔ بشرطیکہ معصیت نہ ہوں تو کیا تعجب ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہؓ کا یہ بے تابانہ اور مضطربانہ پانی کی تلاش میں دوڑنا ایسا پسند آیا کہ قیامت تک کے لیے اس کو حج میں داخل فرمادیا۔ اب وہ گڑھا تو نہیں رہا۔ مگر نشان کے لیئے اس کی مبتدا و منتہیٰ پر دو پتھر لگے ہیں۔ جب صفا و مروہ کے درمیان چلتے ہیں تو ان دو پتھروں کے بیچ میں دوڑ کر چلتے ہیں کوئی پوچھے اس میں کیا بات ہے جو ملحد ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مجنونانہ حرکت ہے لیکن ہم کو یہ ان کا یہ کہنا ناگوار نہیں ہے ہم تو اس لقب کو قبول کرکے یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

ماا گر قلاش وگر دیوانہ ایم ؏ مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و دیوانے ہیں تو اس کی ذمہ داری اس ساقی اور اس پیمانہ پر ہے جس نے ہم کو مست کردیا ہے)

یاد رکھو حق تعالیٰ کی اطاعت ان مجنونانہ حرکات ہی سے معلوم ہوتی ہے اور جس کی وجہ معلوم ہوگئی اس کو کرنا تو کوئی کمال نہیں ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ؏ نیگیختن علت از کارِ تو۔

(تیرے ذکر سے ہم زبان تازہ کرتے ہیں اور تیرے کاموں میں چون چرا نہیں کرتے۔

اور بندگی تو حقیقت میں یہ ہے کہ یہ حالت ہو ؎

زندہ کنی عطائے تو ؏ ور بکشی فدائے تو ؏ دل شدہ مبتلائے تو ؏ ہر چہ کنی رضائے تو۔

(اگر تو زندہ کرے تو تیری عطا ہے اور اگر تو مار ڈالے تو ہم تجھ پر قربان ہیں۔ دل تیرا مبتلا ہو چکا ہے اب جو تیری مرضی ہو وہ کر۔

کر دو اور ان کا اتباع اختیار کرو۔ ـــہ

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

اسمیں اپنے ارادے اور اختیار کے فنا کرنے کی ضرورت ہے پستی و شکستگی کی حاجت ہے

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

طلب اور درد اور شکستگی حاصل کرنا چاہیئے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جو بزرگ سمجھے جاتے ہیں شکستگی اُن میں بھی نہیں۔

ایک صاحب کی حکایت یاد آئی جو ظاہر میں بزرگ اور نیک سب کچھ تھے ایک بار وہ یہاں جمعہ کے روز آئے وعظ میں شریک ہونے۔ مکان اُن کا اتنی نزدیک تھا کہ بعد وعظ کے جاتے تو شام تک پہونچ جاتے چنانچہ اکثر لوگ وعظ سنکر چلے بھی جاتے تھے ان کے ایک عزیز نے اس احتمال سے ان سے پوچھ لیا کہ اگر شام کو یہاں قیام ہو تو میں کھانے کا انتظام کروں۔ بس بزرگ صاحب کہاں تھے خفا ہو گئے کہ یہ کیسی کوئی تہذیب ہے کہ آپ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کھانے کا انتظام کیا جاوے یا نہیں۔ تم کو کھانا تیار کرنا چاہیئے تھا پھر چاہے ہم ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔

خدا کی پناہ! اس تکبر کی بھی کوئی انتہا ہے کہ آپ سے بلا پوچھے ہی کھانا تیار کیا جائے پھر اگر بعد میں آپ نے کہدیا کہ ہم جاتے ہیں تو اس غریب کا سارا پکا پکایا کھانا برباد جائے۔ غرض یہ سب طرائے یہیں چھوڑ دو۔ حج میں تو سب اپنے کمالات گم کر دینا چاہیئے

عورتوں کیلئے حج میں ہدایت

عورتوں پر اور بھی تعجب ہے۔ یہ مردوں سے بھی زیادہ حج کا ارادہ کر کے اپنے کو بڑا سمجھنے لگتی ہیں بلکہ آجکل عموماً ویسے بھی عورتوں میں بڑائی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بعض دفعہ تو یہ مردوں سے خوشامد کراتی ہیں ان کو شرم اور غیرت بھی نہیں آتی کہ مرد رات دن جان کھپا کر ان کے واسطے کما کر لاتے ہیں کیا مردوں کی عنایت کا یہی نتیجہ ہے کہ یہ مردوں کے سر چڑھتیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عورتیں ذرا صبر و تحمل سے

کام لیا کریں تو ان کو مردوں سے زیادہ ثواب ملے کیونکہ یہ ضعیف اور کمزور ہیں ضعفاً
کا تھوڑا سا عمل بھی قوی آدمی کے بہت سے اعمال سے بعض دفعہ بڑھ جاتا ہے مگر
عورتوں میں جس قدر ضعف ہے یہ اسی قدر مردوں پر شیر ہوتی ہیں اور یہ مردوں کا
تحمل ہے کہ ان کو سر چڑھا لیتے ہیں ورنہ ان کے سامنے عورتوں کی حقیقت ہی کیا ہے
اگر مرد کو غصہ آجائے تو ایک دن میں ان کو درست کر سکتا ہے۔ چنانچہ سخت مزاج
لوگ ایسا بھی کر لیتے ہیں بزرگوں نے نقل کیا ہے یغلبن العاقل ویغلبھن
الجاھل کہ عاقل مرد پر تو عورتیں غالب ہو جاتی ہیں مگر جاہل مرد اُن پر غالب ہوتا ہے
اس کا راز یہی ہے کہ عاقل تحمل سے کام لیتا ہے اور جاہل تحمل نہیں کرتا۔ اسلئے
جاہلوں سے یہ خوب درست ہو جاتی ہیں۔ بہر حال عورتوں کو بجبر کرنا بہت نازیبا ہے
ان کو حج میں طرح دے سے کام لینا چاہیئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قبل حج ہی اپنے
ملکات رذیلہ کو نکالو اور نفس کی اصلاح کرو۔

حج میں فکر اصلاح

اب یہ سوال باقی رہا کہ اب تو حج کو جا رہے ہیں اب قبل
حج یہ سہل کیسے ہو تو میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ قبل حج
کامل بن جائیے کیونکہ کمال ایک دن یا ایک ہفتہ میں حاصل ہونا عادۃً دشوار ہے

ع صوفی نشد صافی تا در نکشد جامے ــــ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

میرا مقصود یہ ہے کہ اسوقت سے اسکی فکر میں تو لگ جائیے وہ بھی اثر میں
مثل اصلاح ہی کے ہے جیسا قرآن میں یہ حکم نازل ہوا اتقوا اللہ حق تقاتہ
کہ خدا سے ایسا ڈرو۔ جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہ گھبرا گئے۔

اور گھبرائے کیوں گئے؟ میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ وہ اسواسطے گھبرا گئے کہ صیغۂ امر
اصل میں موضوع ہے۔ وجوب کے لیئے اور اگرچہ مطلق امر کے واسطے فور ضروری
نہیں۔ مگر فور متبادر ضرور ہے۔ ہاں اگر وہ فعل یقینی طور پر تدریجی ہو تو وہاں فور
متبادر نہیں ہوتا ورنہ عموماً امر سے تبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ابھی فوراً کیا جائے پس
فاتقوا اللہ حق تقاتہ سے صحابہؓ یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت کامل تقوے

والے بھی مختلف ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ دوستی کا محض دم بھرتے ہیں۔ نفلیں بہت پڑھ لیں گے۔ قرآن پڑھ لیں گے۔ لیکن ان سے ایک پیسہ خرچ نہیں ہو سکتا۔ اور جن لوگوں کو محبت ہے ان کو اس سے حیرت ہوتی ہے۔ ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ حق تعالے کے مقابلہ میں ان کو کسی شے کی بھی وقعت نہیں ہے طلحہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں ان کے پاس ایک باغ تھا۔ نہایت سرسبز اور شاداب تھا اور ایسا گنجان کہ ایک روز ایک پرندہ نے ہر چند چاہا کہ نکل جاؤں۔ مگر جدھر جاتا تھا شاخیں حائل ہوتی تھیں۔ ابو طلحہؓ نماز پڑھ رہے تھے یہ قصہ دیکھ کر خیال آگیا کہ اب تو میرا باغ خوب پرورش پا گیا ہے۔ اور اس خیال سے خوش ہوئے سلام پھیرنے کے بعد فوراً ہی خیال آیا کہ اللہ اکبر اس باغ کی وجہ سے میں تھوڑی دیر حق تعالیٰ کی یاد سے غافل رہا۔ فوراً حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ باغ تو میرے لیے فتنہ ہو گیا ہے میں اس کو رکھنا نہیں چاہتا۔ اللہ کے واسطے پیش کرتا ہوں آپؐ کو اختیار ہے کہ آپ جہاں چاہیں صرف فرما دیں۔ بس ان کو اس امر کا قلق ہوا کہ میرا دل خدا تعالے سے دوسری طرف کیوں ہوا اس کو غیرت کہتے ہیں ؎

بہر چہ از دوست واماند چہ کفر آں حرف چہ ایماں ٭ بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش چہ زیبا

(دوست کے دامن سے جو کچھ ملتا ہے اسمیں یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کفر ہے اور یہ ایمان ہے اسی طرح سے یار کے نقش قدم سے تو کتنا ہی دور پڑا ہوا ہو تیرے لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ یہ نقش برا ہے یا اچھا)

ایک اور قصہ ایسا ہے لیجئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے ایک مکان قبہ دار دیکھا پوچھا یہ کس کا مکان ہے کسی نے عرض کیا کہ فلاں انصاری کا ہے۔ آپؐ سن کر چپ ہو رہے جب وہ انصاری آئے تو انہوں نے سلام کیا تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو سلام کا جواب نہیں دیا۔ انہوں نے دوسری طرف جا کر سلام کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم

نے مُنہ پھیر لیا۔ انہوں نے ایسا منظر کیوں دیکھا تھا۔ دیکھ کر روح ہی تو قبض ہو گئی اب آہستہ آہستہ ہر ایک سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ کیا بات ہے۔ کسی نے کہا اور تو ہم کو کچھ بات معلوم نہیں۔ صرف اتنی بات ہوئی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تمہاری طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ اور پوچھا تھا کہ یہ مکان کس کا ہے۔ بس اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے ابھی پورا یقین اس کا نہیں ہے کہ بنی ناخوشی کا یہی مکان ہے محض شبہ ہی ہوا کہ شاید یہ مکان ہی سبب ناراضی کا ہو محض اسی شبہ پر جا کر اس مکان کو خدا جانے کتنی لاگت کا ہو گا جڑ سے کھدوا کر پھینکدیا کہ میں کیا آگ لگاؤں گا۔ اس مکان کو جو سبب ہو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا۔ خیر شبہ پر تو مکان کو اکھاڑ دیا۔ یہ تو ہوا ہی تھا۔ اسکے بڑھکر لیجیے کہ آکر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہیں کی جتلایا نہیں کہ میں نے ایسا کیا اسلئے کہ آپ پر کیا احسان تھا۔ اتفاق سے جب آپ کسی اور دن اُس طرف تشریف لے گئے اور وہ مکان نہ دیکھا تو پوچھا کہ وہ مکان کیا ہوا صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، اُن کو یہ شبہ ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں اسلئے اس کو منہدم کرا دیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں جو تعمیر ضرورت سے زیادہ ہو وہ وبال ہی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مال کا خرچ کرنا بڑی علامت محبت کی ہے پس قربانی کو ایک تو اس حیثیت سے فضیلت ہوئی کہ اس کی حقیقت جنسِ انفاق مال ہے۔

انفاق محبوب اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انفاق مال کا کون سا فرد پسندیدہ ہے تو اس کی نسبت سے ارشاد لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون یعنی تم نیکی کو ہرگز نہ پہنچو گے یہاں تک کہ اس شے سے خرچ کرو جس کو تم چاہتے ہو۔ اب تو یہ حالت ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر نکمی چیزیں اللہ کے نام خرچ کی جاتی ہیں کھانا جب سڑ جاویگا اور باورچی یا ماما آکر کہے گی کہ اس میں سے بو آنے لگی ہے تو کہیں گے کہ اللہ کے واسطے دیدو۔ کپڑا پھٹا ہوا جو کسی قابل نہ ہو کہیں گے دیدو کسی طالب علم کو اللہ واسطے۔ غرض اللہ واسطے وہ شے تجویز کرتے ہیں جو بالکل نرمل

اور اپنے سے کمی ہو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ یاد رکھو جیسی شے تم دیتے ہو ایسی ہی وہاں تم کو ملے گی بھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے ایک خوشہ دیکھا کھجور کا جس میں گلی ہوئی کھجوریں تھیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یاد رکھو وہاں ایسا ہی ملے گا کسی شخص نے ایک خط کو ایک انگوٹھی دی تھی اس پر نگین نہ تھا تو اس شخص نے دعا دی کہ اے اللہ اس کو جنت میں ایسا گھر دیجئے کہ جس پر چھت نہ ہو ہاں اگر کسی کے پاس عمدہ چیز ہی نہ ہو تو وہ دوسری بات ہے اس کی وہی عمدہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کے واسطے پیاری چیز دینا چاہیئے۔

اسی طرح قربانی کے اندر جو جانور خریدا جائے اس کو خوب دیکھ لینا چاہیئے کہ تمام عیوب سے سالم ہو۔ قیمت میں اچھا ہو اس کے محبوب ہونے کی بھی صورت ہے اب لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ سڑیل سے سڑیل جانور قربانی کے لیے خریدتے ہیں کانپور میں ایک شخص تھے انہوں نے ایک مینڈھے کی قربانی کی تھی جس کی کیفیت یہ تھی کہ تمام عیوب اس کے اندر تھے۔ کان کٹا بھی۔ دم کٹا بھی۔ دُبلا بھی۔ ایک محلہ دار نے ان سے کہا کہ اس کی قربانی ناجائز ہے اس نے کہا واہ جائز ہے۔ ہر عیب اس میں چوتھائی سے کم ہے۔ اس نے پوچھا کہاں لکھا ہے کہا ہماری بیوی کہتی ہے اور فوراً گھر پہنچے اور بیوی صاحبہ سے کہا دیکھو تمہارے مسئلہ پر فلاں شخص اعتراض کرتا ہے انہوں نے اسی وقت اردو کا شرح وقایہ منگا کر اور اس میں جہاں وہ مسئلہ تھا۔ نشانی رکھ کر باہر بھیجدیا۔ کہ دیکھ لو یہ لکھا ہے۔ آجکل یہ حالت کہ دین کے بارے میں ہر ایک کو جرأت ہوتی ہے۔ مگر ہم نے یہ نہ دیکھا کہ اردو کی کتاب دیکھ کر کسی نے بیوی کو مسہل دیدیا ہو اور بعض ایسے دلیر ہوتے ہیں کہ اردو کی کتابوں سے علاج بھی کرتے ہیں۔ مگر غیروں چنانچہ مطبع نظامی میں ایک خط آیا تھا۔ اسمیں لکھا تھا کہ میرے پاس ہر فن کی کتابیں ہیں چنانچہ اردو کا شرح وقیہ داس نے اسی طرح لکھا تھا) بھی ہے اس سے فتوے لکھ لیتا ہوں مگر لوگ کہتے ہیں کہ طب کا فیض بھی جاری کردو۔ اسلیئے آپ طب احسانی بھیج

دیکھئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو لوگوں کے جان و مال دونوں کو تباہ کرتے ہیں۔ ایک جاہل طبیب کی نسبت کسی نے کہا کہ وہ ایسے حکیم ہیں کہ جس کو ہاتھ لگاتے ہیں مرض نہیں رہتا۔ میں نے کہا مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور مرض نہ رہے اور یا یہ کہ مریض ہی نہ رہے بالمعنی الثانی یہ صحیح ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تم اردو کی کتابوں کی مذمت کرتے ہو۔ حالانکہ بڑے بڑے عالموں نے اردو میں ترجمہ مسائل کا اور دیگر مفید کتابوں کا کیا ہے بات یہ ہے کہ عالموں نے اسلیئے ترجمہ کر دیا ہے کہ تم آسانی سے کسی عالم سے سبقاً سبقاً ان کو پڑھ لو۔ اس لیئے ترجمہ نہیں کیا کہ خود دیکھ کر مفتی ہو جاؤ۔ اور علماء ہی پر اعتراض کرنے لگو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر فن اور ہر صنعت کے لیئے استاد کی ضرورت ہے خواہ وہ فن کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو۔ اسی طرح دین بھی ایک فن ہے جب تک کسی سے سیکھا نہ جائے وہ آتا نہیں۔ لیکن عجب بات ہے کہ اور ہر شئے کے لیئے استاد کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں لیکن اگر ضرورت نہیں تو بس دین میں نہیں اسمیں ہر شخص مجتہد ہے غرض وہ اردو کا شرح وقایہ اُن کی بیگم صاحبہ نے بھیجدیا کہ جس کو شبہ ہو دیکھ لو۔ اس شخص نے کہا کہ ہم اس کو نہیں جانتے تم جامع مسجد چلو وہاں مدرسہ ہے وہاں علماء موجود ہیں اُن سے پوچھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیوں جائیں۔ جب ہمارے گھر میں خود علامہ موجود ہے۔ غرض وہ نہ گئے۔ بعضے لوگ باوجود استطاعت کے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ کہ سستا حصہ ملے۔

اندازِ تشکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سورۃ بقر ختم کی تو ایک قیمتی اونٹنی ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھیں۔ گو وہ اشرفی تقریباً تین روپیہ کی ہوتی تھی۔ مگر تب بھی نو سو روپے کے قریب قیمت ہوئی۔ اور اتنی قیمت تو ملتی تھی۔ غالب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہی کی ہوگی۔ گویا ایک ہزار روپیہ کی سمجھو۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان حضرات کی نظر میں قرآن مجید اور اس تعلیم و تنظیم کی کس قدر و قیمت تھی۔ ایک آجکل دیکھیئے کہ معلموں کی ذرا قدر نہیں۔

اگر حافظ قرآن صرف کھانا طلب کرے تو یہ بڑا جرم ہے۔ کہتے ہیں کہ میاں جی کو تو عید کا کھانا ملا کرتا ہے اور عید کا کھانے میں بھی بڑا احسان سمجھتے ہیں۔ اور اگر عیدی بقرعیدی بھی دیدی تو گویا خرید ہی لیا۔ اور اگر ختم قرآن پر غلہ ہی دیدیئے تو ساری عمر گاتے پھریں گے۔ دیکھئے قدر دان یہ لوگ تھے کہ سورۂ بقر جو قرآن کا بارہواں حصہ بلکہ کسی قدر کم ہی حصہ ہے اس کے ختم کے شکریہ میں انہوں نے ایک اونٹنی ذبح کی جس کی قیمت آپ کو ابھی معلوم ہوئی۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اغنیاء صحابہ میں سے نہیں تھے ہمیشہ ان کی یہی حالت رہی۔ حتیٰ کہ جب وفات فرمائی تو قرض ذمہ پر تھا۔ زندگی میں ادا کرتے رہتے تھے۔ انتقال کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی کہ میرا قرض ادا کر دیجیو۔ باوجود اس حالت کے بھی اتنی قیمتی اونٹنی انہوں نے ذبح کر دی۔ اور باوجود اس حالت کے بھی کہ واجب بھی نہ تھی۔ محض شکریہ اور خوشی کے واسطے ذبح کی۔ بہرحال قربانی کے لیے جو جانور خرید اجائے عمدہ ہونا چاہیئے۔

دیکھو اگر صاحب کلکٹر تم سے یہ فرمائش کریں کہ ہمارے لیئے دودھ پینے کے واسطے ایک عمدہ گائے لاؤ۔ تو عمدہ سے عمدہ تمام گاؤں سے بھی اور آس پاس بھی خوب دیکھ بھال کر گائے لو گے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک حاکم ضلع کی جو ظاہری اور مجازی حاکم ہے۔ اس کے حکم کا تو آپ کو اتنا اہتمام ہو اور احکم الحاکمین اور حاکم حقیقی نے جو تم سے جانور مانگا ہے پھر وہ بھی تمہارے ہی لیئے اور پھر دام بھی خود اُسی نے تم کو دیئے۔ اس میں تم کفایت پر نظر کرتے ہو بڑی ناشکری کی بات ہے۔ چاہیئے کہ عمدہ سے عمدہ جانور لو۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ تم سو روپے کی گائے خرید و جب کہ وہ تمہاری حیثیت سے زیادہ ہو۔ میرا مقصود یہ ہے کہ اپنی حیثیت واستطاعت کے موافق عمدہ جانور لو۔ اور بہتر ہے کہ کچھ حصہ نفل کے طور پر بھی کیا کرو۔

کانپور میں ہمارے مکرم خانصاحب عبدالرحمٰن خانصاحب کے یہاں ساٹھ ساٹھ

ستر ستر جانور ذبح ہوتے تھے۔ اور اپنے تمام بزرگوں و رشتہ داروں کے حصے وہ کرتے تھے۔ کہ یہ باپ کا ہے یہ دادا کا ہے اور جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی حالت یہ تھی کہ کبھی کبھی ان کے یہاں کھانے کا فاقہ بھی ہو جاتا تھا۔ محبت بھی عجیب شئے ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے جو لوگ قربانی کے اندر حیلہ کرتے۔ ہیں اگر اُن کو آج بیٹے کی شادی پیش آجاوے تو ابھی سینکڑوں روپیہ اُگل دیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انفاق مال جو اس کی حقیقت ہے اس کے اعتبار سے بھی قربانی کو فضیلت ہوگی۔

فضیلت نوعی

اب حقیقت نوعیہ یعنی اراقۃ دم للہ کے اعتبار سے لیجئے اراقۃ دم للہ کے معنی خدا کے نام پر جان کا قربان کرنا ہے۔

تعجب ہوگا کہ میں اس کو بنار فضیلت قرار دیتا ہوں اور مخالفین اس کو بنار اعتراض قرار دیتے ہوں اور اُن کا بنار اعتراض قرار دینا بھی دلیل اس کی حقانیت کی ہے اسلئے کہ بے وقوف جس بات پر اعتراض کریں وہ عین حق ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو بیوقوف نہیں بلکہ فلاسفر اور مہذب قوم اور لیڈر سمجھے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس سے زیادہ بے وقوفی نہیں کہ اپنے مالک کو بندہ بھول جاوے جس کو اتنی فکر نہ ہو کہ میرا مالک کس بات سے خوش ہوگا۔ اور کون سی بات سے ناخوش وہ خواہ عقل میں ارسطا طالیس ہو وہ بے وقوف ہی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ کسی امر میں اس کو تجربہ ہو جاوے کہ اس کو عقل نہ کہیں گے۔ مثلاً کپڑا بننا آگیا۔ یا یہ کہ زخموں کے کاٹ تراش میں کمال پیدا کر لیا۔ اس سے عاقل نہیں ہو سکتا عقل اور شئے ہے تجربہ دوسری شئے۔ صنعتوں کے اندر کمال پیدا کر لینے والے کو تجربہ کار کہیں گے مگر عاقل ہونا اس کا ضروری نہیں۔ خدا تعالےٰ سے جو شخص جس قدر دور ہے اسی قدر اس کی عقل بھی منسوخ ہے۔ پس ایسا شخص جس شئے کو زیادہ بُرا سمجھے گا وہی شئے زیادہ اچھی ہوگی۔ آجکل بڑا عاقل وہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑا لسّان ہو اور ہر دعوے پر بزعم خود دلیل عقلی رکھتا ہو۔ گو وہ دلیل واقع میں محض لچر اور غیر مقبول

ہو اس عقل اور بے عقلی پر مجھ کو دو حکایتیں یاد آئیں۔ میرے ماموں زاد بھائی ایک فٹن پر سوار جاتے تھے۔ میرٹھ کا قصہ ہے پاگل خانہ کے سامنے سے گذر ہوا، دیکھا دو پاگل اچھل کود رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دیکھو یہ بھی عجیب بے وقوف ہیں کہ ایسی سواری میں بیٹھے اگر گھوڑے فٹن کو خندق کی طرف لے کر چلدیں تو ابھی یہ گر پڑیں۔ دیکھو ان پاگلوں نے بات معقول کہی اسلئے کہ احتمال عقلی تو خندق کی طرف جانے کا ہی ہے گو اس کا وقوع شاذ و نادر ہو لیکن اس دلیل مردود سے اُن پاگلوں کو کوئی عقل مند نہیں کہے گا۔

ایک اور شخص تھا وہ جنون میں پاخانہ کھایا کرتا تھا۔ اگر کوئی اُس سے کچھ کہتا تو جواب دیتا تھا کہ اسمیں کیا بُرائی ہے یہ میرے ہی اندر سے تو نکلا ہے اگر پھر میرے ہی اندر چلا جائے تو کیا حرج ہے تو دیکھو عقلی ہی دلیل یہ بھی تو ہے مگر مردود ایک اور شخص تھا وہ جنون میں اپنی ماں سے برا کام کرتا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ میں جب کہ سب کا سب اس میں تھا تو اگر میرا جزاس کے اندر چلا جائے تو کیا حرج ہے۔ پس ایسے ہی دلائل آجکل عقل پرستوں اور تہذیبین کے ہیں میں بقسم کہتا ہوں کہ اہلِ باطل کے پاس کسی مدعا پر کوئی دلیل صحیح نہیں ہے اہلِ باطل کبھی عاقل ہو ہی نہیں سکتے۔ میں اکثر یہی کہا کرتا ہوں کہ وہ جس بات کو ناپسند کریں گے وہ پسندیدہ ہوگی اور جس کو پسند کریں گے وہ ناپسند ہوگی۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کا مسجود ملائکہ ہونا جیسے ان کے کمال کی دلیل ہے اسی طرح شیطان کا ان کو سجدہ نہ کرنا بھی دلیل ان کے کمال کی ہے۔ اسلئے اگر شیطان سجدہ کر لیتا اور تھا یہ اصل میں خبیث تو بقاعدہ الجنس یمیل الی الجنس۔ اسکی شبہ ہوتا کہ خدانخواستہ آدم علیہ السلام میں کوئی نقص ہے اس پر مجھ کو ایک اور نکتہ یاد آیا وہ یہ ہے کہ ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کی طرف اہلِ دنیا مائل ہوں تو اس کے اندر ہی دنیا کا شائبہ ہے۔ ورنہ دُنیادار اس کی طرف نہ جھکتے۔ سچے درویشوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے

کہ ان کی طرف غرباء کا میلان ہوتا ہے۔ جلاہوں کا مومنوں کا طلبہ کا اور یہی کیفیت انبیاء کی ہوئی ہے کہ ان کی طرف غرباء ہی اول جھکتے ہیں پس سچے ورثۃ الانبیاء کی بھی یہی کیفیت ہونا چاہیئے۔

الجنس یمیل الی الجنس پر ایک اور حکایت یاد آئی۔ جالینوس چلا جاتا تھا راستہ میں ایک مجنون اس سے دوڑ کر ملا اور بڑی محبت اور ملاطفت سے باتیں کیں اگر کوئی نادان ہوتا تو بہت خوش ہوتا اور اس کو اپنی کرامت سمجھتا لیکن چونکہ جالینوس دانا تھا۔ فوراً واپس آیا۔ اور شاگردوں سے کہا کہ وہ معجون لاؤ جو جنون کو مفید ہے شاگردوں نے عرض کیا کہ خیر و عافیت تو ہے کیسا مزاج ہے کہا کہ آج مجھ سے ایک مجنون بڑی ملاطفت سے پیش آیا اور قاعدہ عقلی ہے کہ الجنس یمیل الی الجنس معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر بھی کچھ جنون کا مادہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک طاؤس اور کوا ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا بات ہے دو ناجنس آپس میں چلے جا رہے ہیں ایک فلسفی نے کہا کہ ان میں ضرور کچھ مناسبت ہے دیکھا تو واقعی مناسبت ہے کہ دونوں لنگڑے تھے پس اہل باطل کو جس شے کی طرف بالکل رغبت نہ ہو وہ شے سب سے بڑھ کر اچھی ہوگی۔ پس اس بنا پر کچھ ضرورت تو نہیں رہی کہ ان کے اعتراض کو یہاں نقل کیا جاوے کیونکہ ان کا اعتراض کرنا بھی کافی دلیل ہوگی۔ اس اراقۃ کے استحسان کی۔ لیکن تاہم شاید کسی کو اب بھی شبہ رہے۔ خصوصاً بعض عوام کو شاید یہ جواب کلی کافی نہ ہو اس لیے تبرعاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اعتراض نقل کر کے جواب خاص دیا جاوے۔

قربانی پر بے رحمی کا شبہ

تو جاننا چاہیئے کہ حاصل ان کے شبہ کا یہ ہے کہ قربانی کرنا بے رحمی ہے کہ خواہ مخواہ بلاقصور جانوروں کا خون کرنا سخت بے رحمی و بے انصافی و سنگدلی ہے اور نیز صرف اپنی خواہش نفسانی پورا کرنے کے لیے کسی جان کو ضائع کر دینا بعید از عقل و

وہمت ہے ۔ بظاہر تو یہ اعتراض بہت قوی ہے ۔ لیکن نظرِ غور سے معلوم ہوگا کہ بالکل لچر ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بے رحم اور اس فعل کو بے رحمی کہنا ہی غلط ہے ۔ مطلق رحم سے تو کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا ہے اسلئے کہ یہ مادہ تو حق تعالےٰ نے ہر ایک کے اندر رکھا ہے باقی جس کو یہ سنگدلی کہتے ہیں وہ واقعی میں شجاعت ہے اور جس کا نام انہوں نے رحم رکھا ہے وہ ضعفِ قلب ہے قوی القلب قاسی القلب نہیں ہوتا ۔ اور نہ ضعیف القلب کا رحم ہونا ضروری ہے اور مسلمانوں سے زیادہ تو رحمدلی کسی کے اندر ہی نہیں ان کو تو تعلیم ہی رحم کی گئی ہے اُن کے رحم کی یہ کیفیت ہے کہ کسی شخص پر غصہ ہو اور اس نے بہت ستایا ہو بہت ایذا پہنچائی ہو ۔ لیکن وہ کہے کہ بھائی مجھے معاف کر دو تو یہ حکم ہے کہ معاف کر دو اور بالکل اس سے کینہ نہ رکھو اور لیجئے دشمنوں پر ان کو رحم کرنے کا حکم ہے ۔ چنانچہ لڑائی میں حکم ہے کہ بوڑھوں کو عورتوں کو بچوں کو اور درویشوں گوشہ نشین کو مت مارو اور ناک کان مت کاٹو ۔ جب کہ یہ اپنے دشمنوں پر رحم کرنے والے ہیں تو جانوروں پر کیوں نہ رحم کریں گے یہ بے انتہا رحمدل ہیں لیکن رحم ان کا عقل کے ساتھ ہے بے عقلی کے ساتھ نہیں رحم کی بھی دو قسمیں ہیں ایک بے عقلی کے ساتھ جیسے ماں کا رحم کہ بچہ مچل رہا ہے کہ میں مکتب میں نہ جاؤں گا ۔ اور مکتب میں جانے سے اس کو وحشت ہوتی ہے روتا ہے اور ماں اس کی حمایت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اچھا ہے نہ جاوے اس کا جی برا ہوگا ۔ اور ایک رحم عقل کے ساتھ ہوتا ہے ۔ جیسے باپ کا رحم ہے کہ اس نے بچہ کی یہ ضد دیکھی تو دو تین چپت مارے اور پکڑ کر مکتب میں پہنچا دیا تو بظاہر تو یہ بے رحمی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ماں کا اس کی موافقت کرنا یہ اس کے حق میں ظلم ہے کہ انجام اس کا جہل ہے جس کو ذلت و خواری لازم ہے اور باپ کا مارنا عین رحم ہے کہ انجام اس کا اس کے لئے بہتر ہے ۔ ماں کے رحم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بڑھیا کے گھر شاہی باز چلا آیا اس نے دیکھا کہ اس کی چونچ بہت

بڑھی ہے۔ بہت کُڑھتی کہ لائے ہے یہ دانہ کس طرح چُنتا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیری ماں مرگئی ہے کسی نے تراشی نہیں۔ اسی واسطے چونچ تیری بہت بڑھ گئی ہے۔ قینچی لے کر اس کی چونچ کُتر دی۔ پھر دیکھا کہ ناخن بہت بڑے ہیں ناخن کچھ تراش دیئے۔ غرض اس کو جس کام کا وہ تھا۔ اس سے بالکل نکما کر دیا سچ ہے ؎

دوستی بے خرد پُر دشمنی است ﴿بے وقوفوں کی دوستی دشمنی سے بھری ہوئی ہے﴾

ایک سرحدی کی حکایت مشہور ہے کہ ہندوستان میں آئے تھے کہیں کسی سے لڑائی ہوگئی۔ اس میں زخم وغیرہ بہت لگے تھے۔ ایک شخص کو رحم آگیا۔ اس نے مرہم پٹی کی۔ تندرست ہوگئے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم کبھی ہمارے یہاں آئے گا۔ تو ہم تم کو اس کا عوض دے گا۔ اتفاقاً اس کا جانا ادھر ہوگیا وہ سرحدی دوست بھی یاد آگئے اُن کے پاس گیا بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہم تم کو تمہاری خدمت کا عوض دے گا۔ جب وہ سرحدی صاحب نظروں سے ذرا غائب ہوئے تو ان کی بیوی نے کہا کہ جلدی چلا جا۔ ورنہ یہ تم کو زخمی کرے گا اور زخمی کر کے تمہارا معالجہ کرے گا جس طرح تم نے ان کا کیا تھا۔ وہ شخص بے چارا اپنی جان بچا کر بھاگا ایسی ہی رحمدلی اہل باطل میں ہے کہ وہ جانوروں کے ذبح نہ کرنے کو رحم سمجھتے ہیں۔

ہمارے مدرسہ کے پاس بعض اہل باطل زندہ چوہے چھوڑ جاتے ہیں یہ رحم چوہوں پر تو کیا اور اپنی بنی نوع کو نقصان پہنچایا۔ اسی طرح سانپ کو زندہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سانپ پر تو رحم ہو لیکن اپنی بنی نوع پر ظلم ہوا۔ یہ کیا رحم ہے یہ تو اچھا خاصہ ظلم اور سنگدلی ہے۔

اہل اللہ کا تراحم:۔ سچا مسلمانوں ہی میں ہے کہ ان کو اپنے ہم جنسوں پر بھی رحم ہے اور جانوروں پر بھی رحم ہے اُن کو اس کی تعلیم بھی ہے اور ان کا اس پر

عمل بھی ہے جو واقعات روزمرہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قدرت کے وقت مخالف سے درگزر کرنا ذرا سماجت پر ان کا نرم ہو جانا یہ روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات ان بیچاروں کو اس سے دنیوی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور یہ رحم تو عام طور سے سب مسلمانوں میں ہے اور اہل اللہ کے تراحم کا تو کچھ حساب ہی نہیں۔

حضرت شبلیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے سفر میں کہیں شکر خریدی اور کپڑے میں مضبوط باندھ لی۔ گھر آکر جو اس کو کھولا دیکھا تو اس میں ایک چیونٹی ہے سوچے کہ یہ چیونٹی راستہ میں تو کہیں چڑھی نہیں کیونکہ بندش کپڑے کی مضبوط ہے ضروری بات ہے کہ شکر والے کی دوکان سے آئی ہے اور یہ کسی کا جوڑا ہو گا۔ اس کا ساتھی ضرور پریشان ہو گا۔ اس کو لیکر وہاں کئی منزل پر گئے اور اُس کو اسی دوکان پر چھوڑ آئے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ حق تعالےٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ تم نے ایک روز ایک بلی کا بچہ دیکھا تھا کہ جاڑے میں سکڑا پڑا ہے تم نے اس کو گرم کپڑے میں لپیٹ دیا ہم تم کو اس وجہ سے بخشتے ہیں کہ تم نے ہماری مخلوق پر رحم کیا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں ان کی حکایت ایک بزرگ سے سُنی ہے کہ شاہ صاحب چلے جاتے تھے جاڑے کے دن تھے۔ دیکھا کہ ایک نالی کے اندر ایک کتے کا بچہ پھنس رہا ہے اور جاڑے میں ٹھٹھر رہا ہے خادم سے فرمایا کہ اس کو نکال لو۔ خادم تھے ذرا نفیس اور نازک مزاج اُن کو اس کے نکالنے میں ذرا تامل ہوا۔ جن بزرگوں کے اخلاق بہت بڑے ہوتے ہیں اُن کے خادم بھی ایسے ہی ہوتے ہیں وہ خادم خادم نہیں رہتے بلکہ مخدوم ہو جاتے ہیں وہ بزرگ خود ان کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ بزرگوں کو اس قدر نرم اور خلیق بھی نہ ہونا چاہیئے کبھی کبھی ذرا پھٹکارنا

بھی چاہئیے۔ ایک مثل ہے کہ ایک سانپ کسی بزرگ کا مرید ہوگیا تھا۔ اس بزرگ نے ستانے کاٹنے وغیرہ سب باتوں سے توبہ کرائی چنانچہ اُس نے کاٹنا چھوڑ دیا اور ایک جگہ معتکف ہوگیا جب جانوروں نے دیکھا کہ یہ تو کسی کو کچھ نہیں کہتا اب اس کو ستانے لگے۔ کوئی پکڑ کر گھسیٹتا ہے کوئی نوچتا ہے۔ غرض بے چارہ کی بہت بُری گت بنائی ایک روز پیر صاحب کا اس طرف کو گذر ہوا۔ دیکھا بیچارہ نیچا ہوا گھسٹا ہوا پڑا ہے پوچھا کیا حال ہے کہا حضرت جی آپ نے جب سے کاٹنے سے توبہ کرائی ہے میں نے کاٹنا چھوڑ دیا تھا۔ جانوروں نے میرا یہ حال بنا دیا ہے۔ ان بزرگ نے کہا۔ میں نے تو تجھ کو کاٹنے سے منع کیا ہے۔ پھنکارنے سے تو ممانعت نہیں کی کاٹو مت پھنکار دیا کرو۔ ایسے ہی بزرگوں کو کہتا ہوں کہ کسی کو ستاویں نہیں لیکن پھنکار دیا کریں۔

غرض خادم صاحب کو جب دیکھا کہ نہ نکالیں گے شاہ صاحب نے خود آستینیں چڑھا کر اس کو نکال لیا جاڑے کی وجہ سے وہ بالکل بے حس وحرکت تھا حمام قریب تھا حمامی کو کچھ پیسے دے کر اس کو حمام کرایا وہ ذرا حرکت کرنے لگا۔ محلہ داروں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ اس کی نگرانی کرو۔ اور دو وقت روٹی پانی سے اس کی خبرگیری کرتے رہو تو ہم اس کو یہاں چھوڑتے ہیں ورنہ ہم ساتھ لے جاتے ہیں۔ محلہ داروں نے ذمہ لیا۔ حکایت تو یہ لمبی ہے مگر میرا مقصود اس میں سے صرف اسی قدر تھا۔ تاکہ یہ دکھلاؤں۔ کہ اہل اللہ کے اندر اس درجہ کا رحم ہوتا ہے لیکن چونکہ بقیہ حکایت سے بھی ایک بہت بڑا نفع ہے اسلئے اس کو پورا کئے دیتا ہوں۔ اس قصہ کے بعد شاہ صاحب ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی بٹیا یعنی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے جس کے دونوں طرف کیچڑ بھری تھی۔ سامنے سے ایک کتا آگیا شاہ صاحب تو منتظر تھے کہ کتا اُترے تو میں آگے چلوں اور کتا اس کا منتظر کہ شاہ صاحب اتریں جب کھڑے ہوئے دیر ہوگئی تو شاہ صاحب نے اُس کی اصطلاح میں فرمایا کہ اترو اُس نے کہا وجہ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں مکلف ہوں اگر میں اترا تو

میرے کپڑے اور بدن ناپاک ہو جائیں گے تو نماز نہ پڑھ سکوں گا۔ اور تو مکلف نہیں تو اگر آلودہ ہو جائے گا تو پھر سوکھ کر ایسا ہی ہو جائے گا۔ کتے نے کہا کہ یہ تو حیلہ شرعی ہے یاد رکھو کہ اگر میں اترا تو تمہارے اندر عجب پیدا ہوگا۔ اور وہ ایسی نجاست ہے کہ ہفت قلزم سے صاف نہ ہوگی۔ شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہوئی اور فوراً اتر پڑے اور کتا نکل کر چلا گیا۔ اسی وقت ندا آئی اور الہام ہوا کہ اے عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ ہم نے تم کو اس کتے سے جو ایک علمی فائدہ پہنچایا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ یاد کرو تم نے فلاں دن اس کے بنی نوع کے ساتھ احسان کیا تھا ہم نے نہ چاہا کہ اس پر تمہارا احسان رہے ہم نے اس کے بھائی سے تم کو یہ فائدہ پہنچا دیا۔ اس وقت شاہ صاحب پر پھر ایک حالت طاری ہوئی۔ یہ باتیں ہوتی ہیں اللہ والوں سے۔

اس حکایت کی تقریب سے ایک اور حکایت یاد آئی۔ حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ یہ بہت بڑے شخص ہیں۔ سادات میں سے ہیں اور اس رتبہ کے ہیں کہ جس وقت یہ مدینہ طیبہ پہنچے تو روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر عرض کیا کہ **السلام علیک یا جدی** وہاں سے جواب آیا **وعلیک السلام یا ولدی**۔ چونکہ امید اور عادت کے خلاف یہ جواب سنا تو حضرت سید صاحب پر ایک حالت طاری ہوگئی اور اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ہے ؎

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلہا ÷ تقبل الارض عنی وھی نائبتی

وھذہ نوبۃ الاشباح قد حضرت ÷ فامدد یمینک کی تحظی بہا شفتی

ترجمہ ان اشعار کا یہ ہے کہ (آپ سے دوری کی حالت میں اپنی روح کو بھیجتا تھا کہ وہ میری طرف سے میرے نائب ہو کر زمین بوسی کرتی تھی۔ اور اب یہ نوبت ظاہری جسد کے حاضری کی آئی۔ تو آپ اپنا دست مبارک دراز کیجئے تاکہ میرے لب اس سے متمتع ہوں)

حضرت سید صاحب نے جو ان اشعار کا تکرار جوش و خروش کے ساتھ کیا تو

عجیب قدرت حق تعالے کی ظاہر ہوئی - چنانچہ راوی حکایت لکھتے ہیں خرجت ید ہ الکریمہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی آپؐ کا دست کریمہ نکلا - اور حالت یہ ہوئی کہ اس کے نکلنے سے آفتاب ماند پڑ گیا - اور تمام مسجد منور ہو گئی اس وقت نوّے ہزار آدمی وہاں موجود تھے - سیّد صاحب کی برکت سے سب کو زیارت ہوئی اور سیّد صاحب نے دوڑ کر دست شریف کو بوسہ دیا - اس کے بعد سید صاحب کو خیال ہوا کہ چونکہ مجھ سے ایک عجیب واقعہ ظاہر ہوا ہے کہ ایسا واقعہ کسی سے ظاہر نہیں ہوا - ممکن ہے کہ اس سے میرے نفس میں عجب پیدا ہو جائے مسجد نبوی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر آ کر لیٹ رہے اور سب کو کہا کہ سب میرے اوپر کو پھاند کر جاویں - اس درجہ کے تو یہ شخص تھے - انہوں نے ایک مرتبہ ایک کتے کو دیکھا کہ خارش ہو رہی ہے اور پیپ اور خون میں آلودہ ہے - ایک دوا بنائی اور دونوں وقت اپنے ہاتھ سے لیپ کرتے تھے - غرض یہ حالت ہے اہل اسلام کے ترحم کی پھر باوجود اس رحم کے ان سب بزرگوں نے بھی فاذبحوا البقرہ پر عمل کیا -

محبّت کا امتحان

پس جس شخص کے اندر اس درجہ رحم ہو اور پھر وہ اس پر عمل کرے اس سے صاف معلوم ہوا کہ بے رحمی اس کی بنا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک اور باریک بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ حکم امتحان رحم کا ہے - حق تعالے دیکھتے ہیں کہ ہماری محبت زیادہ ہے یا مخلوق کی دیکھیں ہمارا حکم مانتے ہیں یا اپنی اقتضائے طبعی و تراحم فطری پر عمل کرتے ہیں - ایاز کی سی مثال ہے کہ لوگوں نے سلطان محمود سے پوچھا تھا کہ آپ ایاز کو زیادہ کیوں چاہتے ہیں کہ اس کے اندر کیا بات ہے -

سلطان نے کہا کہ کسی وقت دکھلا دیں گے - کہ اس کے اندر کون بات زائد ہے ایک روز خزانہ میں سے ایک بڑا قیمتی موتی نکلوایا اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس کو توڑ ڈالو - وزیر اعظم نے سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے بادشاہ کو آج کچھ خلل دماغ ہے عرض کیا کہ

حضور پھر ایسا اور نایاب میسر نہ ہوگا اس حکم پر پھر نظر ثانی کر لیجئے اس کے بعد دوسرے وزیر کو حکم دیا اور وزیر ثانی نے سوچا کہ جب وزیر اعظم نے باوجود مجھ سے زیادہ سمجھدار ہونے کے نہیں توڑا تو میں کیوں توڑوں اس نے بھی عذر کیا۔ غرض سب نے انکار کر دیا تو ایاز کو حکم دیا۔ ایاز نے کہا بہت اچھا فوراً دو پتھر لا کر ایک کے اوپر موتی رکھا اور دوسرے کو اس پر سے مارا وہ چکنا چور ہو گیا۔ وزیر اعظم نے ملامت کی کہ ایسا موتی توڑ ڈالا ایاز نے کہا کہ تم پاگل ہو تم نے بادشاہی حکم توڑا اور میں نے موتی توڑا اور یہ کہا ہے

نقض امر از کسر در دشوار تر ؛ لاجرم بستم بامراد کمر۔

(موتی کے توڑنے سے حاکم کا حکم توڑنا زیادہ بُرا ہے اسی لیئے میں نے اس کے احکام بجالانے کی کمر باندھ رکھی ہے)

پس مسلمانوں کی مثال ایاز کی سی ہے کہ باوجود اس کے کہ گائے بکری سے بیحد محبت چنانچہ جس وقت یہ ذبح کرتے ہیں اُن پر بے حد اثر ہوتا ہے جس کو مخالف معترض کیا جانیں لیکن محبوب حقیقی کے حکم کے سامنے اپنے اس جوش محبت کو روک لیا اور حکم شاہی کو نہیں توڑا۔ حکم ہوا کہ ان کا گلا کاٹ ڈالو بلا چون وچرا تسلیم کر لیا کہ بہت بہتر اور دل اندر سے گھلا جاتا ہے اور پگھلا جاتا ہے لیکن حکم کو خوشی خوشی بجالاتے ہیں۔

ہمارے استاد حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدظلہم نے ایک گائے کا بچہ قربانی کے لیے پالا تھا۔ اس کی بڑی خدمت کی جاتی تھی۔ اور خود اس کو جنگل میں لے جا کر اس کے ساتھ دوڑتے تھے۔ غرض اس سے بہت ہی محبت تھی اور تازہ اس قدر ہوئی تھی کہ قصائی اس کے ۶۰ روپے دیتے تھے۔ جس روز اس کو ذبح کیا ہے تو میں نے سنا تھا کہ مولانا کے آنسو جاری تھے۔ اور گھر بھر کو رنج ہوا۔ دیکھو اگر مسلمانوں کے اندر رحم اور محبت نہیں تو یہ رونا اور آنسو بہانا کیوں تھا لیکن کیا بات ہے اس سے زیادہ محبت حق تعالٰے کے ساتھ ہے اسلیئے اس کے حکم کے سامنے سب مقتضیات طبعیہ ہیچ ہو جاتے ہیں۔

قربانی اولاد و نفس

جانور تو جانور اس کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں۔ حق تعالے کی محبت میں مسلمان اپنی اولاد کی جان کو قربان کر دیتا ہے

ایک بڑھیا کے دو بیٹے تھے۔ لڑائی میں دونوں کو بھیجدیا اور خوش تھی کہ اللہ کی راہ میں جان دیں گے۔ ایک ان میں سے بچ کر آگیا تو یہ کہا کہ میں تو خوش تھی کہ یہ بھی کام آجاتا۔ جب مسلمان اپنی اولاد کے قربان کرنے پر آمادہ ہیں تو کیا اولاد پر بھی رحم نہیں رحم تو سب سے زیادہ ہے لیکن حق تعالے کے مقابلہ میں وہ کسی کو نہیں سمجھتے اپنی جان تک کی پرواہ کرتے ہی نہیں بڑی خوشی سے جان دیتے ہیں بہت سے مسلمانوں کو خاص کر طاعون میں دیکھا ہے بہت خوشی خوشی دنیا سے رخصت ہوئے۔

بخلاف کافر کے دیکھا تو نہیں پر سنا ہے کہ کافر کو موت کے وقت بڑی وحشت ہوتی ہے اور مسلمان ہنسی خوشی جاتے ہیں اور کیوں نہ جائیں جب کہ ان کو اپنے مولا سے اس قدر محبت ہے تو اپنے محبوب سے تو ہر شخص ملنا چاہتا ہے حدیث شریف میں ہے من احب لقاء الله احب الله لقاءه یعنی جو شخص اللہ تعالے کے ملنے کو چاہتا ہے اللہ تعالے اس سے ملنا چاہے گا موت واللہ بڑی بھاری نعمت ہے اور جو کچھ گھبراہٹ طبعی اور وحشت موت سے ہوتی ہے اور عین وقت پر کچھ نہیں چنانچہ حدیث میں بھی ہے جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث مذکور سنائی تو حضرت عائشہ رضہ نے عرض کیا یارسول اللہ کلنا یکرہ الموت۔ (یعنی یارسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) ہم میں ہر ایک موت کو ناپسند کرتا ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ اے عائشہ رضہ یہ اس وقت نہیں موت کے وقت ہے یعنی اس وقت خوش ہوجاتا ہے۔

اس وقت تسلی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ان الذین قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل علیهم الملائکة الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنة التی کنتم توعدون نحن اولیاؤکم فی الحیوة الدنیا وفی الاخرة ولکم فیها ما تشتهی انفسکم ولکم فیها ما تدعون نزلا

نَحْنُ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمُ۔ یعنی بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر مستقیم رہے ان پر موت کے وقت فرشتے اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ڈرو مت اور نہ غمگین ہو اور خوشخبری پاؤ اس جنت کی جس کے تم سے وعدے کئے گئے ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں اور آخرت میں اور تمہارے لیئے وہ ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم مانگو۔ دیکھئے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صرف ایمان پر بشارت دی ہے۔ عمل صالح کی قید بھی نہیں لگائی حضرت مسلمان اگر گنہگار بھی ہو تب بھی مرنے کے وقت اس کو خوشی ہوتی ہے دیکھئے اگر کسی سے محبت ہو تو گویا اس کا یقین ہو کہ محبوب مجھ کو مارے پیٹے گا۔ لیکن جانتا ہے کہ بلا سے پٹوں۔ لیکن اُن کو دیکھنا تو نصیب ہوگا اور یوں کہتا ہے

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ٭ راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم

(وہ دن کتنا اچھا ہوگا کہ میں اس ویران منزل چلا جاؤں گا۔ راحت جاں طلب کروں گا اور اپنے محبوب کے پیچھے چلوں گا۔)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ٭ تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(دل سے نذر مانی تھی کہ اگر یہ غم کسی دن ختم ہو جائے تو میکدے کے دروازے تک شاداں اور غزل خواں جاؤں گا)

کوئی شخص اگر کہے کہ یہ شعر تو اطمینان کے وقت گھڑے ہوئے ہیں مرنے کے وقت نانی یاد آئی ہوگی۔ سو سنیئے کہ عین نزع کے وقت ایک بزرگ کہتے تھے

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم ٭ جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آگیا ہے کہ میں عریاں ہو جاؤں یعنی جسم کے لباس کو چھوڑ دوں فقط روح رہ جائے)

تو کیا اپنی جان سے ان کو محبت نہیں لیکن اس محبوب حقیقی سے ایسی محبت ہے کہ اس کے سامنے سب محبتیں گرد ہیں۔ ایسی ہی جانور سے بھی محبت ہے اور اندر سے دل دُکھتا ہے لیکن عقل اور دین کا تقاضا ایسا ہوتا ہے کہ اس پر وہ غالب آجاتا ہے

زبانِ حال سے کہتا ہے ؎

ہر کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست ⁂ نائب است او دست او دست خداست

(جو جان دیتا ہے اگر وہی مار ڈالے تو جائز ہے۔ کیونکہ وہ نائب خدا ہے اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے)

دیکھو اگر نوکر سے ہم کسی بات کا امر کریں اور وہ اپنی عقل کو دخل دے اور چون وچرا کرے تو کس قدر ناگوار ہوتا ہے اور اس کو نافرمان اور عاصی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ نوکر کا تعلق بہت ہی ضعیف ہے جب اس ضعیف تعلق پر یہ کیفیت ہے تو خدا تعالیٰ سے تو بندہ کا تعلق بہت بڑا ہے۔ اُس نے جب حکم دیا تو اس کے حکم کے سامنے تو یہ حالت ہونا چاہیئے ؎

ہمچو اسماعیل پیشش سر بنہ ⁂ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(اسمٰعیلؑ کی طرح اُس کے سامنے سر رکھدے اور اس کی تلوار کے سامنے ہنستے ہوتے جان دیدے)

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ⁂ آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(تیری کمزور زندگی کو لیکر تجھے سینکڑوں نئی زندگی دیتا ہے بلکہ جو تیرے وہم بھی نہیں آتا۔ وہ انعام تجھے بخشتا ہے)

معترضین سے سوال پھر ان معترضین سے کوئی پوچھے کہ تم نے اس کا تو انسداد کیا کہ اللہ کے کہنے سے مسلمان نہ کاٹیں۔ مگر اس کا بھی کچھ انسداد کیا کہ اللہ میاں بھی جان نہ لیں کیا۔ نعوذ باللہ یہ اللہ میاں کی بے رحمی ہے، جو جواب اس کا ہے وہی جواب ہمارا ہے۔ پھر ان معترضین سے پوچھنا چاہیئے کہ کیوں صاحب مطلق تکلیف بے رحمی ہے یا خاص ذبح کرنا ہی بے رحمی ہے اگر خاص ذبح کرنا بے رحمی ہے تو وجہ تخصیص بتلایئے اور اگر مطلق تکلیف بے رحمی ہے تو ہلوں میں چلا کر جو ڈنڈوں سے انہیں پیٹتے ہو اور گاڑیوں میں جوت کر آر سے انہیں چھیدتے ہو یہ بے رحمی نہیں ہے اور پھر ہزاروں چیزیں چمڑے کی بنتی ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

میں اس قدر اتفاق تھا کہ شادی غمی کے موقع پر آپس میں لین دین تک ہوتا تھا اور ہر ایک ایک دوسرے کے کام آتا تھا۔ بظاہر کچھ بھی جھگڑا نہ تھا باقی مذہبی اختلاف کے ہوتے ہوئے جو اصلی اتفاق ہے وہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ظاہری اتفاق تو تھا اب وہ اتفاق ظاہری بھی نہیں رہا۔ اس کی کیا وجہ ہے اور کیا راز ہے سے

راز درون پردہ ز رندان مست پرس کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

(چھپے ہوئے رازوں کو تو رندوں سے پوچھ کیونکہ صوفی عالمقام اس حال سے بے خبر ہے)

تاریخ کا جادو

واللہ اس کا راز بس یہی ہے کہ تاریخ پڑھی جاتی ہے۔ تاریخ وہ بلا کا جادو ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم باہم ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ ایک بار کفار نے دیکھ کر حسد کیا اور چاہا کہ ان میں لڑائی کرا دیں۔ دو قبیلے تھے انصار میں اوس اور خزرج ان میں باہم زمانہ جاہلیت میں چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ چنانچہ یہودنے وہ اشعار پڑھ دیئے جو آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں پچھلے زمانہ میں کہتے تھے۔ بس اشعار کا پڑھنا تھا کہ مادۂ مدفونہ کو جوش آیا۔ اور آپس میں وہ دو چار باتیں تیز تیز ہو کر تلواریں نکل آئیں اور دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ نے سب کو ٹھنڈا کیا۔ تاریخ وہ جادو ہے کہ ذراسی دیر میں کچھ سے کچھ کر ڈالے اور جب سے عنایت فرما آپ کے پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے اور بھی زیادہ انہوں نے نار عداوت مشتعل کر دی ہے۔

گائے کی قربانی کا ترک

یہ تو اس رائے کے متعلق تاریخی کلام تھا۔ اور ایک مذہبی کلام ہے وہ یہ کہ آیا شرعاً گائے کی قربانی روکنا جائز بھی ہے یا نہیں۔ بعضے بھولے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ مطلق قربانی واجب ہے خواہ بکری کی ہو یا گائے کی پھر کیا ضرورت ہے آپس میں جھگڑا کا بس گائے کی قربانی چھوڑ دیں بکری کی کر لیا کریں۔ بظاہر تو یہ رائے بہت

مناسب ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بالکل لچر اور پوچ بات ہے۔
تفصیل اس کی یہ ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ گائے کی قربانی ترک کرنا دوسری قوم کے نزدیک مذہبی امر پر مبنی ہے یا مصلحت ملکی پر تو واقع میں ان کے یہاں یہ جزو مذہب ہے پس اس وقت ہمارا ترک کرنا کفر کی رعایت کرنا ہے اسلئے ہرگز جائز نہیں ہے بعضے لوگ گاؤکشی کے متعلق اخباروں میں اپنی رائے لکھ کر ہم سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم بھی اخباروں میں اس کے متعلق اپنی رائے لکھیں مگر ہمارے نزدیک اخباروں میں آجکل ایسا مضمون لکھنا حکام کو اپنی طرف سے بدگمان کرنا ہے کیونکہ نامہ نگاروں کو حکام عموماً مفسد سمجھتے ہیں اسلئے ہم کسی کو بدگمان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے اصول میں سے ہے اتقوا مواضع التہم کہ تہمتوں کے مواقع سے بچو یہ کہ اخبار میں مضمون لکھ کر اس مضمون کو مبتذل کر دینا ہے اس مضمون کی تمام مسلمانوں اور دینداروں کی نظروں میں کچھ وقعت نہیں ہوتی اسلئے ہم کو اخبار میں مضمون لکھنا پسند نہیں اور یہ بھی پسند نہیں کہ ہندوؤں کو چڑا چڑا کر گاؤکشی کریں۔ کہ اس میں دل آزاری اور بلا ضرورت فتنہ ہے جیسے پہلے سے کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو۔ اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جانور کا ذبح کرنا عین عقل کے موافق ہے بلکہ علامت ہے کمال ایمان اور حق تعالے کے ساتھ محبت کی اور اس بیان سے اس کی حقیقت نوعیہ کے اعتبار سے بھی فضیلت سمجھ میں آگئی ہوگی۔

فضیلت زمانی

دوسری فضیلت ہوتی ہے زمانہ کی فضیلت کی وجہ سے سو جس زمانہ میں یہ قربانی مشروع ہے اس کی بھی بہت بڑی فضیلت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان ایام میں اس عمل سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے اور آیا ہے کہ ماہ ذی الحجہ میں یکم سے لے کر ۹ ذی الحجہ تک اگر کوئی روزے رکھے تو ایک ایک روزہ کے بدلے ایک ایک سال کے روزوں کا ثواب ملتا ہے اور عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے دو برس کے گناہ معاف ہوں گے۔ نیز ان ایام میں حج اور مناسک حج بھی مقرر ہے پس ان ایام میں یہ عمل افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے۔

فضیلت مکانی تیسری وجہ فضیلت کی مکان کا شرف ہے اس کو میں بے تکلف ثابت نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک حدیث سے اس کا استنباط ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس وقت حجاج لبیک کہتے ہیں تو تمام شجر اور حجر اور مدر سب لبیک کہتے ہیں اور اُن سے سن کر ان کے متصل کے شجر اور حجر کہتے ہیں حتٰے ینتھی الارض من ھھنا و ھھنا الخ ثابت ہوا کہ اس زمانہ میں تمام امکنہ حکماً ملحق ہو جاتے ہیں حرم کے ساتھ اور نیز یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسجد میں نماز ہوتی ہو اور صفوف باہر تک آجاویں تو بیرونی جگہ بھی بعض احکام میں مسجد ہی کے ساتھ ملحق ہو جائے گی اسی طرح گویا تمام مواقع قربانی کے بھی برکت میں بحکم حرم ہو جاتے ہیں پس اسی طرح سے مکانی فضیلت بھی سب قربانی والوں کو میسر ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی بُعد نہیں ہے اللہ کا نام تو وہ شے ہے کہ دنیا بھر میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا ہو تو اس کی برکت تمام زمین کو بھر دیتی ہے پس اس معنی کر ہمارا تھانہ بھون اور جلال آباد بھی حرم محترم کے ساتھ ملحق ہو رہا ہے پس اس طرح سے مکان کا شرف بھی قربانی میں حاصل ہے گو بواسطہ ہی سہی لیکن برکت سے خالی نہیں ہے

مرا از زلف تو موئے پسند است ؛ ہوس را رہ مدہ بوئے پسند است

(تیری زلف میں سے صرف ایک بال ہی مجھے پسند ہے اور اگر ہوس کو چھوڑ دوں تو صرف خوشبو ہی پسند ہے)

خیر منا نہیں تو ہنا تو ہے قافیہ بھی مل گیا پس مکان کا شرف بھی بحمد اللہ ثابت ہو گیا

فضیلت باعتبار ربانی اب رہ گیا بانی و بادی کا شرف سو اس کی نسبت یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے قالوا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ قال سنۃ ابیکم ابراھیم۔ یعنی صحابہؓ نے کہا یا رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم قربانیاں کیا ہیں فرمایا تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے سنۃ ابیکم ابراھیم میں ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کو ابراہیم علیہ السلام کی سنت فرمایا۔ حالانکہ ان کا فعل ذبح ولد ہے اور ہمارا فعل ذبح البقرہ

ہے جب تغائر ہوا تو پھر اضاحی کو سنت ابراہیم کہنا کیسے صحیح ہوا؟
اور اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو بکری کو ذبح کیا تھا بیٹے کو کہاں ذبح کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ انہوں نے تو قصداً بیٹے ہی کو ذبح کیا تھا چنانچہ چھری چلا ہی دی تھی۔ لیکن حق تعالےٰ نے بجائے ان کے مینڈھے یا بکری کو قائمقام کر دیا پس سُنت ابراہیم تو اضاحی اسوقت ہوں جبکہ ہم بھی اپنی اولاد کو ذبح کریں۔ پھر سنت ابراہیم جو اس کو فرمایا تو نکتہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ تبلایا ہے کہ تم کو اس عمل کا ثواب اتنا ہی ملتا ہے جس قدر کہ ان کو ذبح ولد پہ ملا تھا۔ اول تو ذبح ولد ہی ایک بہت بڑا عمل ہے دوسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کا ذبح کہ اس پہ ثواب بھی بے انتہا ہوگا تو گویا ارشاد ہے کہ تم کو اس عمل پہ وہی ثواب ہوگا جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد پہ ہوا تھا سبحان اللہ! یہ صرف جناب رسول اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی برکت ہے کہ تین روپیہ میں وہ اجر ہم کو ملتا ہے جو بیٹے کے ذبح کرنے سے ایک پیغمبر کو ملتا ہے اللہ اکبر ؎

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا ؛ من العنایۃ رکنا غیر منھدم

یہ فضیلت تو واللہ ایسی ہے کہ جس کے ذمہ قربانی واجب نہیں وہ بھی اگر چھوڑے تو اس کو ایک بڑی بھاری فضیلت کو چھوڑنے والا کہا جائیگا۔ اور جسکے ذمہ واجب ہے وہ اگر ترک کرے تو بڑا ہی خاسر ہے یہ شرف قربانی کا بانی کی وجہ سے ہوا۔

فضیلت غائی

اب غایت کے اعتبار سے لیجئے غایت اس کی دو ہیں دُنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ دُنیا میں تو یہ ہے کہ وہ جانور ذبح ہو کر پھر تمہارے کام آسکتا ہے۔ چنانچہ قربانی کے گوشت کی اگر تم ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دو اور سب کا سب خود ہی کھا لو تو بھی قربانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ عجیب انفاق مالی ہے کہ وہ شئے تمہارے ہی پاس رہے اور پھر عبادت ادا ہو گئی اور انفاقات مالیہ جس قدر ہیں اُن میں یہ بات نہیں جب تک ملک سے علیحدہ نہ کرو۔ اس وقت تک ادا نہیں

ہوتے ہیں اور ثواب نہیں ملتا ہے۔ اس امر میں یہ عمل انفاقات مالیہ سے ممتاز ہے۔
ایک لطیفہ جو ابھی ذہن میں آیا۔ اس میں یہ ہے کہ اس میں وسیلہ کے اعتبار سے
ایک اور فضیلت ہے وہ یہ ہے کہ اور انفاقات مالیہ میں تو چونکہ مال ملک سے
نکلتا ہے اور نفس کو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے پاس سے یہ شے جاویگی اس لئے
ان میں تو ممکن ہے کہ نفس حیلہ کرے اور غالب ہو کر اس عبادت سے محروم
رہے اور قربانی میں چونکہ نفس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ہو کر وہ جانور میرے
ہی ملک میں رہے گا۔ اور میں ہی اس سے منتفع ہوں گا۔ تو اس کے ادا کرنے
میں حیلہ بہانہ کرے گا۔ اور اس سے محروم نہ رہے گا۔ تو اس سے یہ امر معلوم ہوا کہ حق
تعالےٰ کو یہ عمل بہت ہی محبوب و مرغوب ہے کہ اس کے اندر اسقدر سہولتیں رکھی ہیں
کہ کوئی بھی روک اس کے کرنے میں بندوں کو نہ ہوا اور آخرت میں غایت یہ ہے
کہ انہا علی الصراط مطایاکم کہ بے شک وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گے
پس یہ شرف قربانی غایت کی وجہ سے ہوا الحمدللہ کہ قربانی کا فضل پانچوں وجہ سے
ثابت ہو گیا۔ اور یہ معلوم ہو گیا کہ قربانی بھی عجیب عمل ہے کہ ہر حیثیت سے اس میں
فضیلت ہے اب باقی رہ گیا آیت سے ان پنجگانہ وجوہ فضیلت کا استنباط سو اس
کی تقریر بیان کی جاتی ہے۔

استنباط فضائل

اول ترجمہ و تفسیر کیا جاتا ہے اس کے بعد عام اجزاء فضیلت پر اس کا انطباق بیان کر دیا جاویگا حق تعالےٰ کا ارشاد ہے
وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ اسمیں ابراہیم علیہ السلام کو خطاب ہے ارشاد ہے کہ اے
ابراہیم لوگوں میں پکار دو حج کے واسطے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام
نے اس فرمان کی اس طرح تعمیل کی کہ پہاڑ پر کھڑے ہو کر پکارا کہ اے لوگو! تمہارے رب
نے ایک گھر بنایا ہے اس کا حج کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس آواز کو تمام جہان کے
لوگوں نے سُنا۔ بزرگوں نے کہا کہ جس نے خود یا اس کی روح نے لبیک کہا اس
کو حج نصیب ہوتا ہے اور جس نے نہیں کہا وہ نہیں جاتا آگے ارشاد ہے یَاْتُوْکَ

رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ ۙ یعنی اس آواز سننے اور پکارنے کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ
تمہارے پاس پیادہ اور ہر دبلی سواری پر آویں گے مطلب یہ ہے کہ بڑی بڑی دور سے
آویں گے کہ آتے آتے جانور سواری کے دبلے ہو جاویں گے۔ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ
فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ آویں گے۔ وہ سواریاں ہر راستہ دور دراز سے ایک حکایت یاد
آئی کہ بوستاں میں جو ہے حوالیہ من کل فج عمیق ۔ ایک میاں جی
نے اس کا ترجمہ یہ بتلایا تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد بڑی بڑی کھائیاں ہیں لِّيَشْهَدُوْا
مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ حاضر ہوں وہ اپنے منافع پر یعنی یہاں آکر کچھ منافع ہوں گے۔
اور وہ منافع عام ہیں خواہ اخروی ہوں کہ ثواب ہوتا ہے اور یا دنیوی کو حج کے
اندر لوگ جمع ہوتے ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ اور بہت
سے منافع دنیویہ اس سے حاصل ہوتے ہیں وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ
عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ یعنی آنے پر دو غائتیں مرتب ہوں ایک
تو منافع اخرویہ و دنیویہ جس کا بیان لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ میں ہے اور
دوسری یہ کہ اللہ کا نام ذکر کریں چند ایک ایام معلومہ ہیں ان اہلی جانوروں پر
جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۡ پس
ان سے تم بھی کھاؤ اور تنگدست فقیر کو بھی کھلاؤ ہر چند کہ یہاں ذکر حج کا ہے۔
لیکن قربانی جس کے متعلق یہ آیتیں ہیں یہ تو عمل مشترک ہے اسلئے ان آیتوں
سے مطلق قربانی کی فضیلت بھی مستنبط ہو سکتی ہے بہرحال یہ تو تفسیر تھی ان
آیتوں کی اب وجوہ فضیلت کا استنباط سنئے عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ
بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ میں اشارہ ہے اس کی عمل کی حقیقت جنسیہ و نوعیہ کی طرف
اسلئے کہ جانور بدوں مال کے خرچ کیے ہوئے نہیں آتا۔ اور ان پر اللہ کا نام لینے
سے مراد ذبح کرنا ہے کہ جو اشارہ ہے حقیقت نوعیہ کی طرف فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ
سے اس زمانہ کی فضیلت ثابت ہوئی اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جانی پہچانی
فرمایا لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ سے مکان کی طرف اشارہ ہے اسلئے

کہ حاضر ہونا مکان میں ہوتا ہے مشہود مکان ہوتا اور شاہد زمان اس میں مشہود
مکان کو شہود منافع سے تعبیر فرمایا ہے رہا بانی کا ذکر وہ اَذِّنْ فِی النَّاسِ میں
ہے غایت کا ذکر لیشہدوا منافع لہم میں ہے کہ جو متضمن ہے نفع دنیوی
و نفع اخروی کو اور علی ما رزقہم سے اشارہ اس طرف ہے کہ باوجود ذبح
ہونے کی بھی نسبت اس کی اہم سے یعنی ذابحین سے قطع نہیں ہوئی چنانچہ
آگے فکلوا منہا واطعموا اس پر صاف دلیل ہے کہ وہ جانور ملک سے
نکلتا نہیں ہے اور یہ اسواسطے فرما دیا تاکہ نفس اس بات سے مچلے نہیں ہے
اور اس کو سہولت نظر آتی رہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا شکر
اگر اپنے انتفاع پر موقوف ہو تو آدمی کو چاہیئے کہ کھایا پیا کرے اور یذکروا
اسم اللہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اللہ کا نام لینا نفع اخروی ہے مگر اس میں
ایک نفع دنیوی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کا نام لینے سے جانور کے اندر حلت آجاتی
ہے اور وہ کھانے کے لائق ہو جاتا ہے اور یہاں سے ایک شبہ بھی دفعہ ہوتا ہے
تقریر شبہ کی یہ ہے کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے کہ اس کی کیا وجہ ہے تمہارا مارا
ہوا جانور تو حلال ہو اور اللہ کا مارا ہوا حرام یعنی ذبیحہ حلال ہو اور مردار حرام اس
کا جواب یہاں سے نکل آیا کہ ذبیحہ جو کھانے کے قابل ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہی
کے نام کی برکت ہے پس دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے مارے ہوئے ہیں ہمارا
مارا ہوا نہیں کیونکہ جان تو وہی نکالتا ہے باقی یہ فرق کہ ایک حلال اور ایک حرام
تو وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا گیا ہے اس کی برکت سے اس میں حلت
آگئی اور وہاں نہیں لیا گیا اس لیئے حرام رہی اور دوسرے فرق کی وجہ یہ ہے
کہ ذبیحہ میں دم مسفوح جو نجس ہے نکل جاتا ہے اور مردار میں وہ خون تمام
بدن میں سما جاتا ہے پس حلت دونوں باتوں کے مجموعہ کا یعنی ذکر اسم اللہ اور
خروج دم مسفوح کا اثر ہے اور کُلُوْا سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ غنی کو بھی کھانا
جائز ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا انعام ہے جو بہ برکت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہم کو عطا

ہوا ہے ورنہ امم سابقہ میں یہ ہوتا تھا کہ قربانی کو ایک پہاڑ پر رکھ دیتے تھے ایک
آگ آتی تھی جس کی قربانی کو اس نے جلا دیا وہ مقبول ہوتی تھی ورنہ مردود۔ الحمد للہ
کہ پانچوں وجہ فضائل کے قرآن مجید سے بھی صاف طور پر ثابت ہو گئیں میرا مقصود
فضائل بیان کرنے سے یہ ہے کہ لوگوں کو قربانی کی حقیقت معلوم ہو جائے اور
اس کی طرف رغبت ہو باقی احکام اگر کسی کو دریافت کرنا ہو تو مدرسہ میں آ کر دریافت
کر لے اب اس سُننے کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ جن کے ذمہ واجب ہے وہ تو ضرور
ہی کریں اور انشاء اللہ تعالےٰ کریں گے باقی جن کے ذمہ واجب نہیں لیکن وُسعت
اس قدر ہے کہ اگر ایک حصہ قربانی کا کر لیں تو اس زائد خرچ کی وجہ سے کسی حق واجب
میں فرق نہ آوے وہ لوگ بھی مناسب ہے کہ کریں اس کی فضیلت ایسی ہے کہ اُس کا
چھوڑنا بہت بڑے نفع سے محروم رہنا ہے اور جس کو بالکل ہی وسعت نہ ہو وہ
مجبور ہے۔

غریب کی قربانی

اور غریب کو قربانی کرنے کا مناسب اور مستحب ہونا
بھی اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے اسلیئے کہ ارشاد یہ ہے
یَاتُوكَ رِجَالًا کہ آویں گے تیرے پاس پیادہ جو پیادہ آویگا وہ ظاہر ہے
کہ غریب ہی ہوگا یہ بیان ختم ہوا آپ حضرات ضرور ہمت کیجئے اور جو لوگ یہاں
موجود نہیں ہیں اُن کو بھی سنا دیجئے۔ اب اللہ تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ
توفیق عطا فرمادیں۔ آمین۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ
وَالْمُسْتَعَانُ ۔

السوال فی شوال

ماہِ شوال میں تین دعاؤں پر مشتمل تقریر

۹ شوال ۱۳۳۶ھ کو بعد نماز جمعہ حج و قربانی اور امساک باراں کے بارے میں وعظ ارشاد فرمایا۔ حضرتؒ کرسی پر جلوہ افروز تھے۔

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ ۶۰ تھی۔

عارف جہاں بیٹھتا ہے وہی اس کا مکہ اور مدینہ ہے کیونکہ مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے تجلی عبدیت ——— اور عارف اپنے اندر ہر وقت تجلی الوہیت و تجلی عبدیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ جہاں بیٹھے گا مکہ مدینہ (زادھما اللہ شرفاً و کرامۃً) اس کے ساتھ ہے۔ پس وہ ہر جگہ خوش رہے گا کیونکہ مقصود سے ہر دم اس کو قرب حاصل ہے ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں
فوق گردوں ست نے قعر زمیں

(از حضرت حکیم الامتہؒ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الوعظ المسمّٰی بہ

السوال فی شوال

الملقب بہ

العج والثج واللج

*

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم : **اما بعد** فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ یسئلہ من فی السموٰت والارض کل یوم ھو فی شان ۔

تمہید | مجھ کو اس وقت تین متفرق مضامین بیان کرنا ہیں ۔ اور باوجود

تفرق کے ان میں ایک وجہ جامع بھی ہے اس وجہ جامع کی بنا پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے یعنی تفصیلاً تو اس آیت میں ان تینوں کا ذکر نہیں ہے لیکن آیت میں ایک ایسی چیز کا ذکر ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے اور اس کی وجہ سے باوجود تفرق کے اُن میں ایک خاص ارتباط ہے پس اوّل میں ان تینوں کی تقریر کرتا ہوں پھر وجہ جامع بیان کروں گا جس سے آیت کے ساتھ ان مضامین کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

تو ان میں سے ایک تو حج کا مضمون ہے دوسرے قربانی کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے تیسرے امساک باراں کا سبب اور اس کا علاج بتلانا ہے دو مضمون اول کے تو تشریع عام کے اعتبار سے ان ایام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے مضمون کا اتفاقاً اس زمانہ سے تعلق ہو گیا کیونکہ آج کل امساک باراں ہو رہا ہے جس کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں تو یوں کہئے کہ اس زمانہ کے ساتھ دو کا تعلق تو تشریع عام کی وجہ سے تھا تیسرے کا تکوین خاص کی وجہ سے ہو گیا۔

اول کا تعلق تو ان ایام سے بہت ہی ظاہر ہے کہ شوال اشہر حج میں سے ہے کیونکہ اشہر حج تین ہیں خود نص میں ارشاد ہے۔ الحج اشھر معلومات ' اور حدیث نے اس کی شرح کر دی ہے کہ شوال ذیقعدہ ذی الحجہ اس کا مصداق ہیں تو شوال بھی اشہر حج میں سے ایک مہینہ ہے۔

باقی یہ بات تو اہل علم کو معلوم ہی ہو گی کہ اس ماہ سے حج کو تعلق کیسا اور کس قسم کا ہے یہ تو معنی ہیں نہیں کہ شوال میں حج ہوتا ہے حج تو ذی الحجہ میں ہوتا ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس ماہ میں احرام حج بلا کراہت جائز ہے۔

رہی قربانی سو اس کا تعلق اس ماہ سے یہ ہے کہ حدیث میں ہے۔

سمنوا ضحایاکم فانھا علی الصراط مطایاکم اسندہ الدیلمی من طریق ابن المبارک عن یحییٰ بن عبید اللہ عن ابیہ عن ابی ھریرۃ رفعہ بھذا ویحییٰ ضعیف جدا قال ابن الصلاح ان ھذا الحدیث غیر معروف ولا ثابت فیما علمناہ اھ

من المقاصد ص ۲۷)

نیز مدلول حدیث کی تائید آیۃ قرآنیہ سے بھی ہوتی ہے ۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب

تعمیم تعظیم میں تفخیم بدن اور تعمیم شعائر میں ضحایا بھی داخل ہے چنانچہ عنقریب آتا ہے ۔

اور ظاہر ہے کہ تسمین کی صورت یہی ہے کہ حج کے وقت سے پہلے جانور خریدا جائے اور اس کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کیا جائے تو وقت حج سے پہلے ذیقعد بھی ہے مگر شوال کو اس پر یہ ترجیح ہے کہ اس کو شارع نے مبداء افعال حج بنایا ہے کہ اس سے احکام حج شروع ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ شوال سے احرام باندھنے کے ساتھ بعض سوق ہدی بھی ہوتا ہے کیونکہ احرام کی ایک قسم وہ بھی ہے جو سوق ہدی کے ساتھ ہو تو اس صورت میں شوال ہی سے احرام کے ساتھ قربانی کی بھی تیاری ہو گی غرض حج اور قربانی شرعاً دونوں ساتھ ساتھ ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں حج و قربانی کو مقرون بالذکر کیا گیا ہے چنانچہ سورۂ حج میں ہے ۔

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق ہ لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام : اس کے بعد ارشاد ہے :

ولیقضوا تفثھم ولیوفوا نذورھم ولیطوفوا بالبیت العتیق :

اس آیت میں تو افعال حج کا ذکر ہے اس کے بعد کی آیت میں قربانی کا بھی ذکر ہے

ذلک ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب ۔

تعریف شعائر اللہ | شاید کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو گا کہ اس میں قربانی کا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تیسرے حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا ما الحج یا رسول اللہ ۔ کہ حج کی حقیقت کیا ہے تو حضورؐ نے جواب میں فرمایا العج والثج کہ حج کی حقیقت ہے آواز بلند کرنا (تلبیہ میں) اور خون بہانا (قربانی میں) اب تو مناسبت بوجہ اکمل ظاہر ہوگئی کہ حضورؐ نے قربانی کو داخل حقیقت حج کیا ہے گو وہ ارکان میں سے نہ ہو مگر اس کو تعلق حج کے ساتھ ایسا قوی ہے کہ گویا داخل حج ہے۔

اور حج کے افعال شوال سے شروع ہو جاتے ہیں تو قربانی کے احکام بھی اسی وقت سے شروع ہو جانے چاہئیں گو حکم مستحب ہی سہی یعنی تسمین نیز تعلق اضحیہ کا حج کے ساتھ اس سے بھی ظاہر ہے کہ شرعاً سوق ہدی تلبیہ کے قائم مقام ہے کہ جو شخص احرام حج کے ساتھ سوق ہدی بھی کرے تو اس کا احرام تقلید ہدی سے منعقد ہو جاتا ہے تلبیہ پر موقوف نہ رہے گا پس اگر کوئی شخص شوال کے مہینہ میں احرام مع سوق الہدی کا ارادہ کرے تو اس کے ذمہ اسی ماہ میں ہدی کا خریدنا لازم ہے گو بعض صورتوں میں اس ماہ میں واجب نہ ہو مگر مناسبت کے واسطے یہ لطائف کافی ہیں کیونکہ یہ مضمون مبانی و مقاصد میں سے تو نہیں ہے جس کے لئے دلائل قطعیہ کی حاجت ہو۔ بہر حال جن تین مضامین کے بیان کا اسوقت ارادہ ہے ان میں سے دو کا تعلق تو اس ماہ سے بخوبی ظاہر ہو گیا ایک کا تعلق تو بدیہی تھا (یعنی حج کا) اور ایک کا تعلق وارتباط اس تقریر سے ظاہر ہو گیا۔

رہ گیا تیسرا امر سو اس کو اس ماہ سے مناسبت اتفاقاً ہو گئی ہے کہ اس ماہ میں امساک باراں ہو گیا ہے۔ تو باوجود تفرق کے ان سب میں ارتباط بھی ہے بس ایک جلسہ میں ان تینوں کا بیان کرنا مناسب ہو گیا۔

حکمت باری تعالےٰ

اور ان میں ایک مناسب معنویہ اور بھی ہے جو سیاق تقریر میں ابھی واضح ہو جائے گی اور ان عبادات کو عبادات رمضان سے جو تعلق ہے اس کا معلوم کرنا طرب کے لئے کافی ہے جس سے حق تعالیٰ کی عجیب حکمت کا انکشاف ہوتا ہے کیونکہ ایسے مہینہ کم ہیں جن میں مسلسل نئی نئی عبادات

ہوں مگر ان مہینوں میں رمضان سے ذی الحجہ تک مسلسل عبادات ہیں پھر ان میں باہم جو تعلق وارتباط ہے اس کا معلوم کرنا طرب و وجد میں لاتا ہے حالانکہ ہمارا علم مشوب بالجہل بھی ہے جب یہ علم ناقص طرب و وجد پیدا کرتا ہے تو حقیقت اصلیہ اگر واضح ہو جاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ❊ صاف گر باشد نہ دانم چوں کند

چنانچہ رمضان میں روزہ اور تلاوت قرآن ہے اس کے بعد حج کا سلسلہ شروع ہو گیا کہ شوال و ذیقعد احرام حج میں مشغول ہیں اس کے بعد ذی الحجہ میں حج ہوتا ہے اور قربانی تو اس ماہ میں سب کے لئے مشروع ہے حج کرنیوالے کے لئے بھی۔ اور غیر حاج کے لئے بھی۔ مگر یہ تسلسل اور ترتیب حج کرنیوالوں میں زیادہ ظاہر ہے حج نہ کرنیوالوں کے اندر یہ سلسلہ اور ترتیب ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ وہ نہ احرام باندھتے ہیں نہ مکہ جاتے ہیں مگر باطناً ان میں بھی یہ ترتیب ظاہر رہتی ہے وہ اس طرح کہ رمضان کے بعد حجاج کی روانگی ہوتی ہے تو غیر حجاج کے دل پر بھی ایک نشتر سا لگتا ہے اور وہ بھی حسرت کے ساتھ ان جانیوالوں کو دیکھتے ہیں اور اس وقت ہر مسلمان کے دل میں ایک خاص داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ ہائے ہم بھی اس وقت حج کو جاتے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی نیت ہی بڑی چیز ہے روایات میں ہے۔ نیۃ المومن خیر من عملہ پس اب یہ تسلسل و ترتیب غیر حاج کے حق میں بھی واضح ہو گئی جو لوگ سچ مچ کو جا رہے ہیں وہ رمضان کے بعد عملاً حج میں مشغول ہیں کیونکہ اُن کو اپنے نہ جانے پر حسرت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں صحابہ سے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس وقت ظاہراً تمہارے ساتھ نہیں مگر عند اللہ وہ ہر منزل اور ہر مقام میں تمہارے ساتھ ہیں اور ثواب میں برابر کے شریک ہیں اور یہ وہ معذورین ہیں جو عذر کی وجہ سے تمہارے ساتھ شریک سفر نہ ہو سکے مگر ان کا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ بھی تمہاری طرح جہاد کرتے اس حدیث سے مشتاقان حج کا

حجاج کے ساتھ شریک حج ہونا واضح ہوگیا بس اب یہ ترتیب سب کے حق میں عام ہوگئی۔

مناسبت معنویہ اب میں ان عبادات میں تعلق وارتباط بیان کرتا ہوں جس کو ابھی مناسبت معنویہ سے تعبیر کیا ہے سو رمضان میں تو روزہ اور تلاوت قرآن ہے اور ان دونوں کو میں نے ایک اس توجیہ پر کہا ہے جس کی بنا پر، من و سلوٰی کو قرآن شریف میں طعام واحد کہا گیا ہے یعنی دونوں کو اقتران کی وجہ سے میں نے ایک عبادت کہہ دیا ہے اس کے بعد شوال سے زمانہ حج ہے جو نویں ذی الحجہ کو ادا ہوتا ہے پھر قربانی ہے جو دسویں ذی الحجہ سے بارہ تک ہوتی ہے اور ان عبادات میں ترتیب نہایت ہی عجیب ہے چنانچہ روزہ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ دربار شاہی میں جانے کے لئے اوّل پاک صاف ہوا کرتے ہیں۔

روح حج لیکن اس کا سمجھنا روح حج کے سمجھنے پر موقوف ہے پس اول روح حج کو معلوم کرنا چاہیئے سو روح حج وصول الی اللہ ہے۔ جس کی صورت حج البیت ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود ÷ حج رب البیت مردانہ بود

یعنی اصل میں مقصود حج ربّ البیت ہے زیارت خانہ کعبہ اُسکی صورت ہے۔

اس حقیقت کو حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ جوش میں بیان فرمایا تھا کہ اُس وقت حکام مکہ حضرت سے کچھ برہم تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ اپنے کو مٹاتے ہیں ان کو رفعت حاصل ہوتی ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

دیکھو اللہ ہے چھوٹوں کو بڑائی دیتا ÷ آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

واقعی جو لوگ اپنے کو مٹاتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔ حدیث میں ہے من تواضع للّٰہ رفعہ اللہ۔ مگر یاد رکھو جو بقصد رفعت تواضع کرے گا اُس کو رفعت حاصل نہ ہوگی کیونکہ اس نے تواضع للّٰہ نہیں کی بلکہ لغیر اللہ کی ہے تواضع للّٰہ تو یہ ہے کہ حقیقت میں وہ اپنے کو لاشے اور ہیچ سمجھ کر تواضع کرے اور اپنے کو رفعت کا

اہل نہ سمجھے اور سیج مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے حضرت حاجی صاحبؒ تو یوں چاہتے تھے کہ اپنے کو خاک میں ملا دیں اور جن لوگوں نے حضرت کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت میں کس قدر غلبۂ فنا تھا مگر جتنا وہ مٹاتے تھے اُتنا ہی بلند ہوتے تھے حتیٰ کہ حکام بھی آپ سے مرعوب تھے۔

تو جس زمانہ میں حکام مکہ حضرت سے برہم تھے۔ اسی زمانہ میں شریف صاحب کے ایک مصاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم لوگوں نے یہ خیال کیا کہ شاید حضرتؒ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں گے مگر حضرت نے اُن کے ساتھ ایسا سخت برتاؤ کیا کہ ہم خدام بھی ڈر گئے کہ خدا خیر کرے فرمایا یاد رکھو شریف صاحب میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں بیشں بریں نیست کہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے سو خوب سمجھ لو کہ عارف جہاں بیٹھتا ہے وہی اس کا مکہ اور مدینہ ہے ——— کیونکہ مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے تجلی عبدیت اور عارف اپنے اندر ہر وقت تجلی الوہیت و تجلی عبدیت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ جہاں بیٹھے گا مکہ مدینہ اس کے ساتھ ہے پس وہ ہر جگہ خوش رہے گا کیونکہ مقصود سے ہر دم اس کو قرب حاصل ہے ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں   فوق گردوں ست نے قعر زمیں

اور ؎

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ   جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

پھر چونکہ حضرت محقق تھے اس لئے مسئلہ کے دوسرے پہلو کو بھی سنبھالا اور فرمایا مگر جو محقق ہے وہ صورت کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتا بلکہ حتی الامکان صورت معنی کو جمع کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

بہرحال مجھے حضرت حاجی صاحبؒ کی اس حکایت سے اس مسئلہ کی تائید کرنا مقصود تھی کہ روح حج وصول الی اللہ ہے جس کی صورت یہ حج بیت ہے

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب روزہ اور تلاوتِ قرآن سے اس کا ربط سمجھ میں آنا آسان ہوگا کہ حضرت حق نے اوّل تو رمضان میں روزہ کا حکم فرمایا کہ اپنے

کو پاک صاف کر دو کیونکہ روزہ سے قوت بہیمیہ منکسر ہوتی اور معاصی سے رکاوٹ ہوتی ہے اور دل میں رقت پیدا ہوتی ہے جو تخلیۂ رذائل کے ساتھ ساتھ تراویح میں تلاوت قرآن کا حکم ہے یہ تحلیہ ہے کیونکہ تکثیر صلوٰۃ سے انسان کے اندر اخلاق حمیدہ پیدا ہوں گے اور انوار طاعات زیادہ ہوتے ہیں اور قرآن کی تلاوت سے بھی قلب میں نور پیدا ہوتا اور زنگ دور ہوتا ہے۔ جب روزہ اور تلاوت قرآن و تراویح سے پاک صاف ہو کر آراستہ ہو گئے کہ اب اجازت ہوئی دربار میں حاضر ہونے کی چنانچہ حج اسی کا نام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الحج عرفۃ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج عرفات میں جانے کا نام ہے اور یہ ایسا رکن ہے کہ اگر یہ فوت ہو جائے تو اس کا بدل کچھ نہیں ایک مقدمہ تو یہ محفوظ رکھئے دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ حج میں بعض اعمال تو ایسے ہیں جو بظاہر عبادت معلوم ہوتے ہیں جیسے طواف خانہ کعبہ مگر وہ حج نہیں۔ کیونکہ جو شخص تنگ وقت میں مکہ پہنچے اس کو حکم ہے کہ سیدھا عرفات پہنچ جائے اور طواف وغیرہ کو ترک کر دے۔ اور عرفات میں جانا ایسا عمل ہے کہ وہاں بظاہر کوئی عبادت نہیں نہ کسی خاص چیز کی تعظیم ہے نہ وہاں کوئی خاص نماز مقرر ہے پنج وقتہ نماز تو سب جگہ ہے وہاں بھی ہے مگر عرفات میں جانا ہی سب کچھ ہے حج اسی کا نام ہے کہ نویں تاریخ کی نصف النہار کے بعد سے ۱۰ ذی الحجہ کی صبح تک کسی ایک منٹ میں ایک قدم عرفات کے اندر رکھ دے بس اسی وقت مذکور میں اگر کسی وقت بھی ایک قدم عرفات میں پڑ گیا خواہ جاگتے ہوئے یا سوتے ہوئے ہوش میں یا بیہوشی میں تو حاجی بن گئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوف عرفات کی حقیقت حاضری دربار شاہی ہے۔ جب ہی تو اس میں اور کچھ شرط نہیں صرف ایک قدم وہاں ڈال دینا شرط ہے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے پاس پہنچنا کتنا آسان ہے کہ صرف ایک قدم رکھ دیا اور واصل ہو گئے۔ اے سالکین یہ دیر جو آپ کو ہوتی ہے راستہ میں ہوتی ہے وصول میں کچھ دیر نہیں ہوتی وہ تو ایک قدم سے ہو جاتا ہے۔

نذرانۂ جان — اب وصول کے بعد حکم ہوا کہ کچھ نذر پیش کرو کیونکہ دربار شاہی میں پہنچ کر نذر پیش کرنا قاعدہ عقلیہ ہے اور نذر کے لئے قاعدہ شرعیہ ہے۔

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔

اور یہی قاعدہ عقلیہ بھی ہے اور سب سے پیاری چیز اپنی جان ہے جب تک کہ وصول نہ ہو اور بعد وصول کے تو اللہ و رسول سے زیادہ کوئی چیز پیاری نہیں رہتی اور جو چیز بعد وصول کے پیاری ہے وہ حقیقت میں تو ابتداء ہی سے احب الاشیاء ہے یعنی اللہ و رسول مگر وصول سے پہلے اس احبیت کا انکشاف نہیں ہوا تھا اور پھر ان دونوں میں بھی فی نفسہ ایک ہی چیز زیادہ پیاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ شانہ۔ اور رسول کی احبیت اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا احب الاشیاء ہونا اس لئے ہے کہ احبیت کا مدار قرب پر ہے اور جان اگرچہ سب سے زیادہ قریب ہے مگر بعد ریاضات و مجاہدات کے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ قرب حق تعالیٰ شانہ کو ہے۔ بھلا حضرت حق کی تو بڑی شان ہے حضرات صحابہؓ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ تعلق تھا کہ جان و مال و اولاد سب کو آپ پر فدا کر دیا تھا حضرت حسان فرماتے ہیں ؎

فان ابی و والدتی و عرضی ٭ لعرض محمد منکم وقاء

ایک صحابیہ کا واقعہ ہے کہ ایک غزوہ میں اس کا شوہر اور بھائی باپ سب شہید ہو گئے واپسی کے وقت لوگوں نے اس کو صبر کی تلقین کی کہ تیرے سب عزیز مارے گئے تو وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خیریت سے ہیں؟ صحابہ نے کہا ہاں حضور تو خیریت سے ہیں تو کہا بس اب ساری مصیبت ہلکی ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جان سے زیادہ قرب ہے اور حق تعالیٰ نے بھی اس قرب کو بیان فرمایا ہے۔

النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم

تو پھر حضرت حق کے قرب کا کیا حال ہوگا۔ اور وصول کے بعد تو اس قرب کا انکشاف

ہو ہی جائے گا لیکن وصول سے پہلے بھی عقلاً اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کو ہم سے قرب زیادہ ہے کیونکہ جان کا تعلق جو ہمارے ساتھ ہے وہ محدث ہے اور خدا تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو جان کے ساتھ جو ہمارا تعلق ہے وہ حضرت حق کے تعلق پر موقوف ہے پس حضرت حق کے ساتھ ہم کو تعلق سب سے پہلے ہے پس قرب بھی ان کو ہی زیادہ ہے اور احبیّت کا مدار قرب پر ہی تھا تو حق تعالیٰ احب الاشیاء ہوئے پس ایسے محبوب کا حق یہ ہے کہ اس کے بعد جو چیز سب سے زیادہ پیاری ہو اس کو اس کے سامنے بطور نذر کے پیش کیا جائے اور حق تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ پیاری چیز اپنی جان ہے جو قبل از وصول مطلقاً سب سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی تھی اب اس کو حق تعالیٰ پر فدا کر دینا چاہیئے ؎

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست　　نائب ست او دست او دست خداست

یہ تو نائبین حق کے واسطے بھی جان دینا روا رکھتے ہیں پھر حق تعالیٰ تک وصول ہو جانے کے بعد تو جان کا فدا کر دینا بہت ہی انسب ہوگا۔ پس بعد وصول کے مینے حکم ہوتا ہے۔ ان اقتلوا انفسکم۔ پس وصول کے بعد جان فدا کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہیئے مگر چونکہ سب کی ہمت یکساں نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

ولو انا کتبنا علیهم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوه الا قلیل منهم :

اس لئے جان دینا سب کو آسان نہ تھا۔

نیز جو حکمت ہے ابقاء نوع انسان میں جس کو صوفیہ کرام بیان کیا کرتے ہیں جس کی تفصیل کا اب موقع نہیں ہے اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں کہ ابقاء نوع انسان سے ظہور اسماء و صفات مطلوب ہے اس صورت میں یہ حکمت بھی فوت ہوتی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے جان کے عوض میں اس کا ایک بدل مقرر فرمایا کہ اس کو پیش کر دو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے جارج پنجم کے دربار میں جانے کے لئے اصل نذرانہ تو گنی ہے پھر نوٹ کو اس کے قائم مقام کر دیا جائے ویسے ہی حق تعالیٰ نے

ہماری جان کا ایک بدل مقرر فرما دیا پھر بدل میں بھی اصل بدل وہ تھا جو واقعہ ابراہیم علیہ السلام میں بتلایا گیا ہے ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کی جان کو ہم پر فدا کرو۔ حقیقت میں سب سے زیادہ محبوب اپنی جان ہے اس کے بعد اولاد کی جان ہے مگر وہ ایسی احب ہے کہ بعض دفعہ شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب ہے مگر تعارض کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جان کے ساتھ تعلق زیادہ ہے۔

جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہے کہ اس کی بیٹی مہستی نام بیمار تھی بڑھیا دعا کرتی تھی کہ میں مر جاؤں اور یہ اچھی ہو جائے اتفاقاً ایک گائے کسی کے باورچی خانہ میں جا گھسی اور دیگچی میں منہ ڈال دیا اور دیگچی پھنس گئی وہ پریشان ہو کر اس بڑھیا کے گھر میں آ گھسی اس نے کبھی ایسی منکر ہیئت دیکھی نہ تھی سمجھی کہ یہ موت ہے جس کو میں روزمرہ بلاتی تھی اب مجھ کو لینے آئی ہے ڈر گئی اور مہستی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی ؎

گفت اے موت من نہ مہستی ام ⁂ پیر زال غریب محنتی ام

ہر حال فرزند کے ساتھ بھی بے حد محبت ہوتی ہے تو ابراہیم علیہ السلام کو اس بدل کے پیش کرنے کا حکم ہوا انہوں نے اس حکم کو اسمٰعیل علیہ السلام سے بیان کیا۔

فیض حضرت ابراہیم علیہ السلام اس واقعہ میں زیادہ عجیب اسمٰعیل علیہ السلام کا راضی ہو جانا تھا کہ وہ اس نوعمری میں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تھی خدا تعالیٰ پر اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہو گئے ابراہیم علیہ السلام تو نبی ہو چکے معرفت کامل ہو چکی تھی خلیل اللہ کا لقب ان کو مل چکا تھا۔ ان کا اس حالت میں ذبح ولد پر آمادہ ہو جانا اس قدر عجیب نہیں جتنا اسمٰعیل علیہ السلام کا اس حکم کو سُن کر بدون پس و پیش کے مذبوحیت کے لئے آمادہ ہونا عجیب ہے ؎

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر ⁂ آبا از دکرم دابنا عزیز تر

اور درحقیقت یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا فیض تھا کہ ان کی طرح

ان کی اولاد بھی خدا کی عاشق تھی چنانچہ حضرت اسمٰعیل نے فرمایا۔

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین

کہ اے باپ جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالئے انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے یعنی میں تحمل و استقلال سے کام لوں گا۔ فلما اسلما وتلہ للجبین۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پیشانی کے بل ڈال کر ذبح کرنا شروع کیا اور پورا زور لگا دیا مگر وہاں اثر بھی نہ ہوا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم تھا اذبح۔ اور سکین کو حکم تھا لاتذبح (میںنا للمفعول) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھلا کر چھری سے کہا کہ تجھے کیا ہوا کاٹتی کیوں نہیں نہیں اس نے کہا لے ابراہیم تم اپنا کام کر دیں اپنا کام کروں گی مجھے اور حکم ہے تمکو اور حکم ہے۔

واقعی ظاہر میں یہ اسباب مؤثر نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں سوائے حضرت حق کے کوئی مؤثر نہیں یہ اسباب بھی ان کے حکم کے بعد ہی کام کرتے ہیں مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند ؛ بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال سکین کو حکم تھا کہ کند ہوجا وہ کند ہوگئی اور حضرت ابراہیم کو حکم تھا کہ ذبح کرو وہ ذبح کی کوشش میں تھے کہ غیب سے آواز آئی۔

یا ابراھیم قد صدقت الرؤیا۔

لے ابراہیم واقعی تم نے اپنی خواب کو سچا کر دیا۔

اصل مقصود عمل ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل مقصود عمل ہے ترتب نتیجہ مقصود نہیں۔ یہ سالکین کے بہت کام کی بات ہے کیونکہ آج کل بہت سالکین ثمرات کے منتظر رہتے ہیں اور جب اعمال پر کیفیات و ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو وہ عمل کو بیکار سمجھتے ہیں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا فعل ناقص تھا؟ آپ کے مذاق پر تو ناقص ہی ٹھہرے گا کیونکہ ان کو حکم تھا ذبح کا اور ذبح پر ثمرہ کا ترتب وقوع کہاں ہوا صرف قصد ذبح وسعی فی الذبح کا

تحقق ہوا تھا معلوم ہوا کہ مقصود عمل ہے نتیجہ مقصود نہیں کیونکہ عمل تو کسی درجہ میں آپ کے اختیار میں ہے اور نتیجہ صرف حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان سے وہی شئے مقصود ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہو پس ؎

کار خود کن کار بیگانہ مکن

تم اپنے کام میں لگو اور نتیجہ کی فکر میں نہ رہو بلکہ نتیجہ کے متعلق یہ مذاق پیدا کرو کہ یابم اور ایا نیابم جستجوئے می کنم ؁ حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

غرض ابراہیم علیہ السلام کے فعل پر نتیجۂ ذبح مرتب نہیں ہوا لیکن پھر بھی حق تعالیٰ نے ان کے فعل کی نہایت تفخیم ظاہر فرمائی ہے کیونکہ جب انہوں نے اپنی طرف سے سب کچھ کر لیا تو بڑا کام کیا وہ جس وقت ذبح ولد کے لئے تیار ہو گئے تھے اور ان کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اسوقت تو ان کو یہ علم نہ تھا کہ چھری کو لا تذبح کا حکم ہو جائے گا اور وہ اپنا کام نہ کرے گی بلکہ وہ تو یہ سمجھ کر تیار ہوئے تھے کہ چھری پھیرتے ہی بچہ کا کام تمام ہو جائے گا کیونکہ وہ اسکو خوب تیز کر چکے تھے اب اس کے بعد نتیجہ کا مرتب نہ ہونا ان کے اختیار سے باہر تھا پس واقعی انہوں نے بہت بڑا کام کیا۔

ابتدا قربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انا کذلک نجزی المحسنین ۝ ان ھذا لھو البلٰؤا المبین ۝ وفدینٰہ بذبح عظیم ۝

اس کے بعد ایک دنبہ اسمٰعیل علیہ السلام کا فدیہ ہو کر آ گیا اور اس کو بجائے ان کے ذبح کیا گیا یہ قربانی کی ابتدا ہے۔

چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہ رضؓ نے دریافت کیا۔ ماھذہ الاضاحی یا رسول اللہ تو جواب میں ارشاد فرمایا۔ سنۃ ابیکم ابراھیم کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے تو اصل عوض تو ہماری جان کا ہماری اولاد کی جان تھی مگر رحمت حق سے جانور کی جان ہماری جان کا عوض ہو گئی۔

سنت ابراہیمی کا مصداق

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس حدیث سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جانوروں کی جان ہماری جان کا عوض ہے اس سے تو صرف یہ معلوم ہوا کہ قربانی کرنا حضرت ابراہیم کی سنت ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے دنبہ ذبح کیا تھا؟

تو بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تو ذبح ولد تھا اور ذبح کبش ان کا فعل نہ تھا بلکہ یہ تو بدون ان کے ارادہ کے غیب سے فدیۂ اسمٰعیل بنایا گیا پس سنت ابیکم ابراھیم سے وہی فعل مراد لینا چاہیئے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تھا اور وہ ذبح ولد تھا اور ذبح کبش کا وقوع بطور فدیہ کے ہوا ہے چنانچہ وفدیناہ بذبح عظیم میں لفظ فدینا اس پر صراحۃً دال ہے۔

تو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ اضحیہ حضرت ابراہیم کی سنت ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ولد کو ذبح کیا تھا پھر حق تعالیٰ نے کبش کو فدیۂ ولد بنا دیا پس معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کا ذبح کرنا قائم مقام ذبح ولد کے ہے کیونکہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام میں ایسا ہی ہوا تھا۔

اور اگر اس دلالت کے غیر صریح ہونے سے کوئی اس پر اشکال کرے تو ہم کو مضر نہیں کیونکہ اول تو یہ مضمون عقائد کی قبیل سے نہیں جس کے لئے حدیث صحیح الدلالۃ کی ضرورت ہو بلکہ منجملہ ترغیبات و فضائل کے ہے جس کے لئے فی الجملہ دلالت حدیث کافی ہے دوسرے اگر یہ حدیث اس دعوے پر صریح الدلالۃ نہیں تو ہم دوسری حدیث کو جو اپنے عموم سے دلالت میں صریح ہے اس سے ملا کر اپنا مدعی پورا کر لیں گے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انا عند ظن عبدی بی ــــــ کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں سو ہم کو تو اس وجہ دلالت کی بنا پر جو سنۃ ابیکم ابراھیم کے متعلق اوپر مذکور ہوئی حق تعالیٰ کے ساتھ یہ گمان پختہ ہے کہ انشاء اللہ قربانی کا جانور قائم مقام ذبح ولد کے ہے اور ہم کو اس میں وہی ثواب ملے گا جو ذبح ولد میں ملتا تو

کچھ اشکال نہیں رہا اور جس کو اب بھی اشکال ہو وہ اپنا ثواب کم کرے وہ قربانی کو ذبح ولد کا عوض نہ سمجھے اُسے اختیار ہے۔

نوعیت جانور اب سمجھنا چاہیئے کہ جب یہ جانور کا ذبح کرنا ذبح ولد کے قائم مقام ہے تو قربانی کا جانور ایسا ہونا چاہیئے جو اپنی نوع میں احب ومرغوب ہو تاکہ اس کو احب الاشیاء کا عوض کسی درجہ میں تو کہا جا سکے نہ یہ کہ تمام جانوروں سے دلدر سڑے بتھا نہ بھون کا گوہ قربانی کے لئے تجویز کیا جائے۔ نعوذ باللہ بھلا غور تو کرو اگر ایک حاکم ضلع درخواست کرے کہ ہمارے لئے ایک گائے لاؤ تو کیا تم ایسا ہی جانور اُس کے سامنے پیش کرو گے جیسا قربانی میں تجویز کیا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں پھر شرم تو نہیں آتی کہ سب سے بڑے حاکم احکم الحکمین کے لئے ایسا دلدار ذبح کیا جاتا ہے یوں تاویل کرنے کو تو ہم تاویل کر لیں گے کہ حکام دنیا معمولی جانور سے راضی نہیں ہوتے اور اللہ میاں راضی ہو جاتے ہیں اس لئے یہاں ویسا اہتمام نہیں ہوتا جیسا حکام دنیا کے لئے کیا جاتا ہے مگر یہ تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اللہ تعالیٰ کے راضی ہو جانے کا یہی بدلہ ہے جو تم نے دیا افسوس ؎

لے گراں جاں خوار دیدستی مرا ❊ زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

اللہ تعالیٰ سستے مل گئے ہیں اس واسطے اُن کی قدر نہیں کی جاتی۔

اس پر مجھے بھانڈوں کا ایک قصہ یاد آیا کہ اُنہوں نے ایک دفعہ نقل کی تھی گو نقل تو خلاف ادب تھی مگر واقعی اہل زمانہ کی حالت کا فوٹو اتار دیا تھا۔ اُنہوں نے اصل میں شیعوں کی حالت کا نقشہ اُتارا تھا مگر آج کل اکثر مسلمانوں کی یہی حالت ہے اُنہوں نے نقل اس طرح کی کہ ایک شخص مجتہد بنا باقی لوگ اس کے معتقد بنے ان میں سے ایک شخص نے آکر خواب بیان کیا کہ حضور میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے مجتہد نے کہا بارک اللہ بیان کرو کہا حضور میں نے ایک میدان میں یہ دیکھا کہ دور سے ایک سواری آرہی ہے جس کے ساتھ بہت سے سوار ہیں اور بڑی فوج ہے اور جو

سواری سب سے آگے ہے اس کا لباس اور زین ولگام بہت ہی نفیس ہے جواہرات سے
مرصع ہے اور ان کے ساتھی بھی بہت شان وشوکت کا لباس پہنے ہوئے ہیں جب
وہ میرے سامنے سے گزرے تو میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ کون ہیں کہا امام حسین
ہیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور آپ سے مصافحہ کیا۔

بس یہ سنتے ہی مجتہد کھڑا ہو گیا اور اس شخص کو گلے لگا لیا کہ تو بڑا خوش نصیب
ہے اس نے کہا حضور ابھی خواب اور بھی باقی ہے پھر میں نے دوسری سواری دیکھی
اس کے ساتھ بھی بہت آدمی ہیں مگر پہلی جماعت سے کم میں نے پوچھا یہ کن کی سواری
ہے معلوم ہوا کہ امام حسن علیہ السلام ہیں میں جلدی سے آگے بڑھا اور ان سے بھی مصافحہ
کیا اس کے بعد ایک اور سواری دیکھی مگر اس کے ساتھ آدمی پہلے سے بھی کم ہیں اور سامان
بھی کچھ نہیں معمولی ہے جب وہ میرے قریب آئی میں نے دریافت کیا یہ کون ہیں معلوم
ہوا حضرت علی علیہ السلام ہیں میں نے ان سے بھی مصافحہ کیا پھر چوتھی سواری دیکھی
ان کے ساتھ بہت ہی کم جماعت ہے اور سامان بھی بہت گھٹیا ہے میں نے پوچھا یہ
کون ہیں معلوم ہوا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں میں نے آپ سے
بھی مصافحہ کیا جب وہ بھی گزر گئی تو سب سے آخر میں ایک اور سواری آئی جس کے
ساتھ کوئی نہ تھا اور ٹٹو بھی بہت ہی معمولی تھا جو بہت ہی آہستہ آہستہ چلتا تھا
زین ولگام بھی شکستہ پیوند زدہ تھا اور اس پر ایک بوڑھے میاں سوار تھے جن کا
لباس بھی معمولی سا تھا میں نے آگے بڑھ کر سوال کیا کہ حضرت آپ کون ہیں فرمایا
میں رب العالمین ہوں۔ میں نے حیرت سے کہا کہ حضور آپ ہی کا تو سب ظہور ہے
پھر آپ کی یہ کیا حالت ہے۔ فرمایا بھائی ہم نے مخلوق کو پیدا کیا تھا اول تو سب ہمارے
ساتھ تھے پھر ہم نے اپنے نبی کو پیدا کیا اور ان کے دو نواسے ہوئے جن میں سے ایک
کربلا میں شہید ہوئے بس میری خدائی کے زیادہ حصہ پر تو اس چھوٹے نواسے کا قبضہ ہو
گیا سب لوگ انہی کے نام کی نیاز کرتے اور اسی کی منتیں مانتے ہیں۔ جو اس سے بچے ان
کے زیادہ حصہ پر دوسرے بھائی نے قبضہ کر لیا وہ ان کے نام کی نیاز کرتے ہیں جو ان

سے بچے اُن پہ اُن کے باپ کا قبضہ ہوگیا وہ اسکی نذر و نیاز کرتے ہیں کچھ آدمی نبی کے ساتھ ہوگئے وہ اُن کے نام کا مولود و فاتحہ کرتے ہیں حتیٰ کہ میرے ساتھ کوئی بھی نہ رہا مجھے کوئی نہیں پوچھتا نہ میرے نام کی نذر ہے نہ نیاز ہے۔

خیر یہ نقل تو واہیات تھی اللہ تعالیٰ کی شان میں اس خواب کے گڑھنے والے نے بڑی گستاخی کی اگر اُن کو ساری مخلوق بھول جائے اور چھوڑ دے تو اُن کی سلطنت و شوکت و عظمت میں کیا کمی آسکتی ہے کچھ نہیں مگر واقعی ہماری حالت کا فوٹو صحیح اُتارا۔ ہماری حالت یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے نام کی نذر و نیاز کریں گے تو بڑے سامان کیے جائیں گے۔ اور اللہ نام کی جو چیز ہوگی وہ وہی ہوگی جو سب سے دلدر ہو۔ اکثر لوگ بڑے پیر صاحب کے نام کی نیاز کرتے ہیں جس میں کئی قسم کے کھانے اور مٹھائیاں ہوتی ہیں اور اس کے لئے بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ کوئی اُن لوگوں سے قسم لے کر پوچھے کہ اس طرح کبھی اللہ تعالیٰ کے لئے بھی نیاز دی ہے۔ ہرگز نہیں۔

ہمارے ماموں صاحب ایک قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک عورت نے گھر کے خرچ کے لئے کھیر پکائی تھی اتفاق سے ایک رکابی میں کتا منہ ڈال گیا تو عورت نے دوسرے برتن میں اسے لوٹ کر اپنے بچہ کو دیا کہ جا مسجد کے مُلا کو اللہ کے نام کی دے آ۔ نعوذ باللہ منہ۔ بچہ جو مُلا جی کے پاس کھیر لایا تو وہ اُس کے ہاتھ سے لیتے ہی فوراً کھانے لگے اور اُدھر ہی سے کھانا شروع کیا جدھر سے کتے نے کھائی تھی لڑکے نے گھبرا کر کہا میاں جی ادھر سے مت کھاؤ ادھر تو کتا منہ ڈال گیا تھا یہ سن کر مُلا جی کو غصہ آیا اور رکابی کو دیوار میں دے کر مارا رکابی کے پھوٹنے پر لڑکا رونے لگا مُلا جی نے کہا جلے مٹی ہی کی تو تھی روتا کیوں ہے لڑکے نے کہا میری ماں مارے گی مُلا جی نے کہا کیوں مارے گی کہنے لگا اس میں میرے چھوٹے بھائی کا گوہ اُٹھایا کرتی تھی اس واسطے مارے گی یہ سنکر تو مُلا جی لگے قے کرنے کہ جا مردود اول سے آخر تک مجھے گوہ ہی کھلایا۔ اس سے قیاس کر لیجئے کہ آج کل خدا کے نام پر کیسی چیزیں دی جاتی ہیں کیا خدا تعالیٰ کے انعامات کا یہی بدلہ ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں استغفر اللہ العظیم۔

صاحبو! اچھے تو فرمر کرنا چاہیئے۔ کم از کم قربانی کا جانور ایسا تو ہو جس کے ذبح کرنے سے دل پر چوٹ لگے۔

ہمارے حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدّ اللہ ظلّہ نے ایک مرتبہ قربانی کے لئے ایک گائے پالی تھی جس کو سال بھر تک دانہ کھلایا اور عصر کے بعد اپنے ساتھ اسے جنگل لے جاتے اور دوڑاتے تھے تاکہ بدن خوب کھلے اور فربہ ہو تو وہ ایسی فربہ اور تیار ہو گئی تھی کہ اس ارزانی کے زمانہ میں جبکہ اچھی خاصی گائے دس پندرہ کو ملتی تھی قصائی اسکی قیمت اسّی روپے دے رہے تھے مگر مولانا نے نہیں دی اور بقرعید کے موقع پر اس کو ذبح کر دیا سُنا ہے کہ مولانا کی آنکھوں میں اسوقت آنسو بھر رہے تھے۔

شبہ بے رحمی ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان بہت بیرحم ہیں گئو ہتیا کرتے ہیں یہ واقعہ اُن کے دندان شکن جواب ہے بھلا جس شخص کی آنکھ میں ذبح کے وقت آنسو بھرے ہوں وہ بیرحم ہے؟ وہ تو اعلیٰ درجہ کا رحمدل ہے مگر مسلمان کا یہی بڑا کمال ہے کہ باوجودیکہ ذبح کے وقت اس کے دل میں رقت ہے اور جانور کی صورت دیکھ کر دل پسیج رہا ہے پھر بھی خاموش کھڑا ہو کر حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مشغول ہے۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ذبح سے رنج ہوا تو ثواب کم ہوگا زیادہ ثواب تو اس میں ہے کہ خوشی کے ساتھ ذبح کرے تو یاد رکھو کہ رنج کی دو قسمیں ہیں ایک رنج طبعی ایک رنج عقلی۔ سو رنج طبعی منقص ثواب نہیں بلکہ مکمل ثواب ہے چنانچہ اولاد وغیرہ کے مرنے پر جو طبعی رنج ہوتا ہے اس پر ثواب کا وعدہ ہے۔ ہاں عقلی رنج منقص ثواب ہے سو عشاق کو عقلی رنج نہیں ہوا کرتا عشق کے آگے عقل بیچاری کی کیا چل سکتی ہے ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں برفروخت ۔ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اور فرماتے ہیں ؎

ے اسوقت حضرت قدس سرہٗ بقید حیات تھے ۱۲ ظ

آزمودم عقل دور اندیش را ÷ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

سو جس کا یہ مذاق ہو اس کے پاس ریخ عقل کب پھٹک سکتا ہے بہر حال قربانی میں ایسی گائے تو پیش کرے جیسی حاکم ضلع کے لئے پیش کیا کرتے ہیں ایسی گائے البتہ کسی قدر اپنی جان کا عوض ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری مضمون تھا قربانی کے متعلق سو دیکھئے ان عبادات میں کیسی عجیب ترتیب ہے کہ اول روزہ سے تخلیہ ہوا اور ساتھ ساتھ تراویح و تلاوت قرآن سے تحلیہ ہوا پھر دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہوئی اور دربار میں پہنچنے کے بعد نذر پیش کرنے کی اجازت ہوئی جس میں بعض عشاق نے تو جان بھی قربان کر دی ہے۔

عشاق کا حج

چنانچہ مالک بن دینار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سفر حج میں ایک نو عمر لڑکا ہمارے ساتھ تھا بدون زاد و توشہ کے میں نے پوچھا کہ صاحبزادے تم نے توشہ نہیں لیا تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

وفدت علی الکریم بغیر زاد ÷ من الحسنات والقلب السلیم

فان الزاد اقبح کل شئے ÷ اذا کان الوفود علی الکریم

اس وقت میں سمجھا کہ یہ معمولی لڑکا نہیں بلکہ مرد طریق ہے پھر احرام باندھنے کا وقت آیا تو سب نے لبیک کہا اس لڑکے نے نہ کہا اور حیران ہو کر سب کا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا صاحبزادہ لبیک کیوں نہیں کہتے کہا ڈرتا ہوں کہ میں لبیک کہوں اور وہاں سے جواب آئے:

لا لبیک ولا سعدیک وحجک مردود علیک

پھر حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں ہم سب گئے تو سب نے قربانی کی اس لڑکے نے آسمان کی طرف نظر کی اور کہا الٰہی سب اپنی ہمت کے موافق آپ کی جناب میں نذریں پیش کر رہے ہیں اور میرے پاس بجز اپنی جان کے کچھ نہیں اگر یہ نذر قبول ہو جائے تو زہے قسمت اور یہ کہہ کر چیخ مار کر جان بحق تسلیم ہوا۔

غیب سے آواز آئی کہ اس ولی کی قربانی کی بدولت سب کی قربانیاں قبول ہو گئیں

اور اس کے حج کی بدولت سب کا حج قبول ہو گیا سبحان اللہ، اللہ کے بندے کیسے کیسے ہوتے ہیں ۔

یہ واقعہ تو روض الریاحین یا کسی اور کتاب میں مذکور ہے اور ایک واقعہ زبانی سُنا ہوا ہے کہ ایک شخص جو آزاد وضع تھا حج کو جا رہا تھا ہاتھ میں ایک دف تھا اور گاتا بجاتا چلا جاتا تھا لوگ یہ سمجھے کہ کوئی مسخرہ ہے ۔ بعض لوگ وضع کے پابند ہیں مگر اُن کا دل بھی پائے بند ہے کہ میدان عشق میں ترقی نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں میں تکبر ہے جو سدِ راہ ہے اور بعض لوگ وضع سوز ہوتے ہیں اُن کا دل تکبر سے پاک ہوتا ہے بشرطیکہ وہ وضع سوز ہی ہوں شرع سوز نہ ہوں ۔ ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ شوخی علامت ہے رُوح کے زندہ اور نفس کے مردہ ہونے کی ۔ اور متانت علامت ہے نفس کے زندہ اور رُوح کے مردہ ہونے کی غرض وہ شخص وضع سوز تھا لوگ اسکو مسخرہ سمجھتے تھے جب مکہ معظمہ پہنچا اور معلم کے ساتھ سب کے سب طواف کعبہ کو چلے اور دروازہ کے قریب پہنچ کر بیت اللہ پر نظر پڑی اور معلم نے کہا ھذا بیت اللہ تو اس شخص پر وجد طاری ہو گیا اور بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا ؎

چو رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ÷ کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

یہ کہا اور گر کر وہیں جان دیدی بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے ہی رب البیت کے پاس پہنچ گیا گو اس شخص نے ظاہر میں نہ طواف کیا نہ حج کیا مگر یاد رکھئے کہ عشاق کا درجہ قرب میں عمال سے بڑھا ہوا ہے گو مناصب عمال کے زیادہ ہیں ۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی تھا اختیارات تو حسن میمندی کے زیادہ تھے کیونکہ وہ وزیر تھا مگر قرب سلطان ایاز کو زیادہ تھا بعض وقت سلطان سے بات کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی بجز ایاز کے ، اسی طرح بعض اللہ کے بندے ایسے ہیں جو کسی خدمت پر مامور نہیں نہ تکوینی پر نہ تشریعی پر نہ قطب ہیں نہ غوث ہیں نہ مدرس ہیں نہ واعظ مگر خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں ۔ غرض بعض لوگ حقیقتاً بھی جان فدا کر دیتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس لئے انہوں نے جانوروں کی جان کو ہماری

جان کا عوض بنا دیا۔

صورۃ حج اور حج کے متعلق یہ تو اوپر معلوم ہو گیا کہ روح حج کی وصول الی اللہ ہے لیکن صورت حج کو اگر دیکھا جائے تو اس صورت کا بھی سارا قصہ عاشقوں کا سا قصہ ہے چنانچہ احرام سے حج شروع ہوتا ہے اسی وقت سے یہ صورت ہو جاتی ہے کہ ؎

لنگکے زیر و لنگکے بالا ٭ نے غم دزد نے غم کالا

سر کھلا ہوا ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتے گویا اسی وقت سے مجنونوں کی صورت اختیار کر لی اور کچھ پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہے گا کہ اس نے کیا صورت بنائی ہے ؎

نہ ساز د عشق را کنج سلامت ٭ خوشا رسوائی کوئے ملامت

اسوقت اس رسوائی ہی میں عشاق کو مزا آتا ہے ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

واقعی احرام کی صورت بالکل بندگانہ و غلامانہ صورت ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ٭ دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

اسوقت سب لوگ ایک حال میں ہوتے ہیں امیر بھی غریب بھی سلطان بھی رعایا بھی عاشق بھی اور غیر عاشق بھی کسی کے لئے کوئی خاص امتیاز نہیں ہوتا کیونکہ عشق کے لئے امتیاز سدِ راہ ہے امتیاز سے شہرت ہوتی ہے اور شہرت بہت سی بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم است ٭ بند ایں از بند آہن کے کم است

خویش را رنجور ساز و زار زار ٭ تا ترا بیرون کنند از اشتہار

اسی واسطے عشاق اپنے کو گمنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ شہرت سے لوگ اُن کے دُرپے نہ ہوں اور محبوب کے درمیان اور ان کے درمیان حائل نہ ہوں تو حق تعالیٰ نے احرام میں سب کی صورت یکساں بنا دی تاکہ عشاق و غیر عشاق میں امتیاز نہ رہے کیونکہ عشاق تو احرام میں عاشقانہ صورت بناتے ہیں ان سے تو اسوقت لباس وغیرہ کا

اہتمام نہ ہو سکتا پھر اگر تنہا وہی اس صورت میں ہوتے تو ان کا بھانڈا پھوٹتا ان کا عشق طشت از بام ہو جاتا اس لئے محبوب نے ان کی پردہ پوشی کے لئے سب کو عاشقانہ صورت بنانے کا حکم فرما دیا تاکہ عشاق کا عشق مخفی رہے ان کو امتیاز نہ ہو اور امتیاز سے شہرت نہ ہو اور شہرت سے عجب و پندار پیدا نہ ہو۔

نیز شہرت میں دنیا کے بھی خطرے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

خشمہاؤ چشمہاؤ رشکہا ✿ برسرت ریزد چو آب از مشکہا

اصل شہرت یہی کہ سب لوگ درپے ہوتے ہیں کوئی ان پر اعتراض کرتا ہے کوئی طعن کرتا ہے کوئی حسد کرتا ہے اور گمنام آدمی ان بلاؤں سے محفوظ ہے چنانچہ جو لوگ دنیوی وجاہت رکھتے ہیں وہ دنیا کے قصوں میں بہت پھنسائے جاتے ہیں۔ آج حکام کی خوشامد ہے کل کو فوج کی بھرتی کا انتظام ان کے سپرد ہے اور اگر کہیں بدامنی ہو جائے تو سب سے پہلے اُن کے مچلکے لئے جاتے ہیں غریبوں کو کون پوچھتا ہے اس لئے غریبوں کی زندگی نہایت بے فکر زندگی ہے۔

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی فقر و فاقہ کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ تم کو یہ دولت مفت مل گئی ہے اس لئے قدر نہیں مجھ سے قدر پوچھو کہ سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ خریدا ہے تو حق تعالیٰ نے احرام میں سب کی صورت یکساں بنا کر عشاق کو شہرت کے تمام خطرات سے بچا دیا دینی خطرات سے بھی اور دنیوی خطرات سے بھی۔

بس ذرا سا امتیاز جائز رکھا گیا ہے کہ کوئی گاڑھے کی لنگی چادر پہن لے اور کوئی لٹھے کی یا اس سے بھی قیمتی کپڑے کی کوئی کمبل اوڑھ لے کوئی شال اوڑھ لے۔

اس میں ایک تو یہی حکمت ہے کہ امتیاز طبعی خاصہ انسان کا ہے اور طبعی جذبات کو بالکل فنا کرنے سے تکلیف ہوتی ہے سو حق تعالیٰ تکلیف دینا نہیں چاہتے دوسرے اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ سائلین کو اطلاع ہو جائے کہ یہ دوشالہ اوڑھنے والا مالدار ہے یہ خیرات دے سکتا ہے ان حکمتوں سے کسی قدر امتیاز جائز رکھا گیا ورنہ اصل وضع میں سب مساوی ہیں اور وضع میں زیادہ دخل لباس کی ہیئت ہی کو ہے مادہ کو نہیں

پھر سب کو حکم ہے کہ سر کھول دو تاکہ سب کا حال معلوم ہو جائے کہ ان کا سر کیسا ہے بعض لوگ گنجے ہوتے ہیں اس وقت سر کھولتے ہوئے اُنکی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض احرام کے وقت تو یہ صورت بنائی جس سے سراپا نیازمندی اور عبدیت کا ظہور ہوتا ہے۔

پھر جب دربار میں پہنچے اور طواف شروع ہوا جس میں رمل بھی مشروع ہے تو چال بھی ڈھنگ کی نہ رہی حالانکہ یہی حاضری دربار کا وقت تھا ادب و وقار کا مگر نہیں یہی وقت ہے فنا وقار کا اور یہاں کا یہی ادب ہے ؎

چو سلطان عزت علم برکشد ⁂ جہاں سر بہ جیب عدم درکشد

دربار حق میں جب عظمت حق کا علم بلند ہوتا ہے وہاں کسی کی عزت کیونکر باقی رہ سکتی ہے بلکہ سب کو اپنی عزت و وقار کو فنا کر دینا چاہئے اور اگر کوئی اس ہیئت کو دیکھ کر انہیں دیوانہ کہے تو وہ یوں کہتے ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد ⁂ مر عسس را دید و در خانہ نہ شد

اور یوں کہتے ہیں ؎

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم ⁂ مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

واقعی طواف میں رمل کی ہیئت بتلاتی ہے کہ یہاں کوئی بڑا دربار ہے جس کے سامنے سب کا وقار مٹ گیا سب کی عزت خاک میں مل گئی سب کے سب مجنونوں کی طرح شانے ہلاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں یہ تو حج کی صورت تھی۔

روح قربانی اب قربانی کی ہیئت دیکھئے کہ وہ بالکل نذر کی صورت ہے جیسے کسی کے سامنے نذر پیش کر رہے ہوں کیونکہ کھانے پینے کے لئے قربانی ہوتی تو ہر شخص کو ایک سے زیادہ قربانی کی اجازت نہ ہوتی کیونکہ اس سے زیادہ کھانے کے کام میں نہیں آسکتی بلکہ ایک ایک قربانی بھی کریں تب بھی بہت سا گوشت بچ رہتا ہے مگر باینہمہ ایک شخص ہزار بکرے ذبح کرے تو شریعت اس کو منع نہیں کرتی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی روح نذر ہے۔

یہاں سے ان ملحدوں کا منہ بند کر دیا گیا جو یوں کہتے ہیں کہ اس قدر جانور دلہ

کے ذبح میں فضول رقم ضائع کی جاتی ہے یہ رقم رفاہِ عام میں خرچ کرنا چاہیئے میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص جارج پنجم کے سامنے دس لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کرے تو وہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ روپیہ رفاہِ عام میں خرچ کرنا چاہیئے بلکہ وہاں تو تعریف ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے بڑی ہمت سے کام لیا کہ دس لاکھ روپے نذرانہ میں پیش کئے افسوس خدا کے سامنے کوئی نذر پیش کرے تو اسکی رقم کو فضول ضائع کرنا کہا جاتا ہے میں بقسم کہتا ہوں کہ آج کل جو بعض مسلمانوں میں عقل کی کمی ہے اور وہ شریعت کے احکام پہ اشکال کرتے ہیں تو اس کا بڑا سبب خدا سے تعلق کی کمی ہے اگر ان کو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا تو ان کی عقلیں درست ہو جاتیں۔ ان لوگوں کو رقم ضائع ہونے کا شبہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قربانی کی غرض گوشت کھانا سمجھا حالانکہ اسکی یہ غرض نہیں بلکہ اس کی غایت صرف خدا کے نام پہ جان فدا کرنا ہے مکہ معظمہ میں جا کر اس کا نمونہ نظر آتا ہے کہ قربانی کی کوئی حد ہی نہیں بالکل مقتل نظر آتا ہے کہ ایک جگہ ہزاروں لاکھوں جانیں خدا تعالیٰ کے نام پر قربان کی جاتی ہیں۔

اب ہمارے ریفارمر وہاں بھی رائے دیتے ہیں کہ سلطان کو ان جانوروں کی کھالیں کھینچنا چاہیئے اور ان سے رفاہِ عام کا کام نکالنا چاہیئے حالانکہ رئیس العقلاء سید الحکماء افضل الانبیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الحج العج والثج۔ کہ حج نام ہے شور برپا کرنے کا جو حرکت ہے دیوانوں کی مراد اس سے بلند آواز سے لبیک کہنا ہے اور نیز حج نام ہے اس کے نام پہ خون بہانے کا جو نذرانہ دربار ہے حضور نے فقط جان لینا اور خون بہانا فرمایا ہے کھانے تک کا بھی تو ذکر نہیں فرمایا بس معلوم ہوا کہ اصل روح قربانی کی نذر الی اللہ ہے اور حج کی روح دیوانہ شدن ہے۔ یہ اسرار ہیں اور یہ راز ہیں افعال حج کے اور یہ تو وہ ہیں جہاں تک ہم جیسوں کی عقلیں پہنچ گئیں اور جو حکماء امت ہیں وہ تو اور زیادہ بیان کر سکتے ہیں۔ میں اسی لئے کہا کرتا ہوں کہ علماء اور طلبہ کو چھیڑو نہیں ان کے تھیلے میں سب کچھ ہے۔ یہ اسرار کو بھی سب سے زیادہ جانتے ہیں مگر ے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ؛ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اور یہ جتنا کچھ بھی میں نے بیان کیا ہے رغبت سے بیان نہیں کیا کیونکہ علوم مکاشفہ سے مجھے زیادہ رغبت نہیں مجھے زیادہ رغبت علوم معاملہ سے ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم ہیں مگر بعض طبائع کی خاطر سے یہ اسرار بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کسی کے یہاں احباب کی دعوت آموں کی ہو تو وہ پال کے آم بھی پیش کرتا ہے اور ڈال کے بھی۔ تاکہ جس کو جس سے رغبت ہو ویسے ہی کھالے کسی کو کھٹے آم پسند ہوتے ہیں کسی کو میٹھے اور کسی کو ایسے پسند ہوتے ہیں جو کچھ کھٹے ہوں کچھ میٹھے اس لئے میں نے بھی اسوقت ہر قسم کے مضامین جمع کر دیئے ہیں اب میں حج اور قربانی کا مضمون ختم کرتا ہوں۔

مضمون حج کا نام الحج ہے اور مضمون قربانی کا نام الثج ہے۔ اور یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہوئے ہیں اس لئے ہم دوسرے نام کیوں رکھیں حضور تو اگر ہمارے بیٹوں کے اور ہمارے نام بھی رکھ دیتے تو ہم اس کو اپنی سعادت سمجھتے اور ہرگز خود کوئی نام نہ رکھتے۔

امساکِ باراں (تیسرا مضمون)

اب میں تیسرے مضمون کا بیان شروع کرتا ہوں۔ اور ارادہ یہ تھا کہ تیسرے مضمون کو لمبا بیان کروں گا کیونکہ اس کی ضرورت دُور تک ہے تو اس کا بیان دیر تک ہونا مناسب تھا مگر بعض دفعہ تھوڑی بارش بھی کافی ہو جاتی ہے اس لئے اس کو مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ وقت کم ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ آج کل ہماری جو حالت ہے ظاہر ہے کہ امساکِ باراں ہو رہا ہے جس سے لوگ پریشان ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ بارش کی صرف تمنا کرتے ہیں اس کی اصلی تدبیر نہیں کرتے اصل علاج یہ ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

انما التدبیر تبدیل المزاج

کہ مزاج کو بدلنا چاہیے مگر اس تدبیر سے کوئی کام نہیں لیتا ہم لوگ صرف تمنّا کرتے ہیں کام نہیں کرتے اور نری تمنا سے کیا ہوتا ہے ؎

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال ٭ صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

یہ تو گریہ کو بھی ناکافی کہتا ہے اور ہمارے پاس تو گریہ بھی نہیں۔

رفع قحط کی بے ڈھنگی تدبیریں

آج کل لوگوں نے رفع قحط کے لئے ایک آسان نسخہ یاد کر لیا ہے کہ گھر گھر سے گیہوں جمع کرتے ہیں کہ کھانا پکوا کر تقسیم کریں گے مگر اس سے کیا ہوتا ہے اول تو اس کو رفع قحط میں دخل کیا؟ اگر کہو کہ یہ صدقہ ہے۔ والصدقۃ تطفی غضب الرب، صدقہ خدا تعالیٰ کے غصہ کو فرو کرتا ہے تو صدقہ کی اور بہت صورتیں ہیں جن میں سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہر شخص بجائے خود خفیہ طور پر صدقہ کرے دوسرے صدقہ کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا تو ایک مستحب فعل ہے واجب نہیں اور ظاہر ہے کہ مستحب سے مقدم واجبات کا ادا کرنا ہے پس تم سے جو لوگوں کی موروثی زمین دبا رکھی ہے لڑکیوں عورتوں کی میراث دبا رکھی ہے شریکوں کا حق مار رکھا ہے پہلے اس سے توبہ کرو اور موروثی وغیرہ کو چھوڑ دو۔ پھر مستحبات کے درپے ہونا۔ تیسرے یہ بھی تو دیکھو کہ یہ گیہوں جمع کر کے جو کھانا پکتا ہے تو اس کو کھاتا کون ہے غریبوں کو تو بہت کم پہنچتا ہے زیادہ تر حضرات مہتممین اور ان کے متعلقین کھاتے ہیں۔ غرباء کا تو محض بہانہ ہے۔

چوتھے یہ کام حدود شرع سے تجاوز کر کے کیا جاتا ہے کیونکہ عام حالت یہ ہے کہ خوشی کے ساتھ چندہ بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر لوگ شرم یا دباؤ سے شریک ہوتے ہیں پھر ایسے صدقہ سے کیا نفع جس میں حدود شرع کی بھی رعایت نہیں افسوس ہم لوگ دین کا کام سمجھ کر بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو بھی دنیا کے طریقہ پر کرتے ہیں۔ اسی کو ایک دردمند کہتا ہے ؎

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ایک دوسرا دردمند کہتا ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب ٭ خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

اس درد مند کو نعوذ باللہ حضور پر اعتراض مقصود نہیں کہ آپ خواب میں ہیں اور عالم خراب ہو رہا ہے بلکہ محض محبت و عشق میں حضور کو یاد کر کے اظہار حسرت کر رہے ہیں کہ ہائے وہ آنکھیں کہاں گئیں جن سے رونق دینداری تھی اور عالم میں انوار عبادت پھیل رہے تھے۔ جیسا کہ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

زمہجوری برآمد جانِ عالم	ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعالمینی	ز محروماں چرا فارغ نشینی
ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز	چو نرگس خواب چند از خواب برخیز
برون آور سر از بُرد یمانی	کہ روئے تست صبح زندگانی
شب اندوہِ مارا روز گرداں	ز رویت روزِ ما فیروز گرداں
تو ابر رحمتی آں بہ کہ گاہے	کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہے

اس وقت حضرت مولانا پر عجیب حالت طاری تھی مگر غایت ضبط سے کام لیا حاضرین تڑپ رہے تھے ۱۲

غرض اس وقت دردمندانِ شریعت کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار حضور کے وجود باجود کو یاد کر کے روتے ہیں کہ ہائے اُمّت کیسا انقلاب ہو گیا مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے ان کا کوئی کام بھی تو ڈھنگ کا نہیں رہا۔

اب اگر ان کو قحط سالی میں اس طرح اناج جمع کرنے سے روکو تو جاہل اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو مولوی لوگ اللہ واسطے اناج دینے سے منع کرتے ہیں۔ اے بھائی اللہ واسطے اناج دینے سے کون منع کرتا ہے بلکہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر صدقہ خیرات کے لئے طریقہ اور ڈھنگ کی ضرورت نہیں تو پھر حج کے لئے بھی اس کے خاص طریقہ کی مثلاً بیت اللہ جانے کی ضرورت نہیں بس بمبئی ہی میں حج کر لیا کرو اگر کہو کہ بمبئی تو حج کا موقع نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اناج جمع کرنے کا بھی وہ موقع نہیں جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

بعض لوگ گاؤں میں بھی ... ہیں اور جو منع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ اسکی کیا وجہ کہ قصبہ ... میں تو ... جائز ہو اور گاؤں میں ناجائز ہو۔ تو میں کہا کرتا ہوں

کہ اسکی کیا وجہ کہ جج مکہ میں تو جائز ہو بمبئی میں جائز نہ ہو وہ کہتے ہیں بمبئی تو جج کی جگہ نہیں میں کہتا ہوں کہ اسی طرح گاؤں بھی جمعہ کا محل نہیں۔ غرض اس وقت امساک باراں کی مصیبت مخلوق کو پریشان کر رہی ہے بعض جگہ سے ہیضہ کی خبریں آ رہی ہیں کوئی جگہ مصیبت سے خالی نہیں سمندر بھی بلا سے خالی نہیں دیکھو کہ جنگ کا زمانہ تھا سمندر میں ناکہ بندی تھی ۱۲ جامع) بس وہ حال ہے۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ۵

کسی جگہ آج کل چین و آرام نہیں بس وہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۵

گر گریزی بر امید راحتے ٭ ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

اور یہ سب بلائیں ہماری شامت اعمال آ رہی ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوعن کثیر ط

اللہ اللہ یہ سزا تو ہمارے بعض اعمال کی ہے اور بہت سی خطاؤں کو تو وہ معاف ہی فرماتے رہتے ہیں۔ اگر ساری خطاؤں پر گرفت ہوا کرتی تو پھر کہاں ٹھکانا تھا۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبو ما ترک علی ظھرھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمی ط فاذا جاء اجلھم فان اللہ کان بعبادہ بصیرا ط؛

اصل علاج

پس ہم کو اس کا علاج کرنا چاہئے اور وہ علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال سیئہ کو حسنات سے بدلا جائے اور گزشتہ گناہوں سے استغفار کیا جائے واللہ سوا اس کے ان بلاؤں کا کچھ علاج نہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست ٭ جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلوت گاہِ حق سے مراد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے تعلق جوڑا جائے جس کے طریقہ کا جزو اعظم استغفار ہی ہے جس میں علاوہ فلاح آخرت کے فلاح دنیا بھی ہے۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں،

فقلت استغفروا ربکم انه کان غفاراً ط

یہ تو فلاح آخرت تھی کہ حق تعالیٰ استغفار کی برکت سے تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے اور تمہارے اوپر نظر عنایت فرمائیں گے اور اپنے غضب وسخط کو رضاؤ رحمت سے بدل دیں گے آگے فرماتے ہیں۔

یرسل السمآء علیکم مدراراً ویمددکم باموال و بنین ویجعل لکم جنّٰت ویجعل لکم انهاراً؛

کہ تم پر استغفار کی برکت سے موسلا دھار بارش نازل ہوگی اور اموال و اولاد میں ترقی ہوگی اور باغات و انہاریں افزونی ہوگی۔

اور ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ویٰقوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیه یرسل السماء علیکم مدراراً ویزدکم قوة الیٰ قوتکم ولا تتولوا مجرمین ٥

اور حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں۔

واستغفروا ربکم ثم توبوا الیه ان ربی رحیم ودود ط : اس میں بشارت ہے کہ استغفار و توبہ کی بدولت حق تعالیٰ کی رحمت ومودت تمہارے ساتھ ہوگی۔

واللہ یہ وہ چیز ہے کہ اگر بارش بھی نہ ہو تو جس چیز کے لئے بارش کی ضرورت ہے اس کی بارش شروع ہو جاتی ہے کیونکہ روح بارش کی جمعیت قلب ہے۔ بارش سے فوراً تو غلہ نہیں پیدا ہو جاتا غلہ تو بعد میں پیدا ہوتا ہے جس میں ہنوز بہت سے خطرات کا اندیشہ ہے چنانچہ بعض دفعہ بارش کے بعد بھی کسی آفت کی وجہ سے غلہ

نہیں پیدا ہوتا لیکن پھر بھی لوگوں کو بارش کی تمنا ہوتی ہے کیونکہ طبعاً بارش سے جمعیتِ اطمینانِ قلب ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ بارش کی روح جمعیتِ قلب ہے۔ اور میں دعوے سے کہتا ہوں اور یہ دعویٰ خدا تعالیٰ کے ارشاد کے بھروسہ پر ہے کہ استغفار کے بعد یہ دولت معاً حاصل ہو جائے گی گو بارش نہ بھی ہو اور یہ وہ دولت ہے جس کے سامنے بارش بھی کوئی چیز نہیں اس وقت وہ حال نصیب ہوگا کہ انسان ہر حال میں راحت و اطمینان سے رہے گا مصیبت کی تلخی اس کے لئے لذیذ ہو جائے گی جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من ٭ دل فدائے یار دل رنجانِ من

غرض استغفار و توبہ کی برکت سے آپ کا وہ حال ہو جائے گا جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے قحط کے زمانہ میں بغداد کے اندر ایک غلام کو دیکھا جو بڑا موٹا تازہ ہو رہا تھا اور بڑی بیفکری کے ساتھ اچھلتا کودتا جا رہا تھا میں نے اس سے کہا اے شخص تو بڑا بے فکر ہے حالانکہ مخلوق قحط سے پریشان ہے تیری اس مستی اور بیفکری کا کیا سبب ہے؟

کہا مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے میں تو ایک ایسے شخص کا غلام ہوں جس کے پاس ایک گاؤں ہے جس کی وافر آمدنی ہے اور میرا کھانا کپڑا اس کے ذمہ ہے اب چاہے قحط ہو یا سرسبزی میں بے فکر ہوں کہ مجھے تو آقا ہر حال میں کھانے کو دے گا مجھے اس تحقیق کی کیا ضرورت ہے کہ روٹی کا آج کیا بھاؤ ہے اور کل کیا نرخ تھا یہ جواب سن کر بزرگ کو تنبہ ہوا اور نفس سے کہا کہ اے نفس افسوس تجھ کو اپنے آقا پر اتنا بھی اعتماد نہیں جتنا اس غلام کو ایک عاجز و محتاج آقا پر ہے اس کے آقا کے پاس تو ایک ہی گاؤں ہے اور تیرے آقا کی یہ شان ہے۔

وللہ خزائن السموات والارض

غرض اس غلام کی حالت دیکھ کر ان بزرگ کا توکل درست ہو گیا اور متوکلین سے زیادہ بے فکر کوئی نہیں ہو سکتا۔

حضرت بہلول دانا کو کسی نے دیکھا کہ قبرستان میں ایک تودہ خاک پر بیٹھے ہوئے

ہی کہا اے بہلول روٹی بہت گراں ہوگئی تمہیں کچھ خبر بھی ہے فرمایا مجھے اسکی خبر رکھنے کی کیا ضرورت ہے خدا تعالیٰ نے مجھ سے عبادت کا مطالبہ کیا ہے اور رزق کا وعدہ کیا ہے۔ وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ پس میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں مجھے رزق کی فکر سے کیا واسطہ وہ خود اپنے وعدہ کو پورا کریں گے حضرت اسی طرح خدا تعالیٰ سے جب آپ تعلق جوڑلیں گے اور توبہ واستغفار سے خدا تعالیٰ کو راضی کرلیں گے تو آپ کے قلب پر یہ بارش نازل ہوگی جس کے سامنے دنیا کی سب بارشیں ہیچ ہیں اسوقت آپ کے دل پر آب غیب کی بارش ہوگی جس کا اثر چہرہ پر بھی نمایاں ہوگا کہ بجائے رنج وغم کے فرحت وسرور کے آثار پیدا ہوں گے ؎

غیب را ابرے وآبے دیگرست ✲ آسمانے آفتابے دیگرست

اور یہ وہ آب غیب ہے جو کہ آب حیات ہے جس سے دائمی حیات نصیب ہوتی ہے جس کی نسبت عارف فرماتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ✲ ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

غرض اعمال صالحہ وتوبہ استغفار سے ظاہری بارش بھی ہوگی اور باطنی بارش بھی ہوگی اس لئے دل وجان سے کوشش کرنا چاہیئے اگر ظاہری بارش میں تاخیر بھی ہوئی اور یہ اگر محض بطور فرض وتقدیر کے ہے ورنہ دل سے توبہ واستغفار کیا جائے تو ہرگز تاخیر نہ ہوگی لیکن فرض کرلو اگر تاخیر بھی ہوئی تو باطنی بارش تو فوراً ہی شروع ہوجائے گی پھر آپ کو نہ قحط سے تکلیف ہوگی نہ گرانی غلہ سے پریشانی ہوگی کیونکہ ؎

بدریا نہ خواہد شدن بط غریق ✲ سمندر چہ داند عذاب الحریق

آپ کے اندر غیبی سمندر موجزن ہوگا پھر بھوک اور پیاس کب پاس آسکتی ہے پس توبہ واستغفار کا اہتمام کرو اور اعمال صالحہ کی فکر کرو۔

غفلت اور نماز استسقاء بعض احباب نے آج کل مجھے مشورہ دیا تھا کہ نماز استسقاء پڑھی جائے مگر مجھے ڈر لگتا ہے کیونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک معاصی میں گرفتار ہیں اور دل پر بھی قحط کا کچھ

زیادہ اثر نہیں کیونکہ ہر شخص اسی مستی میں اب بھی گرفتار ہے جس میں قحط سے پہلے گرفتار تھا کسی نے اپنی حالت کو نہیں بدلا نہ کسی کے دل پر خوف وخشیت کا غلبہ ہے نہ کچھ ندامت توجہ الی اللہ کا اثر ہے الاماشاء اللہ، اس بے فکری اور بے توجہی کی حالت میں اگر نماز استسقاء پڑھی اور وہی غفلت و مستی ہوئی تو اور زیادہ عتاب کا اندیشہ ہے۔

میں نے کانپور میں سنا تھا کہ قحط کی خبریں سن کر وہاں کے صاحب کلکٹر نے ارادہ کیا تھا کہ زمینداروں پر سے لگان کم کر دیں مگر ایک دفعہ وہ رات کو گشت کے لئے نکلے تو دیکھا شہر میں بازاروں کے بالاخانوں سے گانے بجانے کی خوب آوازیں آرہی ہیں یہ حالت دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لگان معاف نہ کیا اور کہا کہ مخلوق قحط سے کچھ پریشان نہیں ہے بلکہ لوگ بہت آرام سے ہیں ناچ رنگ ہو رہا ہے۔ تو حضرت ہماری حالت اب بھی ایسی ہے جس کو دیکھ کر ایک ادنیٰ حاکم کو بھی غصہ آتا ہے جس کو دل کی بھی کچھ خبر نہیں تو بتلاؤ جس احکم الحکمین کو ہمارے قلوب کی سنگدلی معلوم ہے جو ہمارے دلوں کی شرارتوں سے واقف ہے اس کو اگر غصہ آئے تو کیا تعجب ہے ؟

اور سب سے بڑا غضب یہ ہے کہ ہم کو غضب الٰہی کا بھی احساس نہیں پھر کیونکر نماز استسقاء کے لئے ہمت کی جائے ہاں اگر ہماری صورت عاجزوں کی سی ہو جائے اور دل میں خشوع خضوع پیدا ہو جائے تو اس تدبیر سے بہتر بارش کے لئے کوئی تدبیر نہیں مگر پہلے اس کے قابل تو ہو جاؤ اور اس کا وہی طریقہ ہے جو میں نے بتلایا کہ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ حقوق العباد کو ادا کرو اور جو ادا نہ ہو سکیں تو معافی چاہ لو اور آئندہ کے لئے اعمال صالحہ کا اہتمام کرو اب میں اس مضمون کو بھی ختم کرتا ہوں اور اس کا نام الالحاح رکھتا ہوں جس کے معنی ہیں الحاف کے یہ نام اس مضمون کے مناسب ہے کیونکہ توبہ و استغفار میں بھی الحاف یعنی الحاح فی السوال والدعاء اور درخواست معافی کی ہے۔

تفسیر آیت | اب میں خاتمہ کی مختصر تفسیر بیان کرتا ہوں میں نے یہ آیت تلاوت

کی تھی۔ یسئلہ من فی السموات والارض کل یوم ھو فی شان ٥

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرتے ہیں آسمانوں والے اور زمین والے اور وہ ہر وقت ایک شان میں ہے یعنی ہر وقت عالم میں مختلف قسم کے تصرفات کرتا رہتا ہے کسی کو حیات بخشتا ہے کسی کو موت دیتا ہے کسی کو خوشی کسی کو غم کسی کو عزت کسی کو ذلت کسی کو پستی کسی کو رفعت۔

یہاں پر لفظ سوال عام ہے خواہ بلسان قال ہو یا بلسان حال ہو یہ اس واسطے میں نے کہا کہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مخلوق میں تو بعض لوگ ملحد بھی ہیں جو خدا ہی کو نہیں مانتے اور بعض مانتے تو ہیں مگر زبان سے کبھی خدا سے کچھ نہیں مانگتے تو سمجھ لو کہ ملحدین متکبرین گو زبان قال سے سوال نہ کریں مگر زبانِ حال سے سب سوال کرتے ہیں کیونکہ سوال بزبان حال کی دو قسمیں ہیں ایک بقصد ایک بلا قصد، مریض حکیم کے پاس اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ زبانِ حال سے سوال ہے معالجہ کا گو زبان قال سے کچھ نہیں کہتا یہ تو سوال بزبان حال بقصد ہے اور بلا قصد کی صورت ہے کہ ایک بیمار پڑا ہوا چیخ رہا ہے اسکی حالت بتلا رہی ہے کہ وہ معالجہ کا طالب ہے گو وہ قصد سوال بھی نہ کرتا ہو غرض کوئی زبان قال سے سوال کرتا ہے اور کوئی زبانِ حال سے بقصد اور کوئی زبان حال سے بلا قصد۔

شریعت میں بھی زبانِ حال سے قصداً سوال کرنے کی ایک نظیر موجود ہے حدیث میں ہے۔

من شغلہ القرآن عن ذکری ومسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین:

جو شخص قرآن میں اس درجہ مشغول ہو کہ اُسے ذکر دعا کی بھی فرصت نہ ہو یا دعا کی طرف التفات نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کو سائلین سے زیادہ عطا فرماتے ہیں۔ کیونکہ تلاوت میں مشغول ہونا یہ بھی سوال بزبان حال قصداً ہے اور بلا قصد میں سب شامل ہیں جمادات بھی اور نباتات بھی اور ملحدین ومتکبرین بھی کیونکہ سب کی حالت حدوث

امکان بتلا رہی ہے کہ یہ کسی بہت بڑی ہستی کے محتاج ہیں جس کے قبضہ میں سب کا وجود وبقاء ہے چنانچہ ہر ملحد و متکبر کی حالت دیکھ لی جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ احتیاج میں سر سے پیر تک بندھا ہوا ہے جب سوال کو عام لے لیا گیا کہ خواہ بزبان قال ہو یا بزبان حال اور بقصد ہو یا بلا قصد تو اب من فی السموات والارض میں لفظ من اپنے عموم پر ہے خاص کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ لفظ من میں ذوی العقول کی تغلیب ہے غیر ذوی العقول پر کہ ذوی العقول کے لفظ میں غیر ذوی العقول کو بھی شامل کر لیا گیا اور اگر اہل تحقیق کا قول لے لیا جائے تو پھر تغلیب کی بھی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ان کے نزدیک جمادات ونباتات وغیرہ سب ذوی العقول ہیں غیر ذوی العقول نہیں گو ان کی عقل اس درجہ نہ ہو جو تکلیف بالاحکام کے لئے کافی ہو مگر معرفت حق کے لئے ضرور کافی ہے، چنانچہ حیوانات وجمادات ونباتات سب کے سب خدا کو پہچانتے ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء تک کو پہچانتے ہیں۔

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لغت سب پر حاکم ہے محققین پر بھی اور غیر محققین پر بھی کیونکہ قرآن کا نزول لغت پر ہوا ہے نہ کہ محققین کی تحقیقات پر اور لغت میں لفظ من ان ذوی العقول کے لئے خاص ہے جو ظاہر میں ذوی العقول ہیں تو بیشک تغلیب کا ماننا ضروری ہو گا اور یہی صحیح ہے۔

لیکن اب یہ سوال ہو گا کہ پھر تغلیب میں نکتہ کیا ہے سو اس میں نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے کہ اس میں ذوی العقول کو تنبیہ ہے کہ خدا سے مانگنا اصل میں ذوی العقول کا کام ہے اور جو تمہارا کام تھا اس میں غیر ذوی العقول بھی تمہارے شریک ہیں پھر تمہارا خدا سے سوال نہ کرنا بڑی حماقت ہے آخر تم خدا کو چھوڑ کر اور کس سے سوال کرو گے اور بتلاؤ کہ خدا سے سوال نہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟

کسی سے سوال نہ کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی ہو یا اس میں شفقت ورحم نہ ہو یا سخاوت نہ ہو اور جس میں یہ سب باتیں موجود ہوں کہ اس کے خزانے بھی بے انتہا ہوں شفقت ورحم بھی کامل درجہ کا ہو سخاوت بھی اعلیٰ درجہ

کی ہو اس سے سوال نہ کرنا تو بڑا غضب ہے پس خدا تعالیٰ سے ضرور سوال کرنا چاہیے۔
شاید آپ یہاں ایک بات کہیں وہ یہ کہ ہم نے بعض دفعہ سوال کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں مگر مطلوب نہیں ملتا سو اس کا ایک تو جواب یہ ہے کہ آپ نے سوال کی طرح سوال ہی نہیں کیا خدا تعالیٰ سے اس طرح مانگو جس طرح کسی دنیا کے بادشاہ سے مانگا کرتے ہیں کیا بادشاہ سے مانگنے کے وقت آپکی وہی صورت ہوتی ہے جو دعا کے وقت ہوتی ہے ہرگز نہیں ایک ادنیٰ بادشاہ سے بھی کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا دل رعب جلال سے پُر ہوتا ہے صورت پر عاجزی وخشوع کا پورا اثر ہوتا ہے اور سوال کے وقت کوئی بات بادشاہ کی مرضی کے خلاف اس میں نہیں ہوتی اور ہماری یہ حالت ہے کہ عین دعا کے وقت ہم سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کے پاس پرایا حق دبا ہوا ہے کسی نے بالخصوص عورتوں کا حق دبا رکھا ہے کسی کے پاس رشوت کی زمین دبی ہوئی ہے بعض کی صورت بھی دعا کے وقت شریعت کے موافق نہیں ہوتی بلکہ باغیانہ شکل ہوتی ہے۔

پھر طرہ یہ کہ دعا میں بھی لجاجت و التجا نہیں ہوتی دل حاضر نہیں ہوتا اوپرے دل سے دُعا کرتے ہیں صورت پر بھی عاجزی وزاری نہیں ہوتی اس حالت میں بتلاؤ یہ سوال سوال ہے؟ یا گستاخی ہے؟ کسی دنیوی بادشاہ سے مانگنے اس طرح کوئی نہیں جاتا اور اگر کوئی جائے تو کان پکڑ کر نکال دیا جائے حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس حالت میں بھی ہماری بہت سی دعائیں قبول کر لیتے ہیں اور جو لوگ پوری طرح حق تعالیٰ کے مطیع ہیں اُن سے پوچھو کہ ان کی ہزاروں دعاؤں میں سے شاذ و نادر ہی کوئی دعا ایسی ہوگی جس کا اثر کسی مصلحت سے ظاہر نہ ہوا ہو ورنہ قریب قریب سب قبول ہوتی ہیں یعنی سب کی قبولیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ دعائیں سب کی قبول ہوتی ہیں پھر کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی اس سے افضل چیز عطا ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر

آخرت میں جمع کر کے اس کو دیا جائے گا اس وقت ثواب کو دیکھ کر آپ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری سب دعائیں آخرت ہی میں ذخیرہ رہتیں دنیا میں ایک بھی نہ ملتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مسلمانوں کا ایمان ہے اس لئے بے فکر رہنا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ ہماری سب دعائیں بالمعنی الاعم قبول ہی ہوتی ہیں گو ہماری حالت اور ہماری دعائیں اس قابل نہیں ہیں کہ قبول ہوں جیسا کہ جواب اول میں کہا گیا تھا مگر وہ تو عقل کا فتویٰ تھا لیکن حق تعالیٰ ہمارے ساتھ عقل کے فتوے کے موافق برتاؤ نہیں فرماتے وہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہیں فرماتے جو ہماری شان کا مقتضیٰ ہے بلکہ وہ معاملہ فرماتے ہیں جو اُن کی شانِ کریمی کا مقتضیٰ ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

ایں قبول ذکر تو از رحمت ست ٭ چوں نماز مستحاضہ رخصت ست

واقعی عجب مثال دی ہے کہ ہماری دعا و ذکر کا قبول ہونا ایسا ہی ہے جیسے مستحاضہ اور سلسل البول والے کی نماز قبول ہوتی ہے گو ظاہر میں وہ گندگی سے ملوث ہے اور عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اس حالت میں نماز قبول نہ ہو کیونکہ نماز دربار شاہی کی حاضری ہے اور گندہ آدمی کی حاضری دربار کے لائق نہیں ہوتا مگر شان رحمت کا فتویٰ یہ ہے کہ سب قبول ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ہم کو اپنی جس عقل پر ناز ہے وہ ہماری دشمن ہے اگر حق تعالیٰ اسی کے موافق ہم سے برتاؤ کرنے لگیں تو ہم ہلاک و تباہ ہو جائیں بس اب میں بشارت دیتا ہوں کہ مسلمان کی دعا ہر حال میں قبول ہے مگر اس کا شکر یہ ہے کہ ایسے کریم و رحیم خدا پر سو جان سے قربان ہو جائیں اور اس کی نافرمانی کا نام بھی نہ لیں ہر دم اسی کے راضی کرنے کی فکر میں رہیں۔

آیت اور مضامین میں ربط

اب میں اس آیت کے ساتھ ان تینوں مضامین کا ارتباط بتلاتا ہوں۔ جو اس جلسہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ ان مضامین کو آیت سے کیا مناسبت ہے سو یہ تو ظاہر ہے کہ آیت میں سوال کا تو صراحۃً ہی ذکر ہے اس کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ حج و قربانی اور استغفار یہ سب دعائیں ہیں۔ اب ایک مقدمہ یہ سمجھئے کہ عبادت درحقیقت سوال ہی ہے۔

رہی یہ بات کہ عبادت سوال کیسے ہے تو واقعی کریم کی خدمت کرنا اس سے مانگنا ہی تو ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض جگہ فقیر لوگ پنکھا جھلتے پھرتے ہیں بعض جگہ غریب لوگ پانی پلاتے پھرتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کا پنکھا جھلنا اور پانی پلانا ہی مانگنا ہے پھر حق تعالیٰ کی عبادت کرنا سوال کیسے نہ ہوگا۔ یہاں تو جن کو غربا پانی پلاتے یا پنکھا جھلتے ہیں وہ لوگ ان چیزوں کے محتاج بھی ہیں جس کے بعد کچھ دنیا من وجہ معاوضہ اور وہ خدمت اس درجہ میں عقد معاوضہ ہے اور خدا تعالیٰ تو کسی عبادت کے محتاج نہیں اس لئے وہ طاعت سوال محض ہی ہے۔

پھر دنیا کے امراء میں کرم کا محض نام ہی نام ہے جب اس پر بھی یہ خدمت سوال ہے تو خدا تعالیٰ کی عبادت یقیناً سوال ہے کہ حضور کچھ دلوائیے اور اسی لئے قرآن میں عبادت کو جا بجا عنوان دعا سے تعبیر کیا گیا ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ تم جو ہماری عبادت کرتے ہو حقیقت میں ہم سے مانگتے ہو چنانچہ نص میں تدعون بجائے تعبدون کے بکثرت وارد ہے

اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے کہ نداء غیر اللہ جائز ہے یا ناجائز تو مانعین نے استدلال میں انہیں نصوص کو پیش کیا ہے جن میں دعاء غیر اللہ پر وعید وارد ہے مجوزین نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان نصوص میں تدعون بمعنی تعبدون ہے جس سے عبادت غیر اللہ کی حرمت ثابت ہوئی نہ کہ نداء غیر اللہ کی حرمت۔

میں قصر مسافت کرکے ان مجوزین کو جواب دیتا ہوں کہ ہم نے مان لیا کہ ان نصوص میں تدعون کی تفسیر تعبدون ہے۔ اور یہ آپ کو بھی مسلم ہے کہ عبادت غیر اللہ حرام ہے۔ اب ہم ثابت کرتے ہیں کہ دعاء بھی عبادت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الدعاء مخ العبادۃ۔ پس نداء غیر اللہ اس لئے حرام ہے کہ وہ عبادت کی فرد ہے اور عبادت غیر اللہ حرام ہے۔ پس اوپر تو میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ عبادت کی حقیقت دعا ہے اور اب یہ ثابت ہوا کہ دعا بھی عبادت ہے تو طرفین سے تلازم ہو گیا کہ کوئی عبادت سوال و دعا سے خالی نہیں اور کوئی دعا و سوال عبادت سے خالی نہیں۔

اور میرا پہلا دعویٰ عرف و عادت سے تو ثابت ہے ہی حدیث سے بھی ثابت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

افضل الدعاء دعاء یوم عرفۃ وافضل ما دعوت به فیه انا والنبیون قبلی لا الٰه الا الله وحده لا شریك له له الملك وله الحمد وهو علی کل شیٔ قدیر ۔

اس میں حضورؐ نے اس ذکر کو دعا فرمایا ہے حالانکہ اس میں دعا کا صیغہ بظاہر کوئی نہیں اسکی توجیہ میں یہی کہا گیا ہے کہ

ان الثناء علی الکریم دعاء

کہ کریم کی تعریف کرنا دعا و سوال ہی ہے اور اس ذکر میں حق تعالیٰ کی ثنا ہے تو یہ دعا ہی ہے ۔

نیز ایک حدیث میں ہے کہ سجدہ میں خوب دعا کیا کرو ۔ فقمن ان یستجاب لکم ۔ وہ موقع قبولیت کے زیادہ لائق ہے لیکن حضور نے جو الفاظ سجدہ کے لئے مقرر فرمائے ہیں یعنی سبحان ربی الاعلیٰ ان میں بھی دعا کا صیغہ ظاہر میں نہیں ہے یہاں بھی وہی جواب ہے کہ ثنائے کریم دعا ہی ہے اور جب ثنا دعا ہے جو اہون افراد عبادت ہے تو جو اعظم افراد عبادت ہیں یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج وغیرہ وہ کیونکہ دعا نہ ہوں گے

پس اب حاصل آیت کا یہ ہوا کہ تمام مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے حق تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔

اب ایک سوال پیدا ہوگا کہ معنی عبادت کو لفظ سوال سے کیوں تعبیر کیا گیا اس میں کیا نکتہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ مخلوق عبادت کرکے کچھ ہم پر احسان نہیں کرتی بلکہ اپنا ہی بھلا کرتے ہیں کہ صورت سوال پیدا کرکے کچھ ہم سے لے لیتے ہیں ۔

دوسرے اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ عبادت کے اندر سوال کی شان ہونا

چاہیئے عبادت اس طرح کرنا چاہیئے جس طرح سوال کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوال میں صورت بھی عاجزانہ ہوتی ہے دل میں بھی تقاضا و طلب ہوتا ہے اور جس سے سوال کرتے ہیں اسکی طرف آنکھیں لگی ہوتی ہیں دل بھی ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھئے درخواست کا کیا جواب ملے تو یہی شان عبادت میں ہونا چاہیئے اس سے تکمیل عبادت کا سہل طریقہ معلوم ہوگیا کہ عبادت کیونکر کامل ہوتی ہے۔ لیجئے یہ انمول جواہرات آپکو مفت بلا مشقت مل گئے ان کی قدر کیجئے۔

اور یہاں سے علوم قرآن کا اندازہ ہوا ہوگا کہ لفظ لفظ میں کتنے علوم ہیں اور یہ تو وہ ہیں جہاں ہم جیسوں کی فہم پہنچی ہے اور حکماء امت و عارفین اور صحابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جہاں تک پہنچی ہوگی ان کی کیا شان ہوگی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا مجموعی نام **السوال فی شوال** تجویز کرتا ہوں جس کے معنی یہ ہیں کہ ماہِ شوال میں مضمون سوال کا ذکر ہوا تھا یہ مطلب نہیں کہ شوال میں سوال منحصر ہے کیونکہ سوال کی حقیقت عبادت ہے اور صورت دعا ہے اور عبادت و دعا شوال کے ساتھ مخصوص نہیں بالخصوص حج و قربانی تو شوال میں ہو ہی نہیں سکتے صرف قدرے ارتباط ان کو اس ماہ سے بھی ہے اس لئے ذکر کردیئے گئے اور استغفار و توبہ کو کسی وقت کے ساتھ بھی مخصوص نہیں۔

خلاصہ وعظ

اب میں مختصر طور پر سارے وعظ کا خلاصہ عرض کرکے ختم کرتا ہوں کہ ہم کو تمام عبادات میں سوال کی صورت بنانا چاہیئے۔ اور جن پر فرض ہے وہ توجہ کی تیاری کریں۔ راستہ بند نہیں ہے وہ ذرا تحقیق تو کریں طالب کے لئے راستہ ہمیشہ مفتوح ہوجاتا ہے وہ ذرا قدم تو اٹھائے مولانا فرماتے ہیں ؂

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ✤ خیرہ یوسف وار می باید دوید

کہ ہر چند کہ طالب کو راستہ نظر نہیں آتا مگر وہ یوسف علیہ السلام کی طرح ایک دفعہ دوڑے تو سہی راستہ خود بخود نکلتا چلا آئے گا۔ اسی طرح حج کا قصد

کرنے والے محض افواہی باتوں سے ارادہ ملتوی نہ کریں۔ بلکہ تحقیق کریں تو انشاء اللہ معلوم ہوگا کہ راستہ کھلا ہوا ہے۔

مقصود یہ نہیں کہ امن شرط نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ عدم امن کی افواہیں مانع نہ ہونا چاہئیں، دوسرے حق تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کریں یہ کام سب کے لئے ضروری ہے اور جن پر حج فرض نہیں اور قربانی واجب ہے وہ قربانی کے لئے ابھی سے ہمت پختہ کریں اور زیادہ توفیق ہو تو ابھی سے جانور خرید کر کے اس کو تیار کریں۔ بس اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سب آفات سے نجات دے اور باران رحمت نازل ہو اور اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائیں اور آئندہ کے لئے اپنی مرضیات وطاعات کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین!

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہٖ
واصحابہ اجمعین ۔:۔

تعظیم الشعائر

شعائرِ اسلام کی عظمت

کے موضوع پر ۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بیان فرمایا۔

وعظ

تعظیم الشعائر

یعنی

قربانی کے احکام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلَّمْ۔

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی۔ ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔

ترجمہ: (یعنی یہ بات بھی ہو چکی اب ایک بات اور سن لو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کریگا۔ تو ان کا یہ تعظیم کرنا خدائے تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔)

تمہید میں نے تقریباً دو جمعہ پہلے کچھ ترغیب ترہیب متعلق قربانی کے بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ ضروری احکام اس کے متعلق بیان کروں گا۔ لیکن بوجہ اضمحلال طبیعت اور سامان سفر کے موقع نہ ملا تھا۔ آج اس وعدہ کا ایفا کرتا ہوں۔ یہ آیت سورۂ حج کی ہے۔ ان آیتوں میں مع سیاق وسباق کے قربانی کے احکام مذکور ہیں ہر چند کہ یہ احکام حج کی قربانی کے متعلق ہیں مگر اکثر احکام اضحیہ اور حج کی قربانی کے مشترک ہیں اسلیئے اس آیت کو میں نے اختیار کیا۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ جس میں قربانی وغیرہ کے تمام احکام داخل ہوگئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ذَالِكَ یہ مبتدا ہے خبر اس کی محذوف ہے یا خبر ہے مبتدا اس کا محذوف ہے مطلب اس جملہ کا قریب قریب اس کے ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بات گذشتہ تو ختم ہوگئی اب ایک اور بات سنو۔ اس سے کلام سابق اور کلام لاحق میں فصل ہوجاتا ہے عربی میں اس غرض کے لیے مفید لفظ ذالک ہے اور دوسری کتب مؤلفہ ومصنفہ میں گو ایسے الفاظ کم وارد ہوتے ہوں لیکن قرآن مجید کا طرز تصنیف وتالیف کا نہیں بلکہ محاورات وعادات کے موافق ہے۔ مصنفین کا طرز دوسرا ہے۔ پس ارشاد ہے کہ دوسری بات سنو کہ جو شخص اللہ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کریگا جزا آگے ہے۔

مفہوم شعائر اول دو چیزیں سمجھنا چاہئیں اول یہ کہ شعائر کیا ہیں اور ان کی تعظیم کیا ہے۔ شعائر بمعنی علامات اعمال ہیں دین کے۔ اسلیئے کہ ان اعمال سے معلوم ہوجاتا ہے کہ دیندار ہے جیسے نماز حج وغیرہما۔ اگر کوئی کہے کہ صلوٰۃ تو خود دین ہے۔ علامت دین کے کیا معنیٰ؟ بات یہ ہے کہ ہر شئے کی ایک صورت ہوا کرتی ہے اور ایک حقیقت اور وہ صورت علامت ہوتی ہے وجود حقیقت پر اسی طرح دین کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ مثلاً صلوٰۃ ارکان مخصوصہ اس کی صورت ہے اور حقیقت صلوٰۃ جدا شئے ہے۔ جس کا تعلق زیادہ قلب سے ہے چنانچہ اگر ایمان ونیت نہ ہو حقیقت نماز کی نہ پائی جائے گی۔ اور ان دونوں کا تعلق ظاہر ہے کہ قلب سے ہے اسی طرح ہر عمل کو سمجھنا چاہیئے۔ پس صورت دین

اور شے ہوئی اور حقیقتِ دین شے آخر۔ اور یہ صورتیں اعمال کی علامات ہیں دین کی ان کو ہی شعائر فرمایا ہے۔ پس مفہوم شعائر کا متعین ہو گیا۔

تعظیم شعائر اب تعظیم شعائر کی حقیقت معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ کیا ہے۔ تعظیم شعائر یہ ہے کہ ان اعمال کا حق جس طرح شریعت مطہرہ نے حکم فرمایا ہے ادا کیا جائے۔ حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جو شخص اعمالِ دین موافق احکامِ الٰہیہ ادا کرے۔ اب اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مضمون عام ہے قربانی اور غیر قربانی سب اس میں داخل ہیں۔ میں نے جو اول اس مضمون کے عموم کا دعوٰے کیا تھا وہ ثابت ہو گیا۔ خلاصہ پوری آیت کا یہ ہے کہ جو شخص علامات دین یعنی اعمال کی تعظیم کریگا۔ یعنی ان کو موافق شریعت کے ادا کرے گا۔ فَاِنَّهَا یعنی یہ ان اعمال کی تعظیم مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ قلوب کے تقوٰے سے ناشی ہونے والی ہے یعنی یہ علامت ہے کہ خدا تعالےٰ کا خوف اس شخص کے دل میں ہے کیونکہ خوفِ خدا ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تعظیم شعائر اللہ کا باعث ہے۔

اگر کوئی کہے کہ حکومت سے بھی تعظیم شعائر کی متصور ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حکومت سے جو تعظیم ہو گی۔ وہ صورت تعظیم ہو گی۔ تعظیم کی جو حقیقت ہے وہ نہ ہو گی جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نماز پڑھتے تھے لیکن اسلئے نہ پڑھتے تھے۔ کہ خدا ہم سے راضی ہو۔ بلکہ یہ غرض تھی کہ مسلمان ہم سے راضی ہو جائیں۔ بتلایئے کہ حکومت سے حقیقت کہاں پائی گئی پس جو کوئی تعظیم شعائر اللہ کی کریگا وہ قلوب کے تقوٰے ہی سے ہو گی۔ یعنی خوفِ خدا ہی اس کا منشا ہو گا کسی قاعدے اور قانون اور ضابطے سے نہ ہو گی۔ اور جملہ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (یعنی ان کی تعظیم قلوب کے تقوٰے سے ہوتی ہے) قائم مقام جزا کے ہے اور اس جزا کی علت ہے جزا محذوف ہے اور جزا یہ ہے۔ فانہٗ مُتَّقٍ قَلْبُهٗ (اس کا قلب متقی ہے) یعنی جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے۔ اس کا قلب متقی ہے) کیونکہ یہ تعظیم تقوٰے ہی سے ہوتی ہے۔

اور قلوب کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے ایک مسئلہ واضح ہو گیا۔ وہ یہ کہ تقوٰے

قلب کی صفت ہے چنانچہ حدیث شریف بھی ہے التقویٰ ھٰھنا۔ واشارالیٰ صدرہٖ (یعنی تقوےٰ اس جگہ ہے اور آپ نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا۔
اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض اپنے کو متقی جاننے سے متقی نہیں ہوتا جب تک قلب اضداد تقوےٰ سے پاک نہ ہو۔ البتہ دوسروں کی نسبت تو یہ عمل چاہیئے کہ ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی ؛ پارسا بین و نیک مرد انگار۔

(جس شخص کو پارسائی لباس میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک مرد سمجھو۔)

تقوےٰ کا گھمنڈ

لیکن اپنے کو متقی جاننا جیسا آجکل مرض ہے یہ آفت ہے حالانکہ دیکھتا ہے کہ میرے قلب میں سینکڑوں امراض مثل کینہ، حسد، حب دنیا، حب مال، حب جاہ۔ موجود ہیں لیکن چونکہ داڑھی بڑھا رکھی ہے۔ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہے۔ کرتا نیچا ہے۔ ہاتھ میں تسبیح۔ اسلئے لوگ متقی سمجھتے ہیں اور ان کے متقی سمجھنے سے خود اس کو بھی یقین ہو گیا۔ کہ آخر یہ سب لوگ جھوٹے تو ہیں نہیں کچھ تو بات ہے جو مجھ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی بے وقوف کے پاس ایک شریر گھوڑا تھا۔ ہر چند اسکو دباتا تھا۔ اور قابو میں لاتا تھا۔ لیکن وہ رسید ہی نہ دیتا تھا۔ کسی نے کہا کہ اس کو بیچ دو۔ مالک صاحب نے کہا کہ آپ ہی اسکو بکوا دیں۔ اس شخص نے چوک میں کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا کہ یہ گھوڑا اچھا ہے اور ایسا قدم باز ہے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتا اور طرح طرح کے اوصاف اس کے بیان کیئے۔ مالک صاحب یہ سُن کر کہنے لگے کہ میاں اگر ایسا ہے تو لاؤ میں ہی نہ رکھوں کیوں بیچوں۔ اس نے کہا کہ کیا تمہارا عمر بھر کا تجربہ میرے چند الفاظ سے جاتا رہا۔
یہی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ صریحًا دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اندر ریا، فریب حسد، شہوت، غضب کا انباع موجود ہے اور تمام عمر گذر گئی کہ نفس سے سابقہ پڑ رہا ہے سرکشی اس کی مشاہد ہے کہ چاہتے ہیں کہ فلاں کام کرے اور نہیں کرتا ہے ان سب امور پر تو خاک ڈالدی اور یقین کس چیز پہ آیا کہ ساری بستی کے لوگ

مجھ کو بزرگ سمجھتے ہیں اسلئے میں بزرگ ہوں۔

دوسری حکایت اور یاد آئی۔ ایک میاں جی تھے۔ وہ لڑکوں کو بہت دق کرتے تھے۔ لڑکوں نے آپس میں صلاح کی کہ جیسے یہ دق کرتے ہیں ان کو بھی دق کرنا چاہیئے چنانچہ ایک لڑکا مکتب میں آیا اور السلام علیکم کہکر میاں جی سے کہا میاں جی! کیا بات ہے آج کچھ چہرہ اداس ہے۔ دوسرا آیا حافظ جی کیا کیفیت ہے طبیعت تو اچھی ہے۔ تیسرا آیا خیر تو ہے کچھ بخار کا اثر چہرہ سے نمایاں ہے غرض حافظ جی کو اس کہنے سننے سے یقین ہو گیا کہ میں یقیناً بیمار ہوں گھر آکر لیٹ گئے بی بی سے لڑائی شروع کی کہ تمام لڑکوں نے عیادت کی مگر تو نے نہیں کی۔ غرض خوب لڑائی ہوئی۔ یہ حکایت مولانا یہ کہہ کر فرماتے ہیں کہ ارے احمق! تو لوگوں کی تعظیم و تکریم سے اوہام میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اپنے کو بزرگ سمجھتا ہے اور کچھ بزرگی پر منحصر نہیں بلکہ ایسی ہی بنا پر کسی کو ریاست کا گھمنڈ ہے کسی کو مولویت کا کسی کو بہادری کا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب تک اونٹ پہاڑ کے نیچے کو نہیں گذرتا ہے۔ تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے اونچا کوئی نہیں اور جب پہاڑ پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اور مخلوق بھی مجھ سے بلند ہے۔ اسلئے رئیس کو چاہیئے کہ اپنے سے بڑے رئیس کو دیکھے۔ مولوی کو چاہیئے کہ اپنے سے بڑے مولوی کو دیکھے اور آجکل کی کیا ریاست اور کیا مولویت۔ ریاست تو یہ ہے کہ کسی غریب کو دو دھپ لگوا دیئے یا اس پر چوکیدارہ بڑھوا دیا۔ کسی غریب کی گھاس چھین لی۔ چار پیسے کی شے دو پیسے میں لے لی۔ یہ تو ریاست ہے۔ مولویت یہ ہے کہ چند مسئلے یاد کر لیئے مولوی بن بیٹھے۔ مینڈک جب تک کنوئیں میں مقید ہے سمجھتا ہی عالم ہے۔ ہر فن والے کو چاہیئے کہ اپنے سے بڑے پر نظر کرے۔

نظر حقیقت بین

اور بالفرض اگر کوئی اس سے بڑا نہ ہوتا۔ کہ اس پر نظر کرے تو حق تعالیٰ تو ہر صفتِ کمال میں سب سے بڑے ہیں ممکن کی صفتِ کمال ہی کیا مستعار اور معرضِ زوال میں ہیں حقیقی صفت

کمالیہ کے سامنے تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی موصوف ہیں اور جن حضرات کی نظر حقیقت بین ہو گئی ہے ان کی نظر میں اپنا وجود ہیچ در ہیچ ہو گیا ہے اسی واسطے بزرگانِ دین قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں۔ ایک دوست نے دریافت کیا کہ فلاں بزرگ قسم کھا کر لکھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں۔ اگر سچے ہیں تو بزرگ نہیں اور اگر واقع میں بزرگ ہیں تو جھوٹی قسم کیوں کھائی۔ میں نے کہا کہ وہ سچے ہیں اور بزرگ بھی ہیں اور یہی بزرگی ہے کہ ان کی نظر کمالاتِ خداوندی پر ہے اور کمالاتِ خداوندی کے سامنے کوئی شے نظروں میں نہیں آتی۔ جیسے طلوعِ شمس سے ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ستارے رہتے ہیں۔ جیسے شیخ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ کسی نے جگنو سے پوچھا تھا کہ تو دن کو کہاں رہتا ہے اس نے جواب دیا

؎ کہ من روز و شب جز بصحرا نیم ✲ ولے پیش خورشید پیدا نیم۔

(یعنی میں رات دن سوائے جنگل کے کہیں اور نہیں رہتا۔ لیکن آفتاب کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا ہوں۔)

پس حضرتِ حق کے سامنے کسی کا کوئی کمال نہیں اسلئے ان بزرگ کی قسم سچی ہے۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ کے رُوبرو کوئی بڑا نہیں، سب چھوٹے ہیں وَ لَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہ (اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں) پس چند آدمیوں کے کہنے سے کہ آپ شاہ صاحب ہیں یا مولوی صاحب ہیں یا رئیس صاحب ہیں کیا ہوتا ہے صاحبو! اگر ہمارا ظاہر و باطن یکساں بھی ہوتا تب بھی اس دلیل مذکور سے ثابت ہو گیا کہ ہم کو اپنے کو صاحب کمال نہ سمجھنا چاہیئے چہ جائیکہ ہمارا تخالف ظاہر و باطن کا یہ ہے کہ ؎

از بروں چوں گورِ کافر پُر حلل ✲ واندروں قہرِ خدائے عز و جل

(ظاہری حالت ہماری ایسی ہے جیسے کافر کی قبر باہر سے مزین ہوتی ہے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے)

واللہ! اگر ٹٹول کر دیکھا جائے تو ہمارے قلب میں وہ خرافات ہیں کہ اگر دوسروں کو معلوم ہو جائیں تو کوئی پاس بھی نہ بیٹھنے دے۔

حقیقتِ تقویٰ

بات یہ ہے کہ تقویٰ کی حقیقت ہی اب تک معلوم نہیں ہوئی جو اپنے کو متقی سمجھ بیٹھے۔ صورتِ تقویٰ اور شئے ہے اور حقیقتِ تقویٰ جدا شئے ہے۔ اور ظاہر میں صورتِ تقویٰ والا اور حقیقت والا یکساں ہے۔ ع:

انچہ مردم میکند بوزینہ ہم

جو کچھ آدمی کرتے ہیں بندر بھی اس کی نقل کرتا ہے۔

آپ بھی مکان بناتے ہیں اور بچے بھی بناتے ہیں۔ ریت جمع کرتے ہیں اور اس سے مکان یعنی صورتِ مکان بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ میری سہ دری ہے۔ یہ میرا دالان ہے۔ یہ میرا دروازہ ہے۔ آپ اپنے گھر کے سامنے اس ریت کے گھر کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بصیرت کی نظر میں ہمارے اعمال خالی عن الحقیقت حقیر ہیں۔ غرض نقل اور صورت شئے اور شئے ہے اور حقیقت اور چیز ہے۔ تقویٰ کی جڑ قلب میں ہے اگر جڑ ہوگی۔ تو پھول ہمیشہ شاداب رہیں گے اور اگر پھول توڑ کر گلدستہ بنایا جائے تو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کی جڑ نہیں دو روز میں سیاہ ہو جائیں گے۔ حق تعالیٰ اسی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ یعنی کلمہ توحید کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب محکم ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں) اس کا حاصل بھی وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ قلب میں ہوتا ہے اسی واسطے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف لفظوں میں فرمایا اَلَا اِنَّ التَّقْوٰى هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰى صَدْرِهٖ (آگاہ رہو کہ تقویٰ اس جگہ ہے اور آپ نے

بینے قلب کی طرف اشارہ کیا) جیسا مذکور ہوا۔ پس ظاہری تقویٰ ایک گلدستہ کے پھولوں کی طرح ہے کہ رہتا نہیں بہت جلد قلعی کھل جاتی ہے۔ سچی بات عمر بھر چلتی ہے اسی حقیقت کی تمنا اور صورت بے معنی کی عدم اعتماد کی نسبت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی ۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(زہد خشک جو حقیقت سے خالی ہے بہت دور و دراز کا رستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں جو حقیقت سے پُر ہے چلائیے۔)

خیر یہ ایک مستقل مسئلے کی طرف اشارہ تھا جس پر اضافت تقویٰ کی قلوب کی طرف دال ہے۔ باقی اصل مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ جو اعمال کرو وہ حکم کے موافق کرو۔ منجملہ ان اعمال کے قربانی بھی ہے اس کو بھی حکم کے موافق ادا کرنا چاہیے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کام اس کی غایت کی وجہ سے مقصود ہوتا ہے اور اعمال شرعیہ میں غایت رضائے حق ہے تو جب ضابطے کے موافق نہ ہوگا تو رضا کے فوت ہونے سے وہ عمل بے کار ہو جائے گا۔ بعض ضوابط مذکور ہوتے ہیں۔

صحتِ قربانی

سو جاننا چاہیئے کہ قربانی کے اندر دو قسم کی خرابیاں لوگ کرتے ہیں۔ بعض تو مقبول ہونے کی رعایت نہیں کرتے اور بعضے صحیح ہونے پر بھی نظر نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک مقام پر ایک شخص نے دوسرے سے کہہ دیا کہ بھائی میرے بھی دو حصے کر دیجیو! قربانی کے حصے تو لے لیے اور خود غائب ہو گئے اور دام بھی نہ دیئے۔ عقلائے وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے۔ میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بدمعاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کر رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا کیونکہ مال سے مقصود تمتع دنیوی ہے۔ اور سود خور جمع کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لیے جمع کرتے

نہیں ان کو بھی نہیں ملتا ہے۔ اور فرض کرو اگر متمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں۔ کسی پر ان کو رحم نہیں آتا کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا۔ اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے جیسے بیرسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بگڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دنیوی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہی ہوتے دیکھا اور فرض کرو اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لے کر کیا کریں گے ؂

مبادا دل آں فرومایہ شاد ٭ کہ از بہر دنیا دہد دین بباد

(خدا کرے اس کمینہ کا دل کبھی خوش وخرم نہ ہو ٭ جو دنیا کی وجہ سے دین برباد کر دے)

یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔ دوسرے ایک دنیوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے کہ ترقی کا سبب وہ شئے ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں اسلیئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہو گی۔ جس کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سود ایسی شئے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا اوّل تو سب کے پاس مال نہیں دوسرے آخر لے گا کون! اسلیئے لامحالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں تو جو لیں گے وہ ترقی کریں گے۔ اور جو نہیں لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے۔ بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے۔ پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا۔ ترقی کا صحیح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں تاجر، اہلِ ملک رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں اس وجہ سے تباہی آتی ہے تو ایسی صورت ہونا چاہیئے کہ سود نہ دینا پڑے۔ اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمان کو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں۔ اسلیئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ دوسرے

مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بدمعاملگی کے قرض نہیں دیتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور ان کو قرض دیں۔ مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لے لیں گے۔ اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے۔ اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے وہ رفع ہو جائے پس ثابت ہوا کہ بدمعاملگی تنزل کا سبب ہے ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے وہ بھی ٹال کر دیں گے اور اس کو لازم ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہیں ہوئی۔ اسی طرح قرضخواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کر دیں گے۔ کہ بھائی ابھی خرچ آیا نہیں۔ اور اسی حالت میں اگر بچے کی ختنہ در پیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اگل دیں گے۔ غرض بدمعاملگی کا مرض عام ہے۔ چنانچہ ان صاحب نے یہ بدمعاملگی کی کہ حصے تو قربانی کے لے لیے اور خود غائب ہو گئے۔ اب گائے ذبح ہو گئی اور گوشت کی بوٹیاں بن گئیں۔ اور وہ حصے والے موجود نہیں اب دام کس سے لیں۔ ایک مجتہد صاحب بولے کہ بھائی وہ تو غائب ہو گئے اب کوئی اور لے لو جس کو دو حصے قربانی کے لینے ہوں۔ وہ بھلے مانس سمجھے کہ گوشت مقصود ہے حالانکہ قربانی سے مقصود گوشت نہیں بلکہ اراقۃ دم للّٰہ ہے۔ (اللہ تعالیٰ کے لیے ایک جانور کا خون بہانا ہے) اگر شریک کی نیت بھی گوشت کی ہوگی تو سب کی قربانی برباد ہوگی۔ غرض مقصود اللہ کے واسطے ایک جان کا خون بہانا ہے۔ اور گوشت کا تو اختیار ہے خواہ خود کھاؤ یا کھلاؤ۔ ہاں اگر کوئی گائے ایسی ہوتی کہ

ع ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(ہر وقت غیب سے اس کو ایک جان عطا ہوتی ہے)

کی مصداق ہوتی تو اس کی دو مرتبہ قربانی ہو سکتی تھی۔ غرض ایک شخص عقلمند

بھی مل گیا جس نے کئے ہوئے وہ دو حصے خرید لیے اور بزعم خود اپنی قربانی درست سمجھ لی۔ اور ان ظالموں نے مل کر اس خریدار گوشت کی قربانی بھی بادی بعض بعض صورتیں ناواقفی سے ایسی پیش آجاتی ہیں کہ قربانی قبول تو کیا صحیح بھی نہیں ہوتی۔

قبولیت قربانی

اور بعض صورتوں میں گو صحیح ہو جائے مگر قبول نہیں ہوتی۔ کانپور میں ایک مستری تھے انہوں نے ایک بھیڑ خریدی کوئی عیب ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہو لیکن ہر عیب تہائی سے کم تھا۔ ضابطے اور قانون کی رو سے اس بھیڑ کی قربانی جائز تھی۔ ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسی بھیڑ کیوں کرتے ہو کیا اچھا جانور میسر نہیں آتا کہنے لگے۔ واہ ہماری بیوی کہتی ہیں کہ جائز ہے اور گھر پہنچے بیوی سے تذکرہ کیا کہ ایک شخص نے تمہارے مسئلے پر اعتراض کیا بیوی نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکالا اور قربانی کا بیان نکال کر وہاں نشانی رکھ کر باہر بھیج دیا کہ دکھلا دو۔ ان کو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر قربانی ہو بھی گئی۔ یعنی ضابطے کی رو سے اسکی صحت کا حکم کر دیا گیا۔ لیکن ایسی قربانی کیا قبول ہو سکتی ہے جس کو یہ شخص مخلوق کے لیئے پسند نہ کرے اللہ تعالے ارشاد فرماتے ہیں۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (اللہ تعالے کے یہاں قربانی کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے لیکن ان کے پاس تو تمہارا تقوے پہنچتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالے تو نیت کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے نام پر اس نے کتنی پیاری شے کو خرچ کیا ہے اور جب ایسی خوبصورت قربانی ہوگی۔ تو نیت کا حال اس سے خود ہی معلوم ہوتا ہے کہ کیسی ہے تو کیا قبول ہونے کی امید ہے۔ ہاں اگر اس سے اچھی میسر ہی نہیں تو وہ دوسری بات ہے دیکھئے۔ اگر حاکم ضلع کسی رئیس سے فرمائش کرے کہ ہمارے واسطے ایک گائے لاؤ تو بتلاؤ کیسی گائے لیجاؤ گے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ جس قدر عمدہ گائے ہم لے جائیں گے۔ حاکم ہم سے خوش ہوگا۔ کان ناک، آنکھ ہاتھ پاؤں سب کی ہی خوبصورتی کا خیال

کریں گے جتنی الوسع قیمتی اور خوبصورت کی تلاش ہوگی۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک ادنیٰ حاکم مجازی کہ جس سے نفع پہنچنا موہوم اس کی یہ رعایت اور حاکم حقیقی جس کی طرف سے ہر وقت نعمتوں کی بارش ہم پر ہے وہ ایک جانور مانگتے ہیں اور وہ بھی ہمارے ہی نفع کے لئے اس میں اس قدر تساہل۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے سورۂ بقرہ کے ختم کے شکریہ میں ایک اونٹنی ذبح کی تھی۔ اس کی ان کو تین سو اشرفیاں ملتی تھیں۔ مگر دی نہیں اور اللہ کے نام پر اس کو ذبح کر دیا۔ ایک اشرفی دس درم کی ہوتی تھی اور ایک درم سوا چار آنہ کا تخمیناً ہوتا ہے۔ حساب لگا لیجیے۔ اب تو اگر عمدہ جانور لیتے بھی ہیں تو اس میں بھی خلوص نہیں ہوتا۔ اس میں بھی یہ چاہتے ہیں کہ نام ہو جائے۔

شرائط قبولیت وصحت

حاصل کلام یہ کہ دو قسم کے احکام کی ضرورت ہے ایک تو وہ جو موقوف علیہ صحت کے ہیں دوسرے وہ جن پر قبولیت موقوف ہے۔ قبولیت کے لیئے تو خوشدلی کی ضرورت ہے کراہت اور غرض فاسد کی آمیزش سے اسکو پاک کرے اور صحت کی شرائط بتلانا ضروری ہیں۔ چنانچہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں تعظیم شعائر سے مراد عرض کر چکا ہوں کہ اعمال کو حکم کے موافق ادا کرنا ہے جس کے عموم میں قربانی بھی داخل ہے اسکو بھی احکام کے موافق ادا نہ کی تو قربانی صحیح نہ ہوگی اسلیئے ان احکام کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

اور یہاں پر ایک اور بات پر بھی تنبیہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کو تعظیم سے تعبیر فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ احکام پر وہ شخص عمل کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں ان احکام کی عظمت ہو اور جس کے دل میں عظمت نہ ہو وہ حیلے نکالتا ہے اور احکام کی علل پوچھتا ہے اگر عظمت ہو تو بلا چون وچرا تسلیم کر لے۔

آجکل اس مرض میں بھی بہت لوگ مبتلا ہیں کہ احکام کی علت کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس مرض کا علاج دو چیزیں ہیں اول تاب میں

حق تعالٰی کی عظمت پیدا کرنا۔ اگر عظمت پیدا ہوگی تو یہ سوال زبان پر تو کیا دل میں بھی خطور نہ کریگا۔ دیکھو ایک سپاہی سے اگر کلکٹر یہ کہے کہ یہ چٹھی فلاں شخص کو دے آؤ تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرے گا اور یہ نہ کہے گا کہ صاحب میں تو جب جاؤں گا جب یہ بتلا دو کہ آپ کیوں بھیجتے ہیں اور اس میں کیا مضمون ہے۔ اگر کہے گا تو کان پکڑ کر نکال دیا جائیگا۔ پس مانع اس سوال سے صرف عظمت حاکم کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جو احکام کی علل کے پیچھے پڑے ہیں ان کے قلب میں ان احکام کی اور حاکم حقیقی کی عظمت نہیں ہے۔ دوسرا علاج اس کا محبت ہے اگر محبت کسی سے ہوتی ہے تو محب اس کے احکام کی بلا تامل تعمیل کرتا ہے

آثار محبت دیکھو اگر کوئی کسی پر یا لڑکے پر عاشق ہو جائے اور وہ یوں کہے کہ میں جب راضی ہوں کہ جب تو اپنی بیوی کے گلے کا ہار مجھ کو لادے۔ اگر محبت میں سچا ہے تو فوراً لے آئیگا اور علت سے ہرگز سوال نہ کرے گا۔ افسوس ہے کہ ایک مردار کی تو یہ اطاعت اور خداوند جل جلالہ کے احکام کی علتیں پوچھی جاتی ہیں۔ اور استہزاء کیا جاتا ہے ایسا شخص بڑا منحوس اور بدبخت ہے ؎

عشق مولٰی کے کم از لیلٰی بود ؛ گوئے گشتن بہر او اولٰی بود ؛
در رہ منزل لیلٰی کہ خطرہاست بجاں ؛ شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

(خدائے تعالٰی کا عشق لیلٰی کے عشق سے کب کم ہوتے۔ محبوب حقیقی کے لیے تو گیند ہونا ہر حیثیت سے اولٰی و بہتر ہے منزل لیلٰی کی راہ میں بہت سے خطرات کا سامنا ہے اس راہ میں قدم رکھنے میں اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بن جاؤ۔ یعنی راہ خدا میں بہت سے خطرات پیش آتے ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ محبت پیدا کرو)

تو بھائیو! اوّل محبت پیدا کرو۔ جب محبت پیدا ہو گی۔ اول تو خود بخود تمام اسرار منکشف ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زبان تو ضروری بند ہو جائیگی

اور بدوں اسکے تو اگر کوئی جواب بھی دیدے تو سمجھنے کی قابلیت نہ ہوگی اسلئے یہ سوال کرنا ایسا ہوگا جیسے کوئی نابالغ پوچھے کہ صحبت کرنے میں کیا لطف ہے تو بھلا وہ کیا سمجھ سکتا ہے اس لیئے اس کو یہی جواب دیا جائیگا کہ جب تم بالغ ہو جاؤ گے اس وقت تم کو معلوم ہوجائیگا مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفالند جز مست خدا ؛ نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا۔

(بجز عشق الٰہی کے مست کے تمام مخلوق گویا اطفال ہیں پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا ہے)

یہ لم کیف نابالغوں کے سوالات ہیں بالغ ہوجاؤ سب سوالات منقطع ہوجائیں گے جس اندھے کی کبھی آنکھیں نہ کھلی ہوں وہ کیا جانے سرخ رنگ کیا ہے اس سے یہی کہا جائیگا کہ آنکھیں کھولو اور دیکھ لو۔ اور اگر نہ دیکھ سکو تو کسی بینا کا اتباع اختیار کرو۔ غرض محبت اور عظمت پیدا کر لو تم کو خود بخود تمام سوالات حل ہوجائیں گے خواہ انکشاف سے خواہ تسلیم و رضا سے۔

احکامِ قربانی

اب میں قربانی کے متعلق ضروری احکام بیان کرتا ہوں جن کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ اور ان کے نہ جاننے سے قربانی بعض اوقات قبول تو کیا قاعدہ سے بھی صحیح نہیں ہوتی۔ قربانی کے ساتھ اگر عقیقہ کا حصہ لے لے تو جائز ہے بعض لوگ شبہ کیا کرتے ہیں کہ اگر ساتواں دن نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ یاد رکھو۔ ساتواں دن ہونا ضروری نہیں صرف مستحب تھا۔ اسی کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ عقیقہ کا مصرف بھی وہی ہے جو قربانی کا ہے اگر تمام گوشت خود رکھو تو بھی کچھ حرج نہیں۔ قربانی نام تو اللہ کے واسطے جان کا قربان کرنا ہے۔ جب جانور ذبح ہوگیا۔ وہ ادا ہوگئی۔ اب گوشت کا اختیار ہے اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کسی عزیز کی طرف سے قربانی کرتے ہیں اور اس کو اطلاع نہیں ہوتی۔ اس صورت میں قربانی ادا نہیں ہوتی۔ اسمیں بڑی احتیاط چاہیئے اسلئے کہ اگر ایسی کوئی صورت پیش آجائیگی کہ جس سے ایک حصہ کی

قربانی صحیح نہ ہو تو کسی کی بھی قربانی صحیح نہ ہوگی۔ اسلئے کہ قربانی نام اراقۂ دم کا ہے اور وہ قابل تقسیم نہیں جیسے ایک کنواں مشترک ہوا اور ایک شریک کہے کہ ہم تو اپنے کنوئیں میں پیشاب کریں گے۔ ظاہر ہے کہ سارا ہی کنواں ناپاک ہوا۔ اسی واسطے ساجھی اگر بناؤ تو دینداروں کو بناؤ اور اگر دیندار نہ ملیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ جس قدر شریک ہوں وہ کسی عالم کے پاس آجائیں اور سب اپنی اپنی کہدیں اور جس طرح وہ عالم فیصلہ کرے اس کے موافق کریں۔

اسی طرح سمجھو کہ اگر ایک حصہ میں کسی نے دو شخص کی نیت کر لی تو اس کا حصہ تو گیا ہی تھا۔ اس کے ساتھ سب کا ہی ضائع گیا۔ جیسے ایک نبی کے ساتھ انکار کرنا سب انبیاء علیہم السلام کا انکار ہے مولانا نے شاہ یہودی کے قصہ میں یہی مضمون لکھا ہے ؎

شاہِ احول کرد در راہِ خدا ∴ آں دو دمساز خدائی را جدا

(اس باطنی احول (بھینگے) بادشاہ نے دین کے معاملہ میں ان دونوں حضرات موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو جو دین میں متحد اور متفق ہیں جدا جدا کر رکھا تھا ایک کی تصدیق کرتا دوسرے کی تکذیب)

تو اسی طرح سے قربانی کے لیے میں نے بیان کیا کہ اگر ایک حصہ بھی فاسد ہوگا تو تمام حصے فاسد ہو جائیں گے اور قربانی درست نہ ہوگی۔ سو کسی عالم سے پورا واقعہ صاف صاف بیان کر کے مسئلہ پوچھا کرو۔ مجھ سے بعض لوگوں نے یہ مسائل پوچھے ہیں۔ اسلیے میں کہتا ہوں کہ ان کی طرح کہیں اور کسی نے بھی ایک حصہ میں گھر بھر کے لیے نیت نہ کر لی ہو۔ اگر ایک ہی کی طرف سے حصہ کر دے تب بھی اس کو خبر کردو۔

میت کیطرف سے قربانی بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ میت کیطرف سے قربانی کریں یا نہیں اور اگر کریں تو کیونکر کیا کریں تو قربانی مردوں کی طرف سے بھی جائز ہے۔ ماں باپ پیر استاد حتی کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کر سکتے ہیں۔ مگر ایک حصہ کئی مُردوں کی طرف سے درست نہیں۔

اور شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ قربانی میں ساری امت کو یاد فرماتے تھے۔ اور اس سے کوئی سمجھ جائے کہ آپؐ نے ایک حصہ میں ساری امت کو شریک کیا تو ہمیں بھی جائز ہے کہ ایک حصہ میں کئی آدمی شریک ہو جایا کریں تو کچھ خبر بھی ہے کہ وہ کس کا حصہ تھا وہ ایک حصہ لاکھوں کی برابر تھا۔ یہ تو عاشقانہ جواب ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ آپؐ نے قربانی سب کی طرف سے نہیں کی تھی بلکہ اپنی طرف سے کر کے ثواب ساری امت کو بخش دیا۔ جیسے تم نفل قربانی صرف اپنی طرف سے کر دو اور پھر اس کا ثواب کئی آدمیوں کو بخش دو یہ جائز ہے باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپؐ نے امت کو ثواب بخشا تو امت اسوقت موجود کہاں تھی جواب یہ ہے کہ لوگوں کا یہ خیال کہ ثواب مردوں کو ہی پہنچتا ہے غلط ہے بلکہ زندوں اور آئندہ آنے والوں سب کو پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان زندہ اور مردہ سب یکساں ہیں جس کو ثواب پہنچاؤ اس کو پہنچتا ہے۔ پہنچانے والوں کو اختیار ہے کہ چاہیں زندوں کو پہنچائیں یا مردوں کو۔ مگر ایسا ثواب نہیں پہنچتا۔ جیسا جاہل گمان کرتے ہیں کہ اگر ٹھنڈی چیز دو تو مردے کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اور گرم دو تو گرمی کا اثر ہوتا ہے۔

جیسا کسی پیر کی فاتحہ گرم کھیر پہ دی تھی تو پیر نے کہا میری زبان میں چھالہ پڑ گیا یہ بالکل غلط اور میں اس کی غلطی آج ہی ثابت کر دونگا۔ زندوں کو ثواب پہنچنا تو ثابت ہے پس اس کا امتحان آج ہی کر لو۔ کوئی گرم گرم کھانا کسی زندہ پیر کو بخشو پھر اس کا منہ کھول کر دیکھو کہ چھالے پڑے یا نہیں۔ اب محرم کا مہینہ قریب آتا ہے لوگ شربت کی سبیلیں جابجا مقرر کریں گے تو شربت کی تخصیص کیوں کرتے ہو۔ اسی خیال سے کہ شہداء پیاسے انتقال فرما گئے تھے۔ شربت سے ان کو تسکین ہو گی۔ تو صاحبو کیا آپ کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہیں اور اسی تمہارے شربت کے پیاسے ہیں استغفر اللہ! انہوں نے مرتے ہی حوض کوثر کا وہ شربت پیا ہے کہ جس سے پیاس کا نام بھی نہیں رہا۔ اور اگر تمہارے دلوں میں شہداء کی اتنی ہی قدر ہے اور تم سمجھتے ہو کہ وہ اب تک پیاسے

ہیں تو پیاس تو شربت سے بجھتی ہے وہ ان کے پاس کہاں پہنچا وہ تو دنیا ہی کے دس بیس آدمی پی گئے۔ ان کو تو اس کا ثواب پہنچا تو کیا وہ ٹھنڈا ہے خیال تو کیجئے کتنی بے اصل بات ہے اگر شربت ہی بخشنا ہے تو چاہیئے کہ جب محرم کا مہینہ جاڑوں میں آئے تو چائے پلایا کرو۔ اسوقت شربت پلانے کے کیا معنی جس سے پینے والوں کو اُلٹا زکام ہو جائے گا۔ اور پھر وہ بزبان حال بددعا دیگا۔ غرض یہ خیالات تو غلط۔ مگر اموات کو ثواب بے شک پہنچتا ہے۔

محسن اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی

مگر سب سے زیادہ اسکی مستحق تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کیونکہ آپؐ کے احسانات بے شمار ہیں پھر غضب ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھول جائیں اور آپؐ کی طرف سے قربانی نہ کریں خصوصاً جب کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کسی موقع پر فراموش نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ قربانی میں بھی یاد فرمایا۔ تو اگر سال بھر میں دو تین روپے آپ کی طرف سے قربانی کرنے میں صرف ہو گئے تو کون سی دشوار بات ہے اور خوب سمجھ لو کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو میں نے اموات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ حیاتِ انبیا علیہم السّلام کے خلاف ہے کیونکہ بوجہ ظاہری موت کے آپ کو میت کہہ سکتے ہیں ورنہ واقع میں آپ زندہ ہیں اور آپؐ کی حیات بہت قوی ہے جو کہ دوسروں کو حاصل نہیں انبیاء علیہم السلام کی حیات ایسی قوی ہے جو کہ دوسروں کو حاصل نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات ایسی قوی ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا بعد اُن کی وفات کے بھی جائز نہیں جیسے کسی زندہ خاوند کی بیوی سے نکاح جائز نہیں اور سب کی بیبیوں سے بعد خاوند کی وفات کے شادی کرنا جائز ہے۔ حتیٰ کہ شہداء جن کی حیات بعد شہید ہونے کے اموات مومنین سے قوی ہوتی ہے کہ ان کے بدن کو زمین نہیں کھا سکتی مگر اُن کی بھی بیبیوں سے بعد مرجانے کے نکاح جائز ہے۔ معلوم ہوا کہ انبیا علیہم السّلام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی تر ہے۔ حدیث ابن ماجہ میں ہے اِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ

حَیٌّ یُرْزَقُ۔ (انبیاء اللہ زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے) اب یہ بات رہ گئی ہے کہ جب مُردوں کی طرف سے قربانی جائز ہے تو گوشت کو کیا کیا جائے۔ اسمیں تفصیل ہے اگر مُردہ یہ وصیت کر کے مرا ہے کہ میرے مال میں سے قربانی کر دیجیو۔ مثلاً ذی قعدہ میں کوئی مرا اور اس نے یہ وصیت کی تو اس کے قربانی کے گوشت کو تو خیرات کرنا واجب ہے اور اگر اس کے مال سے نہیں کی خواہ وصیت کی ہو یا نہ کی ہو تو اس کے گوشت کا وہی حکم ہے جو اپنے مال سے قربانی کرنے کا حکم ہے۔

غنی اور فقیر کا فرق

ایک مسئلہ یاد کرنے کے قابل اور ہے جس کی بہت ضرورت پڑتی ہے کہ اگر غنی قربانی کرے تو اس کے اور احکام ہیں اگر قربانی کرنے والا غنی ہو تو یہ حکم ہے کہ اگر وہ کوئی حصہ خریدے تو اس کو جائز ہے کہ اس کے عوض میں دوسرا بدل لے اور اگر دوسرا حصہ خرید لیا اور پہلا بھی موجود تھا تو اس کے ذمہ ایک ہی واجب ہے لیکن اگر دوسرا حصہ پہلے سے کم قیمت ہو تو درمیانی قیمت کا تصدق مستحب ہے۔ مثلاً پہلا حصہ تین روپے کا تھا اور دوسرا حصہ دو روپے کا تو اس کو غنی کو ایک روپیہ صدقہ کر دینا مستحب ہے اور اگر دونوں کو ذبح کر دے تو بہتر ہے اور اگر وہ محتاج ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے ذمہ ابتداءً قربانی واجب نہیں۔ مگر جانور خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے تو جتنے جانور یا جتنے حصے خریدے گا سب کی قربانی واجب ہو جائے گی۔ البتہ اگر حصہ اپنا بدل لے تو ایک ہی حصہ واجب رہتا ہے اور حصوں کے وجوب میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ غریب پر زیادہ سختی ہے حالانکہ شریعت نے کیا کیا اس نے خود اپنے اوپر سختی کی کہ اول ایک جانور خریدا پھر دوسرا خرید لیا تو شریعت نے سختی کہاں کی۔ بلکہ اس کی تو یہاں تک رعایت ہے کہ اگر غریب کا جانور مر جائے تو اس کے ذمہ سے قربانی ساقط ہے دوسرا جانور خریدنا واجب نہیں اور اگر غنی کا جانور مر جائے تو دوسرا خرید کر قربانی کرنی پڑے گی۔ پس مسئلہ یہ ہے کہ اگر غنی اپنے حصہ کو یا جانور کو تبدیل کرے تو جائز ہے۔ مگر درمیانی قیمت کا تصدق واجب ہے اور اگر غنی نے بہ نیت قربانی کئی

جانور خرید لیے تو اس کے ذمہ ایک ہی واجب ہے اور فقیر اگر ایک دو تین جانور خرید لے تو سب کی قربانی واجب ہے خوب سمجھ لو۔ مگر حصّہ بدلنے کی صورت نازک ہے اگر غریب نے ایک حصّہ خریدا پھر اس کو بدلنا چاہا تو اگر یہ کیا کہ دوسرا حصہ خرید کر پھر نیت پہلے کے بیچنے کی رکھی تو اس صورت میں دونوں واجب ہوگئے تو اس کو یوں کرنا چاہیئے کہ دوسرا حصہ پہلے دوسرے آدمی کو خریدنے دے اس کے بعد اپنے حصّہ سے بدل لے تو غریب کو شریک قربانی کرنا مشکل ہے اور ہو تو ایسا ہو کہ طبیعت کا بھی غریب ہو کر تبلانے سے مان لے یہ بات بہت یاد کرنے کے قابل ہے۔

حرام جانور کی قربانی

ایک یہ مسئلہ ہے کہ بعض لوگ قربانی کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ جانور شریعت کی رو سے ملک طیب ہے یا ملک خبیث تو بعض دفعہ ملک خبیث ہوتی ہے وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں گو واجب اتر جاتا ہے اور بعض دفعہ ملک ہی نہیں ہوتی۔ جیسے چلتی کا بکرا کہ سال بھر میں ایک دفعہ زمیندار کو دیا جاتا ہے یہ آمدنی حرام ہے کہ دینے سے بھی اس کا کوئی مالک نہیں اور وجہ یہ ہے کہ گھاس کسی کی ملک نہیں اس میں سب کا حق ہے وہ دو طرح ملک ہو سکتی ہے۔ کاٹنے سے یا کھیت کی طرح سینچنے سے بھی ملک ہو جاتی ہے مگر یہ جو ہزاروں بیگھہ کا رقبہ پڑا ہے وہاں کون آبپاشی کرتا ہے تو کسی کی ملک نہیں ہے۔ اس سے سب کو انتفاع جائز ہے اس کی مثال آب باراں ہے کہ اس کا کوئی مالک نہیں تو گھاس کا بھی کوئی بھی مالک نہیں جس کا گھر یا چل جائے تو مالک ہی ہے تو گھاس کے عوض جانور لینا ہرگز جائز نہیں۔ اور اگر کسی نے لیا تو وہ اس کی ملک میں نہیں آتا۔ بلکہ اسی کا ہے جس نے دیا ہے لینے والے کو اس میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں۔ اور اگر ذبح کی قربانی کی تو ادا نہ ہوگی۔ بلکہ خود اس کے لیے اس کا تجویز کرنا معاذ اللہ ایسا ہے جیسے غلیظ کو کسی بڑے عظیم الشان حاکم کے پاس تحفۃً لے جائے خدا کا خوف کرنا چاہیئے اول تو یہ جانور لینا نہ چاہیئے اور اگر خیطنت سر پر سوار ہو اور لے ہی لو تو اس کی قربانی تو نہ کرو۔ اور قربانی بھی کرو تو خدا کے لیے اُسے خود ہی کھاؤ کسی اور مسلمان

بھائی کو تو مت کھلاؤ۔ کوئی خود گوہ کھائے تو دوسروں کو تو نہ کھلائے۔

اکل حلال کا اثر

اور دعوت میں اس کی ہمیشہ رعایت کرو کہ حلال کھانا کھلاؤ خود حرام کھاؤ تو کھاؤ۔ دوسرے کو تو نہ کھلاؤ دیکھو حرام کھانے سے دل میں ظلمت ہوتی ہے اور اہل اللہ کو پتہ بھی چل جاتا ہے اور ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے حتیٰ کہ کبھی قے ہو جاتی ہے۔ جیسے مولانا مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ کاندھلوی کی مشہور کرامت تھی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مشتبہ کھانا کبھی ہضم نہیں ہوا۔ اسی وقت نکل جاتا تھا۔ ورنہ ظلمت اور پریشانی قلب تو ضرور ہوتی ہے۔ تو کھانا ایسا ہونا چاہیے کہ جس میں حکومت وغیرہ کسی چیز کا واسطہ نہ ہو کیونکہ دعوت واجب تو ہے نہیں۔ مستحب ہے اور حرام کھانا کھلانا حرام ہے۔ تو جس کے پاس حلال کھانا نہ ہو اس کو کسی کی دعوت نہ کرنا چاہیے۔ اور اس کی ضرورت کیا ہے کہ کھانا مرغن ہی کھلاؤ سادہ کھلاؤ مگر حلال ہو۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت بیان فرماتے تھے کہ دیوبند میں ایک عبداللہ شاہ تھے گھاس کھودا کرتے تھے۔ واقعی فقیری ان کی تھی اور آجکل تو فقیری دعوتیں کھانے کا نام رہ گیا تو وہ روزانہ آٹھ پیسے کو گھاس بیچتے تھے جس میں سے چار پیسے اپنی والدہ کو دیتے تھے اور دو پیسے خدا کے واسطے فقیروں کو دیتے تھے اور دو پیسے اپنے خرچ کے لیے خود رکھتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ان حضرات سے کہا کہ مولوی صاحبو! میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ کے پاس ہے کہاں جو دعوت کریں گے۔ فرمایا وہ جو خیرات کے پیسے نکالتا ہوں وہ جمع کر لوں گا۔ سب نے منظور کر لیا۔ واقعی دعوت بھی ایسوں کی کرے۔ آجکل تو اگر مرغی نہ ہو تو دعوت قبول نہیں کرتے۔ میرے ماموں ایک پیرزادے کی حکایت بیان کرتے تھے کہ وہ ایک جگہ پہنچے اور اپنی ایک مریدنی کے یہاں ٹھہرے اس نے طعام کا سامان کیا تو ایک دوسری مریدنی آئی اس نے اصرار کیا کہ میرے یہاں کھانا کھا لیجئے۔ پہلی مریدنی نے کہا کہ تیرے یہاں کیسے کھا سکتے ہیں ٹھہرے تو میرے یہاں دونوں میں خوب لڑائی ہونے لگی تو پیرزادے نے کہا کہ اس میں لڑائی کی کیا بات ہے آج تو یہاں

کھانے دو تمہارے یہاں پھر کھالیں گے تو اس نے کہا بہت اچھا۔ مگر میں نے آج مرغ پکایا تھا۔ مرغ کا نام سن کر پھر پھسل پڑے۔ پہلی سے کہنے لگے کہ بی تمہارا ہی کیا حرج ہے آج اسی کے یہاں کھانے دو تو پہلی مریدنی نے دوسری کو بڑی بحث بات کہی کہ جا تو بڑی ہے ایسا کام کرائے۔

خلاصہ یہ کہ آجکل کی پیرزادگی تو یہ رہ گئی ہے ایک کہ حضرات تھے کہ گھاس کھودنے والے کی خشک دعوت قبول فرمالی اس سے بھی زیادہ میں سناؤں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک حکیم صاحب کے مکان پر تشریف لائے تو حکیم صاحب نے صاف کہدیا کہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے اگر اجازت ہو تو اور کسی دوست کو کھانا پکانے کا مشورہ دوں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں تمہارا مہمان ہوں اگر تمہارے یہاں فاقہ ہے تو ہم بھی فاقہ ہی سے رہیں گے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات ہیں اللہ والے۔ شام کو مغرب کے قریب حکیم صاحب کے پاس کہیں سے کچھ روپے آگئے تو خوب دعوت کی۔ چنانچہ عبداللہ شاہ صاحب نے پانچ آنے جمع کیے اور پیسے لاکر دیدیے کہ میں تو کہاں جھگڑا کروں گا۔ میرے اہل وعیال نہیں ہے آپ خود بیٹھے چاول پکاکر کھالیجئے اور ایک لمبی فہرست بتلادی کہ اتنے آدمیوں کی دعوت ہے جس میں سب بزرگ آگئے اور دعوت کا انتظام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا کہ کوری ہانڈی منگائی اور پکانے والے کو وضو کرایا۔ جب وہ وہ کھانا تیار ہوا تو دو دو لقمے سب نے اس میں سے کھائے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ دو لقمے کھاکر مہینہ بھر تک ایک نور دل میں رہا یوں جی چاہتا تھا کہ سب ماسوی اللہ کو چھوڑ کر یکسو ہو جاؤں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یا اللہ! جس کی پاک کمائی کے دو لقموں میں یہ نورانیت ہے اس شخص کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی۔ جو دونوں وقت یہی غذا کھاتا ہے یہ تو حلال کھانے کی حکایت تھی جس کا یہ اثر ہوا۔

حرام کی نحوست ایک دوسری حکایت حرام کھانے کی مولانا نے خود اپنی بیان فرمائی کہ ایک رئیس کے یہاں سے لڈو آئے تھے اس میں

سے ہیں نے ایک کھالیا۔ ایک ماہ تک قلب کی یہ حالت تھی کہ یوں وسوسہ ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ کوئی حسین عورت ملے تو متمتع ہوں۔ فرماتے تھے کہ خدا خدا کر کے ایک مہینہ کے بعد اس کا اثر زائل ہوا۔ اور میں سخت پریشان رہا۔ اگر حرام سے خود نہ بچو تو دوسروں کو تو مت کھلاؤ خصوصًا ایسے مال سے قربانی کرنا تو ہرگز نہ چاہیئے۔ اس صورت میں تو جانور کا بکرا ملک ہی نہیں ہوتا۔

جانور کے خرید میں احتیاط

ایک وہ صورت ہے کہ ملک تو ہو جاتی ہے مگر خبیث ہوتی ہے جیسے حصے پر جانور دیتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص نے اپنی گائے کا بچہ کسی دوسرے کو پالنے کے واسطے دیا اور اجرت یہ قرار دی کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اس کی قیمت لگا کر نصفا نصف بانٹ لیں گے یا تو مالک آدھی قیمت دیکر اس کو لے لیگا یا پالنے والا آدھی قیمت دیکر لے لیگا یہ عقد ناجائز ہے۔ مگر پہلی صورت میں کہ مالک نے پالنے والے کو آدھی قیمت دیکر جانور اپنے پاس رکھا اس جانور میں کوئی خباثت نہیں وہ حلال طیب ہے اگرچہ عقد فاسد کرنے کا گناہ ہوا۔ اور دوسری صورت میں کہ پالنے والا جانور کو لے اور مالک کو آدھی قیمت دے اس کی ملک خبیث ہے اور برابر خبیث رہیگا۔ اسلیئے ایسے جانور کی بھی قربانی جائز نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ (اللہ تعالےٰ پاک ہیں اور پاک ہی چیز کو قبول فرماتے ہیں) اگرچہ قربانی کر دینے سے واجب ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ مگر مقبول نہیں

گوشت کی تقسیم

اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ کلہ پارچوں میں کمینوں کا حق سمجھا جاتا ہے تو اگر حق الخدمت سمجھ کر دیا تو اس قدر گوشت کے برابر قیمت تصدق کرنا واجب ہے گو لوگ تو یہ کہا کرتے ہیں کہ قربانی ہی نہ ہوگی۔ تاکہ لوگ اس کو چھوڑ دیں۔ اور بالکل نہ کریں۔ کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس قدر گوشت کی قیمت تصدق کردو۔ تو لوگ دینا تو چھوڑیں گے نہیں اور تصدق بھی نہ کریں گے۔ مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ احکام صاف صاف ہم کو بیان کر دینا چاہیئے جس کا دل چاہے مانے یا نہ مانے رہی اس کی دلیل کہ قربانی ہو جائے گی تو میں طالب علم کو بتادوں گا۔ بعض عوام اس

کو نہیں سمجھ سکتے۔ اب رہی یہ بات کہ کمین گالیاں دیں گے تو اہل ہمت کے لیئے تو یہ جواب ہے کہ اگر گالی دیں بلا سے کچھ پرواہ نہ کرو بلکہ اور خوش ہونا چاہیئے کہ اس کی نیکیاں تم کو مل رہی ہیں۔ ایک بزرگ کا قاعدہ تھا کہ ان کو جو کوئی گالی دیتا اس کو مٹھائی بھیجتے۔ اور راز اسمیں یہی ہے کہ اس نے اپنی نیکیاں تمہیں دیں تو مٹھائی اس سے بہت کم قیمت ہے اس نے تم پر بڑا احسان کیا۔ اسلیئے کیا اسکو مٹھائی دے کر بھی خوش نہ کیا جائے۔ مگر اہل ہمت کو میں ایک اور مشورہ دیتا ہوں کہ ان کمینوں کو بالالتزام نہ دیا کریں کبھی کبھی دے دیا کریں۔ مگر جب دیں غریب سمجھ کر دیں خدمتگار سمجھ کر نہ دیں۔ سو اس طرح دینے سے وہ اپنا حق نہ سمجھیں گے اور اگر گالیاں کھانے کی ہمت نہ ہو تو ہمیشہ دیدیا کرو۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہدو کہ تیرا حق تو کچھ ہے نہیں مگر تجھ کو غریب سمجھ کر دیتے ہیں۔ اس میں بھی حرج نہیں۔ مگر یہ کم ہمتی کی بات ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے جس کو اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اگر کئی شخصوں کے حصے ہوں تو سب کو بدون تقسیم کئے ہوئے یا بعض کو تقسیم کر کے اور بعض کو مشترک تصدق کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تو سن لو کہ جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ کچھ مشترک تصدق ہو گیا ہو اور بقیہ کو تقسیم کر لو۔ مگر اندازے سے بانٹنا حرام ہے اگر ایک طرف کچھ زیادہ کم چلا گیا تو سود کا گناہ ہوا۔ دیکھو! اگر چھٹانک بھر بھی ایک طرف زیادہ ہوا تو سود خواروں میں دونوں لکھے جائیں گے۔ ہاں! اگر ایک طرف زیادہ گوشت ہو اور دوسری طرف کلے پائے ہوں تو جائز ہے کیونکہ جنس بدل گئی۔

کھال کا مصرف

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کھال کا مصرف معلوم کر لینا چاہیئے۔ اس میں اکثر مؤذن ملّا مولویوں پر خفا ہوتے ہیں کہ انہوں نے ہماری آمدنی کم کر دی مگر میں ان کو سمجھاتا ہوں کہ ہم کھال دینے سے منع نہیں کرتے کھال مؤذنوں ہی کو دو۔ مگر اس طرح جس طرح ہم کہیں کہ اجرت سمجھ کر مت دو۔ یعنی مؤذن مقرر کرتے وقت یہ نہ کہا جائے کہ بقر عید میں کھال بھی ملا کرے گی۔ یہ تو گویا تنخواہ ہو گئی بلکہ اس سے کہدو کہ کھال میں تمہارا کوئی حق نہیں۔ اس کے بعد تنخواہ مقرر کر دو۔ جب تنخواہ دے چکو تو کھال بھی دیدو۔ کیونکہ وہ بھی غریب ہے اور کھال میں غریبوں ہی کا

حق ہے۔ تو ہم تو موذنوں کے خیر خواہ ہیں کہ تنخواہ الگ دلوائی۔ کھال الگ دِلوائی۔ ہاں یہ جو میں نے کہا کہ کھال بھی دے دو یہ صیغہ وجوب کا نہیں۔ بلکہ امر مستحب ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان کی خاطر سے غیر واجب کو ہم واجب کہدیں۔ اور یاد رکھو کہ اگر امام و موذن کو مسجد میں مقرر کرتے وقت کھال دینے یا نہ دینے کا ذکر بھی نہ ہو۔ تب بھی کھال دینا جائز نہیں۔ کیونکہ اَلْمَعْرُوْفُ کَالْمَشْرُوْطِ (معروف مثل مشروط کے ہوتا ہے) تو نہ سکوت جائز ہے نہ شرط ہاں یہ جائز ہے کہ اس وقت نفی کردو اور وقت پر دیدو۔ اسی طرح سقے کی تنخواہ میں بھی کھال دینا جائز نہیں۔ ابھی آپ لوگوں نے اللہ میاں کے کاموں کی تنخواہ مقرر کی کر لیوں بیگار سمجھ کر قربانی کی کھال سے پوری کی جاتی ہے اور کسی غنی کو خود کھال کا دیدینا یا اپنے کام میں لانا جائز ہے مثلاً ڈول بنوالو یا چرس بنوالو۔ مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ اگر اپنے کام میں لاؤ اور وہ شئے پرانی ہو کر فروخت کر دو تو یہ دام پھر خیرات کرنے پڑیں گے۔ جیسے چرس بنوالیا اور وہ پرانا ہو گیا۔ اور اس کو فروخت کیا تو ان داموں کو خیرات کرنا ضروری ہے اور مصرف اس کا وہی ہے جو تازی کھال کے داموں کا ہے کہ سید کو اور غنی کو اس کا دینا ناجائز ہے اور شروع وقت قربانی ۱۰ تاریخ ذی الحجہ کی بعد نماز عید کے۔ ہے اور ختم ۱۲ تاریخ کے غروب سے پہلے تک ہے لیکن دسویں کو افضل ہے اور گاؤں والوں کو جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی نماز سے پہلے بھی ذبح کرنا جائز ہے۔

ذبح کے مسائل

ایک مسئلہ اور قابل یاد رکھنے کے۔ ہے کہ جانور کے گلے میں ایک گھنڈی ہوتی ہے اس کے نیچے سے ذبح کرنا چاہیئے۔ اوپر ذبح نہ کرے کہ اکثر فقہاء اس کو حرام کہتے ہیں۔ احتیاط اسی میں ہے۔ دیکھو ایک برتن میں اگر کھانا رکھا ہو اور ایک شخص کہتا ہو کہ اس میں کتے نے منہ ڈالا ہے اور دوسرا کہتا ہے نہیں ڈالا تو تم اُس کو ہرگز نہ کھاؤ گے اسی طرح جانور کے ذبح کرنے میں خصوصاً قربانی کے معاملہ میں احتیاط پر عمل کرنا چاہیئے یہ بھی اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ کہاروں اور چماروں کو بھی قربانی کا گوشت دینا جائز ہے۔ جواب یہ ہے کہ جائز

ہے بشرطیکہ کسی کام کی اُجرت میں نہ دیا جائے کتابوں میں قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کی ایک دعا بھی لکھی ہے یاد رکھنا چاہیئے کہ بغیر اس دُعا کے بھی قربانی جائز ہو جاتی ہے یہ ضروری نہیں ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر آدمی جانور کو لیتے ہوں سب کو بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے اگر ایک بھی نہ کہے گا تو قربانی نہ ہوگی یہ بالکل غلط ہے صرف ذابح کو کہنا ضروری ہے اور ذابح ایسا شخص ہونا چاہیئے جو ذبح خوب سمجھتا ہوں ہر شخص کے ہاتھ سے ذبح کرانا مناسب نہیں۔

اور بچوں کی طرف سے قربانی واجب نہیں۔ صدقۂ فطر پر اس کو قیاس نہ کریں ایک بات زیادہ اہتمام کے قابل ہے وہ یہ کہ قصاب جانور کو ذبح کرنے کے بعد ٹھنڈا نہیں ہونے دیتے کھال کھینچنی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حرام ہے۔ جب جانور خوب ٹھنڈا ہو جائے اسوقت کھال کھینچنا چاہیئے۔ بعض لوگ نفس ذبح پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جانور کو تکلیف دینا ہے ہم کہتے ہیں کہ ذبح میں تکلیف نہیں ہوتی۔ موتِ طبعی میں زیادہ ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہو تو جو محبوبِ حقیقی کے امر سے ہو وہ سب محبوب ہے۔

ایک مسئلہ ضروری یہ ہے کہ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ گابھن کی قربانی بھی درست ہے جواب یہ ہے کہ جائز ہے پھر اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہیئے۔

اب میں ضروری احکام قربانی کے بیان کر چکا ہوں اگر کوئی اور مسئلہ دریافت کرنا ہو تو زبانی دریافت کر لیا جائے۔ بغیر پوچھے اپنی رائے سے عمل نہ کریں اب اللہ تعالےٰ سے دعا کی جائے کہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

الحج المبرور

مقبول حج

اصلاح حجاج کے سلسلہ میں "الحج المبرور" سے موسوم یہ وعظ بمبئی میں حکیم اجمیری صاحبؒ کے مکان پر ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۲۷ھ کو رات کے وقت ہوا، جو دو گھنٹہ تک جاری رہا حضرتؒ نے بیٹھ کر بیان فرمایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۵ تھی ——— اور مستورات زیادہ تھیں۔

سفرِ حج، یک گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی بھی تکلیف تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اسوقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا بس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچ کر جنتیوں کا ہوگا۔

الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن
ان ربنا لغفور شکور۔ الذی احلنا
دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا
نصب و لا یمسنا فیھا لغوب۔

وعظ

اَلحجُّ المُبرُور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نحمدہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ ونؤمِنُ بِہٖ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا ومن سیئاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہٖ اللّٰہُ فلامضل لہٗ ومن یضلل فلاھادی لہ وَنَشْھَدُ ان لاالٰہ الا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلی آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم۔

اَمّابعد: فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ ۝

تمہید یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے جسمیں حق تعالیٰ نے ایک بڑے ضروری امر کا امر فرمایا ہے۔ اور یہ قرآن شریف کا خاص حصہ ہے کہ تھوڑے سے الفاظ میں مقصود کا ہر پہلو سے بیان ہوجاتا ہے۔ اخلاص کے بارے میں جتنی باتیں بیان کرنا ضروری تھیں وہ سب ان تھوڑے سے لفظوں میں بیان ہوگئی ہیں۔ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور وعظ کا وقت مستورات کی مصلحت سے رات کا رکھا گیا ہے اسلئے وقت میں زیادہ گنجائش نہیں۔ کیونکہ رات کے وقت دیر تک بیان ہونے سے سننے والے گھبراجاتے ہیں۔ بعض پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اونگھنے لگتے

ہیں جس سے بیان کرنے والے کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے اسلیئے میں اُسکا خلاصہ عرض کیئے دیتا ہوں جو انشاءاللہ تھوڑے وقت میں بیان ہو جائے گا۔

اس آیت میں جس خاص ضروری بات کا امر ہے وہ اخلاص ہے۔ یوں تو اس کی ضرورت ہر وقت ہے اور ہر کام میں ہے اخلاص کے بدون کوئی دین کا کام مقبول نہیں ہوتا۔ مگر اسوقت جس خاص کام کے لیئے اخلاص کی ضرورت مجھ کو بیان کرنا ہے اس کے لیئے ایک خاص محرک موجود ہے وہ یہ کہ سامعین کو معلوم ہے کہ اس وقت اُن میں سے بہت سے حضرات کا حج کا ارادہ ہے جن میں مرد بھی ہیں اور مستورات بھی ہیں اور مجھے بھی بمبئی تک انہی کے پہنچانے کے لیے آنا پڑا ہے۔ اگرچہ میرے مشاغل اس قدر ہیں کہ مجکو اس سفر کے لیئے مہلت نہ مل سکتی تھی۔ مگر محض اس خیال سے یہاں تک چلا آیا کہ مجھے اگر حج کی توفیق دوبارہ نہیں ہوئی تو کم از کم حجاج کی خدمت اور راحت رسانی ہی کا کچھ ثواب لے لوں۔ اگرچہ میں کسی کی کچھ خدمت بھی نہیں کرسکتا۔ مگر غالباً میرے بمبئی تک ساتھ ہونے سے میرے رفیقوں کو بہت کچھ سہولتیں اس سفر میں ہوگئی ہوں گی۔ اور اگر سب کو نہیں تو خاص میرے متعلقین کو تو قوت اور انس ضرور رہا ہوگا۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ میرے یہاں تک آنے سے مشہور یہی ہوگیا کہ میں حج کو جارہا ہوں خیر یہ بھی ایک نیک فال ہے انشاءاللہ مجھے حجاج کی معیت میں حج ہی کا ثواب مل جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے الدال علی الخیر کفاعلہ کہ نیک کام کا راستہ بتانے والا بھی ثواب میں کرنے والے کے برابر ہے تو جب صرف دلالت کا ثواب کرنے کے مثل ہے تو اس مشقت کا ثواب کہ میں گھر سے بمبئی تک حجاج کی مصلحت سے اُن کے ساتھ آیا یہ بھی انشاءاللہ ثواب حج کے برابر ہی ہو جائیگا۔

پھر میں اسوقت حج کے کامل اور مقبول ہونے کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں۔ اگر اس بیان سے کسی کو نفع ہوگیا تو دلالت علی الخیر بھی پائی گئی جس کا ذکر حدیث میں صراحۃً موجود ہے۔ بہر حال بعض رفقاء کا ارادہ حج اس بات کا محرک ہوا کہ حج کے متعلق کچھ ضروری تنبیہات گوش گزار کردی جائیں تاکہ جس امر کا انہوں نے خدا کی توفیق سے ارادہ کیا ہے

اس کو آداب و شرائط کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہر چیز اپنے آداب و شرائط ہی کے ساتھ کامل ہوا کرتی ہے۔

قاعدہ عقلیہ

چنانچہ ایک ایسے ہی امر کی طرف اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے جس کو میں نے اسوقت تلاوت کیا ہے اور وہ امر جس کی طرف اس آیت میں تنبیہ ہے بہت ہی زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہ ایک قاعدہ مسلمہ عقلیہ ہے کہ ہر فعل میں جس چیز کی کمی ہوا کرتی ہے اس کا تدارک دوسرے محسنات سے مقدم ہوتا ہے یعنی اگر ایک کام میں کمی نہ ہو گو زوائد بھی اُسمیں نہ ہوں وہ تو مقصود کے لیے کافی ہے اور جس کام میں اصل ہی سے کمی ہو گو محسنات بھی اُسمیں ہوں وہ ناکافی ہوتا ہے پس ہر کام کی تکمیل کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ان کوتاہیوں کو پورا کیا جائے جن پر اس کی صحت اور مقبولیت موقوف ہے پھر اگر خدا ہمت دے تو اور نوافل اور زوائد کو بھی پورا کیا جائے۔ جن سے اس کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے اور اگر نوافل وزوائد کو پورا ابھی نہ کیا جائے تو حسن اصلا تب بھی رہے گا۔ اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے کسی کام میں حسن پیدا نہیں ہوسکتا۔

دیکھئے! اگر ایک مکان میں تمام ضروریات موجود ہوں کسی معتبر چیز کی کمی نہ ہو مگر استرکاری اور بیل بوٹے نہ ہوں تو اس مکان کو ناقص نہ کہا جائیگا۔ اور اگر اُسمیں باورچی خانہ یا غسل خانہ یا اور کوئی ضروری چیز نہ ہو تو چاہے اُسمیں ہزار بیل بوٹے ہوں اُس کو یقیناً ناقص کہا جائے گا۔ اور سب یہی کہیں گے کہ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں۔ اسی طرح ہر چیز میں غور کر لیا جائے تو اس عقلی قاعدہ کی تائید ہر چیز میں ملے گی کہ اول ہر چیز کے نقصانات اور کوتاہیوں کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے محسنات اور زوائد کا مرتبہ بعد میں ہے۔ اسلیئے میں نے اس آیت کے مضمون کو زیادہ ضروری قرار دیا۔ کیونکہ اسمیں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس پر ہر نیک عمل کا درست اور مقبول ہونا موقوف ہے اور اُس میں آج کل بہت کمی کی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔

حج میں اخلاص کی زیادہ ضرورت

اگرچہ اخلاص کی کمی ہمارے اکثر اعمال میں آج کل ہے

اسلیئے بظاہر حج کی کوئی خصوصیت معلوم نہ ہوتی ہوگی۔ مگر میں ابھی بتلادوں گا کہ اخلاص کی ضرورت حج میں زیادہ ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ حج کی ایک خاص شان ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر اخلاص سے خالی ہو جاتا ہے اور یہ ہمارے سوء فہم کا نتیجہ ہے کہ اُس کی وہ خاص شان اس کو مقتضی ہو گئی کہ اسمیں اخلاص کم ہوتا ہے ورنہ اس شان کا اصلی مقتضا یہ تھا کہ اسمیں دوسرے اعمال سے زیادہ اخلاص کا اہتمام کیا جاتا۔

حج کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ساری عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو کام بار بار ہوتا ہے اسمیں اگر پہلی بار اخلاص نہ ہو تو آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے اگر کسی کو اول روز اخلاص نصیب نہ بھی ہو تو وہ کوشش کر کے دو چار روز یا دو چار ہفتوں میں اخلاص حاصل کر سکتا ہے۔ روزہ میں اتنا تکرار تو نہیں۔ مگر ہر سال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے۔ اگر کوئی شخص تمنا کے ساتھ بلوغ کے بعد پچاس سال کی عمر پائے تو پچاس مرتبہ زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دوسرے اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا آہستہ آہستہ ممکن ہے۔ اگر پہلی بار میں نہ ہو۔ دوسری تیسری بار میں ہو جائیگا۔

درجاتِ اخلاص

اور وجہ اسکی یہ ہے کہ اخلاص کے وجوداً و عدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیحہ کا قصد ہو یہ تو غایت اخلاص ہے۔ اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے ایک یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو نہ غایت صحیحہ کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کر لیا یہ درجہ بین بین ہے۔ اسکو اخلاص سے اتنا بُعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بُعد ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خدا تعالیٰ ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کچھ نیت نہ ہو یہ تو اخلاص کا درجہ کمال ہے ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاویگا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے۔

کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں۔ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ اسکو اخلاص سے قرب ضرور ہے مگر ظاہر ہے کہ فعل اختیاری فاعل مختار سے بدوں کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا۔ تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں اور نیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض عادت کی برکت ہے۔ جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لیے اب بار بار ارادہ اور عزم نہیں کرنا پڑتا۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت پر نظر نہیں ہوتی۔

تکرار کی وجہ سے عادت ہو گئی ہے اور عادت کے بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا پس معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اسمیں اخلاص سے من وجہٖ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو اسمیں اخلاص اسوقت تک حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ غایت صحیحہ کا تصور اور اس کا قصد نہ ہو۔

اسی وجہ سے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ریا ہمیشہ ریا نہیں رہا کرتی کیونکہ ریا کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے اُسمیں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا۔ پھر وہ اخلاص سے قریب ہو جاتا ہے۔

اب حج کو دیکھیے تو اسمیں تکرار بالکل نہیں یعنی فرض کے اعتبار سے گو نفل کے اعتبار سے کوئی کتنا ہی کرے مگر یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ حج ساری عمر میں فرض صرف ایک ہی بار ہے تو اسمیں جب تک غایت صحیحہ کا تصور اور قصد نہ کیا جائے گا۔ اسمیں اخلاص نہیں پیدا ہوگا۔ کیونکہ اسمیں تکرار نہیں اور تکرار کی وجہ سے عادت بھی نہیں۔ اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس احتمال کی بھی نوبت نہیں آتی کہ بالکل خالی الذہن ہو کر حج کیا جائے بس اسمیں دو ہی صورتیں ہیں یا تو غایت صحیحہ کا قصد ہوگا یا غایت فاسدہ کا۔ اسلئے اسمیں اخلاص کے اہتمام کی دوسری عبادات سے زیادہ ضرورت ہے یہی اسوقت مجھ کو بیان کرنا ہے کیونکہ یوں تو ہر عبادت کے لیے اخلاص کی ضرورت ہے مگر حج کے لیے خصوصًا اخلاص کی بہت ضرورت ہے کہ ساری عمر میں ایکبار اسکے ادا کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ پھر نہ معلوم

کسی کی قسمت میں دوبارہ بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسی عبادت میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیئے اگر خدانخواستہ اسمیں کوتاہی رہ گئی۔ تو بڑی ناکامی ہوگی۔ اول تو حج کرنا دوسری عبادات کی طرح آسان نہیں ہے۔ اور مالی و دونوں قسم کی مشقتیں اسمیں برداشت کرنی پڑتی ہیں دوسرے بار بار اس کی توفیق اور ہمت ہونا بھی محتمل ہے۔ اگر ایسی حالت میں یہ ساری محنت اخلاص سے خالی ہوئی۔ تو نیکی برباد اور گناہ لازم ہوا۔ پھر روپیہ الگ ضائع ہوا۔ اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہوگی۔

عظمت اخلاص اللہ نے آیت میں بہت اہتمام سے اخلاص کا امر فرمایا ہے قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ فرما دیجئے کہ مجھ کو امر کیا گیا ہے کہ خدا تعالےٰ کی عبادت اُسی کے لیے خالص کر کے بجالاؤں۔

یہ ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہر حکم کو ضروری ظاہر فرماتے تھے۔ آپ رسول تھے اور رسول کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کو مخلوق کی طرف پہنچائے۔ لہذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالےٰ خاص طور پر کسی حکم کے لیئے یہ فرمائیں کہ اسکو پہنچادو۔ مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لیئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچادو۔ تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتم بالشان ہونا سمجھا جائے گا۔ چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالےٰ نے حضورؐ کو لفظ قُلْ سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہدیجئے۔ ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آئندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے۔ پھر اس کے بعد اخلصوا نہیں فرمایا کہ لوگوں سے کہدو کہ اخلاص کیا کریں بلکہ اسکے بجائے أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ فرمایا کہ یوں کہدو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اس جملہ سے حضورؐ کا مامور بالاخلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت بہت بڑھ گئی۔ کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا۔ بہت ہی مہتم بالشان اور ضروری ہوگا۔ کہ رسول اور محبوب بھی اُس سے مستثنیٰ نہیں۔

محبوب خدا سے خدا کا معاملہ دنیا والوں کا اگر کوئی محبوب ہو تو اسکو احکام سے مستثنےٰ کر دیتے ہیں۔ مگر حق تعالےٰ کے یہاں یہ

یہ قاعدہ نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ مگر حضورؐ کو احکام سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ بلکہ خصوصیت اور محبوبیت اگر ظاہر ہوئی تو اس صورت میں کہ حضورؐ پر اور زیادہ احکام لازم کیے گئے۔ تہجد دوسروں پر فرض نہیں سنت ہے مگر حضورؐ پر ایک قول کے موافق فرض تھا۔ اور نافلۃ لک سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ تہجد آپؐ پر دوسروں سے فرض زائد ہے۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو گئی جو اولیاء کیلئے ایک مقام ایسا مانتے ہیں جہاں احکام شرعیہ اُن سے معاف ہو جاتے ہیں یہ بالکل غلط خیال ہے۔ ان لوگوں نے محبوبانِ خدا کو محبوبانِ دنیا پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح دنیا والوں کے محبوب تکالیف اور احکام سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں اسی طرح محبوبانِ خدا بھی مستثنیٰ ہو جاتے ہوں گے اور یہ خبر نہیں کہ یہاں محبوب ہی وہ بنتا ہے جو آئندہ بھی دوسروں سے زیادہ احکام کا بجالانے والا ہو۔ حق تعالیٰ کی محبت اضطراری نہیں کہ بلا وجہ کسی سے خواہ مخواہ محبت ہو جاوے اُن کی محبت اختیاری ہے اور وہ اُسی سے محبت کرتے ہیں جو اُن کا زیادہ مطیع ہو پس جو چیز محبت کا سبب ہے وہی اگر جاتی رہے گی تو محبوب کہاں رہے گا۔ پھر سب سے زیادہ محبوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر محبوبانِ خدا احکام سے مستثنیٰ ہوا کرتے تو سب سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہوتے۔ مگر احادیث و اقوالِ علماء سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پر دوسروں سے زیادہ احکام تھے اور جہاں ظاہر میں آپؐ کے لیے رخصت ہے وہ بھی حقیقت میں عزیمت ہے وہ رخصت اس شخص کے حق میں ہے جس کو حقوق ادا کرنے کا قصد نہ ہو اور جس کو حقوق ادا کرنے کا خیال ہو اور حق تعالیٰ سے عشق ہو اس سے پوچھیے کہ یہ کتنی بڑی مشقت ہے۔

حکمتِ تعددِ ازواج

مثلاً مخالفین کا اعتراض ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معاذ اللہ حظِ نفس کے لیے تعددِ ازواج کیا۔ نو بیبیوں سے نکاح کیا۔ اور افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ گو اعتراضاً نہیں بلکہ اپنے حظوظِ نفس کی گنجائش کے لیے چنانچہ بعض لوگ چند نکاح کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے

اگر کیا تو کیا حرج ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی تو چند نکاح کیئے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حظ نفس کے لیئے چند نکاح ہرگز نہیں کیئے حضورؐ کے لیے تعدد ازواج مصالح دینیہ کے سبب مشروع ہوا مثلاً آپ کی شان تھی شارع کی کہ آپ تمام امت کیلئے احکام الٰہی بیان فرمانے تھے بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور عورتیں خود حضور سے بلاواسطہ دریافت کر نہ سکتی تھیں اور مردوں کے ذریعہ سے کہاں تک جزئیات کی تحقیق ہوسکتی اسلیئے آپ کے لیئے احکام کی اشاعت میں تعدد ازواج کی مصلحت تھی کہ دوسری عورتیں ازواج کے واسطہ سے سوال بآسانی کر لیا کریں اور جوبات ان کی سمجھ میں نہ آئے اس کو ان ازواج مطہرات کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ لیا کریں۔

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ہزارہا مسلمان عورتوں کو احکام سمجھانے کے لیئے اگر آپ نو سے زیادہ بھی نکاح کرتے تب بھی کم تھا۔

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے تعدد ازواج میں اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے اور خود بھی عدل کے کسی دقیقہ کو نہیں چھوڑا گو بعض اقوال پر آپ پر واجب بھی نہ تھا۔ علاوہ اسکے نکاح میں دو جانبیں ہیں ایک افراط اور ایک تفریط۔ افراط یہ کہ باوجود قوت کے نکاح ہی نہ کرے۔ ایک تفریط کہ ضرورت سے زیادہ کرے۔ حضورؐ نے دونوں سے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی کہ جتنی ضرورت ہو اس سے آگے نہ بڑھے اور چار سے زیادہ کی کسی کو بھی ضرورت نہیں اور شاذ کا اعتبار نہیں اسلیئے اس سے زیادہ سب کے لیئے حرام ہے اب غور کیجئے کہ ایک شخص کو ایک نکاح کی ضرورت تھی اس نے ایک نکاح کر لیا یہ تو اعتدال ہے اور اگر ایک شخص کو دو یا تین کی ضرورت ہو اور اس نے ایک پر اکتفا کر لیا تو یہ مجاہدہ ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سنیئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بابت جو ملاحدہ کا اعتراض ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو حضورؐ کی قوت کا اندازہ نہیں۔ وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو معمولی آدمیوں جیسا سمجھتے ہیں حالانکہ عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ انبیاء علیہم السلام باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری اور بشری کمالات میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے سو اور ہزار بیبیاں ہونا۔ اہل کتاب میں مشہور ہے

اسی طرح ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم بھی قوت بشریہ میں دوسروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی اور ایک روایت میں چالیس مردوں کی قوت تھی۔ پس اگر آپ تیس یا چالیس نکاح بھی کرتے۔ تب بھی اعتدال سے کسی طرح باہر نہ ہوتے۔ کیونکہ آپ کو اس قدر قوت حاصل تھی پھر جب اتنی قوت پر آپ نے نو بیبیوں پر اکتفا کیا تو یہ مجاہدہ ہوا یا کہ حظ نفس؟ بہر حال یہ صورت اعتدال سے آگے کسی طرح نہ تھی بلکہ اعتدال سے گزر کر مجاہدہ میں داخل تھی۔

رعایتِ عدل پھر ضروری بات ہے کہ نو بیبیاں ہونے سے حقوق بھی آپ کے ذمہ بڑھ گئے خواہ لزوماً یا التزاماً۔ کیونکہ اسمیں علماء کا اختلاف بھی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر عورتوں کی باری مقرر کرنا اور برابری وغیرہ کرنا واجب تھا۔ آپ تبرعاً کرتے تھے بہر حال اسمیں چاہے اختلاف ہو مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ برابری اور عدل کا پورا لحاظ فرماتے تھے حتیٰ کہ بیماری میں بھی ایک کی باری میں دوسری کے گھر نہ رہتے تھے البتہ مرض وفات میں جب ازواج مطہرات نے دیکھا کہ حضورؐ کو حضرت عائشہؓ کے دن کا بہت انتظار رہتا ہے تو سب نے رضامندی کے ساتھ عرض کیا کہ بس اب آپ حضرت عائشہؓ ہی کے گھر میں تشریف رکھیں اور اس حالت میں ہر اک کے گھر جانے میں آپ کو کلفت پہنچتی ہے۔ اب خیال کیا جائے کہ جس شخص کو حقوق کے ادا کرنے کا اس درجہ خیال ہو اس کے لئے نو بیبیوں کی اجازت محض ظاہر میں ایک رخصت ہے ورنہ حقیقت میں بڑی مشقت ہے حتیٰ کہ بیبیوں میں عدل کرنا بڑی سلطنت کے عدل سے بھی مشکل تر ہے کیونکہ یہاں محض ضابطہ کا تعلق نہیں کہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے لے دونوں سے محبت کا تعلق ہے ہر اک کی تکلیف سے دل دکھتا ہے۔

پھر شریعت کی پابندی کا مقتضا یہ ہے کہ ظاہری برتاؤ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے ایسی حالت میں عدل کرنا بڑے مرد کا کام ہے اور حضورؐ صلے اللہ علیہ وسلم عدل کی اسقدر رعایت فرماتے تھے کہ آپ سے بڑھکر کوئی نہیں کرسکتا۔ اسکے بعد بھی آپ یہ فرمایا کرتے۔ اللھم ھذا قسمتی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک

ولا املك ۔ الٰہی یہ میری تقسیم ہے ان امور میں جو تیرے قبضہ میں ہیں۔ پس مجھ کو اس چیز میں ملامت نہ فرمائیے جو میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی محبت اور رجحان مثلاً میلان زیادہ آپؐ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا۔ تو یہ بات اختیار سے باہر تھی۔ مگر ظاہری برتاؤ میں آپؐ سب کی ساتھ عدل پورا فرماتے تھے۔ پس اس مشقت پر نظر کر کے وہ رخصت بھی رخصت نہ رہی بلکہ وہ بھی عزیمت تھی اب کس کا منہ ہے کہ اپنے آپ کو احکام سے مستثنیٰ سمجھے۔

اسلیئے فرماتے ہیں قل انی امرت کہہ دیجیئے کہ مجھکو امر کیا گیا ہے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اور آپ اس کے مامور ہیں تو وہ کیسا بڑا امر ہوگا۔

مسئلہ تصوف کا حل

آگے فرماتے ہیں اَنْ اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ اسمیں ایک بہت بڑا مسئلہ تصوف کا حل ہوگیا ہے آجکل ایک فرقہ ہے جس نے تمام شریعت کی روح نکالی لی ہے اور واقعی روح ہی نکال دی اور اپنی طرف سے دین کو مردہ کر دیا۔ لیکن اللہ متم نورہٖ ولو کرہ الکفرون خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ اگرچہ بد دین لوگ ناگواری ظاہر کرتے رہیں وہ لوگ احکام و عبادات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ نماز کا خلاصہ نکالا ہے ذکر کہ بس خدا کی دھن لگی رہنی چاہیئے نماز کی کیا ضرورت ہے۔ زکوٰۃ کا خلاصہ یہ نکالا کہ ہمدردی ہونا چاہیئیں روپیہ غریبوں کو دینے کی ضرورت نہیں حج کا خلاصہ یہ نکالا کہ تعلقات قطع کر دینی چاہیئیں مکہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں غرض تمام عبادات میں اخلاق کو اصل سمجھا ہے اور اعمال کو بیکار کر دیا۔

اس آیت میں ان کا جواب موجود ہے۔ حق تعالےٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مخلصا لہ الدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل یہی ہے کہ عامل کی قید اور اس کے تابع ہوتا ہے الا بدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا۔ معلوم ہوا کہ عبادات اصل ہیں اور احوال و کیفیات و اخلاق اُن کے تابع ہیں۔ اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام و عبادات کو بیکار سمجھے سارا قرآن اس سے

بھرا پڑا ہے۔ جا بجا عبادات کی تاکید اور اُن کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

حقیقتِ اخلاص اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی اس کے معنی وہی ہیں جو ورودِ شرع سے پہلے تھے خالص کہتے وہ ہے جسمیں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو۔ اخلاص عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جائے یعنی کوئی ایسی غرض اُسمیں ملی ہوئی نہ ہو جس کا حاصل کرنا شرعًا مطلوب نہیں ہے مثلاً نماز سے بزرگ مشہور ہونا زکوٰۃ دینے سے نام آوری اور حج سے حاجی کہلانا مقصود نہ ہو اور یوں کوئی نہ کوئی غرض تو ضرور ہوگی کیونکہ فاعل مختار کا فعل غرض سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس اخلاص کے یہ معنی نہیں کہ رضا حق اور جنت کی بھی غرض نہ ہو۔ کیونکہ یہ غرض تو مطلوب ہے حق تعالٰے فرماتے ہیں وَفِی ذالك فليتنافس المتنافسون اسمیں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہئے اور اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جن کی طرف رغبت کرنے کا امر خود قرآن میں موجود ہے وفی الحدیث اللهم انی اسئلك الجنة وما قرب اليها من قول او عمل۔ حدیث میں ہے کہ حضورؐ اس طرح دعا کیا کرتے تھے۔ اے اللہ! میں آپ سے جنت کی درخواست کرتا ہوں اور ان اقوال و اعمال کی جو جنت کی طرف نزدیک کر دیں۔ معلوم ہوا کہ جنت کی درخواست کرنا سنت ہے اسی لیئے میں نے اخلاص کی حقیقت یہ بیان کی تھی کہ عبادت کے ساتھ کوئی ایسی غرض نہ ملائی جائے جس کا حاصل کرنا مطلوب نہیں اور ثواب اور جنت کا اور عذاب سے نجات کا مانگنا مطلوب ہے۔ اسلیے یہ غرض اگر عبادت میں ملی ہوئی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔

بعض لوگ بے دھڑک کہہ ڈالتے ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں یا دوزخ کی پرواہ نہیں، ان لوگوں کو جنت و دوزخ کی حقیقت معلوم نہیں ورنہ ساری شیخی رکھی رہ جائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا۔ مگر حضورؐ نے بھی جنت کی طلب کی ہے اور جہنم سے پناہ مانگی ہے۔

اور بعض اہل حال سے جو اس قسم کے اقوال منقول ہیں وہ غلبۂ احوال میں اُن سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ کوئی اُن کے کمال کی دلیل نہیں حالت اکمل وہی ہے جو سنت کے موافق ہو۔ گروہ حضرات بوجہ غلبۂ حال کے معذور سمجھے جاتے ہیں اسوقت اُن کو جنت کی طرف التفات نہ تھا ورنہ جنت ایسی چیز نہیں جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو۔

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود رضائے حق ہے ہم اُن سے یہ کہتے ہیں کہ رضائے حق پر نظر کرتے ہوئے جنت کی درخواست ضروری ہے کیونکہ اول تو وہ محل رضا ہے جنت ہی میں حق تعالٰے کی رضا کا ظہور ہوگا۔ جب رضا مطلوب ہے تو محل رضا بھی مطلوب ہو جانا چاہیے ای الشئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ ہر شے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوا کرتی ہے مطلوب کے مقدمات اور وسائل بھی من وجہ مطلوب ہوتے ہیں لہٰذا رضا کے مطلوب ہونے سے بھی جنت کا مطلوب ہونا لازم آتا ہے پھر اُس سے بے پروائی کے کیا معنی؟

دوسرے جب حق تعالٰے کی رضا اصل مطلوب ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے امتثال اوامر سے یعنی احکام کی بجا آوری سے اور میں آیت قرآنی سے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالٰے جنت کی طرف رغبت کرنے کا امر فرماتے ہیں تو جنت کی رغبت کرنے اور اس کی درخواست کرنے سے بھی رضائے حق حاصل ہوگی کیونکہ اسمیں بھی ایک حکم کا امتثال ہے۔

چنانچہ اسی امتثال حکم کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے متعدد دعاؤں میں جنت کی درخواست کی ہے پس یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عبادات میں جنت اور ثواب کی طرف التفات کرنا اخلاص کے خلاف یا کمال کے منافی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جنت حق تعالٰی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جس کے سامنے دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں۔ مگر ہم کو دنیا کی نعمتوں سے بھی استغنا ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان دنیوی نعمتوں کی قدر اور شکر کا حکم کیا گیا ہے تو خدا کی اتنی بڑی نعمت سے استغنا اور بے پروائی کیونکر جائز ہوگی۔ پس جن بزرگوں سے ایسی باتیں منقول ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں وہ اُن سے غلبۂ حال میں صادر ہوئی ہیں اسوقت اُن کو جنت کی طرف التفات نہ تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبدیت تو یہ تھی کہ آپ کھانا تناول فرما کر یوں فرمایا کرتے

تھے غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا۔ یعنی میں اس کھانے کو ہمیشہ کے لیے رخصت نہیں کرتا (دوسرے وقت پھر اس کا محتاج ہوں گا) اور نہ اے خدا میں اس سے مستغنی ہوں۔ پھر جنت کی نعمتوں سے کون مستغنی ہو سکتا ہے۔

یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آجکل جو مریدوں کی عادت ہے کہ مشائخ کے سامنے جب کوئی ہدیہ پیش کرتے ہیں تو اکثر یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے یہ تو حقیر اور قابل چیز ہے یہ محاورہ قابل ترک ہے۔ بخدا اس لفظ کو سن کر میرا تو رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ مشائخ کیا چیز ہیں کہ وہ خدا کی نعمتوں سے مستغنی ہوں اور انکو خدا کی نعمتوں کی پرواہ نہ ہو۔ آخر وہ بھی انسان ہیں ان کو بھی کھانے پینے اور روپیہ پیسہ کی احتیاج ہوتی ہے۔ اگر ایک وقت پیشاب بند ہو جاوے اسوقت حقیقت معلوم ہو جائے کہ پیر صاحب دنیا کی چیزوں سے کتنے بے پرواہ ہیں یہ محض جہالت ہے اور جو مشائخ اس لفظ کو سن کر خاموش ہو جاتے ہیں ان کی ہمت ہے ایسے الفاظ کبھی شیخ کے لیے استعمال نہ کرنے چاہئیں جو انبیاء کے واسطے بھی بولنے جائز نہیں انبیا علیہم السلام بھی خدا کی سب نعمتوں کے محتاج تھے۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام کو خدا تعالے نے مرض سے شفا عطا فرمائی ہے وہ غسل کر رہے تھے اسی وقت ان کے اوپر سونے کی ٹڈیوں کی بارش آسمان سے ہوئی وہ ان ٹڈیوں کو فوراً جمع کرنے لگے حق تعالے نے فرمایا افلم اکن اغنیتک کہ کیا میں نے تمکو غنی نہیں کیا۔ انہوں نے عرض کیا بلے یارب ولکن لا غنا بی عن برکتک کہ خدایا آپ نے بیشک مجھے غنی بنایا ہے۔ لیکن آپ کے تبرک سے تو بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ پس خدا کی نعمتوں سے بے پروائی کسی کو کسی وقت نہیں ہو سکتی تو ہم خدا تعالیٰ کی رضا کے بھی محتاج ہیں جنت کے بھی محتاج ہیں ثواب کے بھی محتاج ہیں اور وہ یہ مقاصد ہیں جن کا اعمال دینیہ میں مطلوب ہونا ظاہر ہے ان کی نیت عبادات میں کرنا اخلاص کے خلاف نہیں۔

جب آپ کو اخلاص کی ضرورت اور اسکی حقیقت معلوم ہو گئی۔ اب یہ معلوم کیجئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ خود بھگتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ فقہاء اور صوفیہ۔ اور فقہاء
کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت ہی بڑی نعمت تھی۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میری ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر فقہاء
کو معلوم ہے کہ خدا کو اُن کی ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے من یرد اللہ
بہ خیرا یفقہہ فی الدین جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو
دین کی سمجھ یعنی فقہ عطا کرتے ہیں امام محمدؒ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا
کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا مجھ کو حق تعالےٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالےٰ نے
فرمایا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے جواب
ملا کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے۔ ہم نے تم کو فقہ اسی لیے عطا کیا تھا کہ تم
کو بخشنا منظور تھا۔

مگر اس سے مامون العاقبت ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جاوے کہ فقہاء پر سوء
خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں اسلیئے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ حق تعالیٰ اگر فقیہ کو عذاب کرنا چاہیں
گے تو فقہ کو اس سے سلب کر لیں گے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ فقہ کیونکر سلب ہو جاویگا۔ بات یہ ہے
کہ فقہ کتابوں کے پڑھ لینے کا نام نہیں۔ فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے
جس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے اور اس نور کو حق تعالیٰ جب چاہیں سلب
کر لیں وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے رہو۔ مگر چونکہ دین
کی سمجھ نہیں رہی۔ تم فقیہ نہیں ہو سکتے اور وہ نور فقہ طاعات اور تقویٰ سے بڑھتا ہے اور معاصی
سے سلب ہو جاتا ہے جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ کتابوں کا فقیہ ہے۔ حقیقی فقیہ نہیں اور
نہ اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔ اسلیئے خاتمہ سے اطمینان کسی
حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہو سکتا۔

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فقہ دین کی سمجھ کا نام ہے تو اسمیں کیا شبہ ہے کہ فقیہ صوفی
ضرور ہو گا۔ ہمارے فقہاء جتنے ہوئے ہیں سب صاحب نسبت اور صاحب معرفت
تھے۔ نسبت اور معرفت کے بغیر دین کی سمجھ کامل نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی فقہاء کی شان میں

میں فرمایا گیا ہے فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ جس کو دین کی سمجھ ہوگی۔ وہ شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھے گا اور اُس کی ایک چال نہ چلنے دے گا۔ اور کورے عابد کو تو شیطان جس طرح چاہے بٹی پڑھا سکتا ہے۔

ہم نے ایک عابد زاہد کو سفر حج میں دیکھا کہ نماز بالکل چھوڑ بیٹھے تھے۔ شیطان نے اُن کو اسی قسم کے پاکی اور ناپاکی کے توہمات میں مبتلا کر دیا تھا۔ فقیہ ان باتوں میں کبھی نہ آئے گا تو حدیث میں جس فقیہ کو ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری بتلایا گیا ہے یہ وہی فقیہ ہے جس کو دین کی سمجھ ہو صرف کتابیں پڑھنے والا فقیہ مراد نہیں۔ حضرات فقہاء شیطان کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے اسی لیئے انہوں نے پاکی اور ناپاکی کے مسائل میں بہت توسع فرمایا ہے۔

اور یہ ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ جو باتیں اُن کو پیش بھی نہ آئی تھیں اُن کو سوچ سوچ کر بیان کر گئے اور پھر قواعد ایسے بیان کر دیئے جن سے قیامت تک کی جزئیات کا حکم نکالنا آسان ہو گیا۔ ان مسائل کی ضرورت گھر بیٹھے نہیں معلوم ہو سکتی۔ مگر فقہاء ایسے تنگ نظر نہ تھے کہ گھر سے باہر ان کی نظر نہ جائے۔ فقہاء کے پیش نظر دریا کا تلاطم بھی تھا وہ اسکے احکام بھی بیان کر گئے ہیں کہ اگر چکر آتا ہو کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو نماز بیٹھ کر یا لیٹ کر ہی پڑھ لے اور دوران سر کی وجہ سے کپڑوں کے پاک کرنے اور دھونے کی طاقت نہ ہو نہ کوئی رفیق یہ کام کر سکتا ہو نہ زیادہ کپڑے اس کے پاس ہوں تو اُسی ناپاک کپڑے سے نماز پڑھ لے۔ فقہاء نے اسمیں بھی کلام کیا ہے کہ اگر جہاز وغیرہ میں چکر نہ بھی ہو تب بھی بیٹھ کر نماز جائز ہے یا نہیں اگرچہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ چکر نہ ہو تو کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنا واجب ہے مگر اس سے حضرات فقہاء کی وسعت نظر تو معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے جزئیات کا بہت احاطہ کیا ہے۔

استنجے کی بابت بھی فقہاء نے خوب تفصیل لکھی ہے کہ کس حالت میں فرض و واجب ہے اور کس حالت میں سُنّت ہے۔ حضرت اگر فقہاء کی یہ رخصتیں اور

اور تحقیق نہ ہو۔ جہاز میں تو سب نماز روزے رخصت ہو جاتے۔ یہاں وہم نہیں چل سکتا۔ جہاز میں بڑے بڑے وہمیوں کا وہم رخصت ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تو بالعوض رخصت ہوتا ہے اور مدینہ کے راستہ میں بلاعوض رخصت ہو جاتا ہے۔ سفر مدینہ کے بعد پھر وہم پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں پانی بھی کم ملتا ہے اور راستہ میں پیاس کی بھی شدت ہوتی ہے بڑے بڑے وہمی وہاں جھک مار کر پانی کم خرچ کرتے ہیں تاکہ پیاسے نہ مر جائیں۔ پھر اس پر غضب یہ ہوتا ہے کہ حاجی اپنا خون خشک کر کے پانی بچاتا ہے اور بدو مشک کھول کر بہت سا پی جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کی قافلہ میں بدوؤں نے حاجیوں کا پانی پینا شروع کیا۔ مولانا شیخ البدویین کے پاس تشریف لے گئے ادیب بہت بڑے تھے۔ آپ نے جا کر اس سے کہا کہ ان بدوؤں کو منع کر دو کہ ہمارا پانی نہ پئیں۔ ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہے اس میں ایک جملہ آپ نے یہ بھی فرمایا ھم لا یشربون ماءنا بل یشربون دماءنا۔ یہ لوگ ہمارا پانی نہیں پیتے بلکہ لہو پیتے ہیں۔ شیخ البدویین نے کہا انت فصیح تم بہت فصیح و بلیغ ہو۔ اس فصاحت کا یہ اثر ہوا کہ اس نے بدوؤں کو روک دیا کہ شیخ کا پانی کوئی نہ پیئے۔ غرض مدینہ کے راستے میں تو وہم رہتا ہی رہتا نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ صرف کرتے ہیں ان کو پانی برتنے کا طریقہ نہیں آتا۔ ورنہ اگر طریقہ سے وضو کریں تو بہت کم پانی صرف ہوتا ہے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ تر بدن کو لگ کر صرف نہیں ہوتا زیادہ حصہ بدن کو لگنے سے پہلے ہی ادھر ادھر گر جاتا ہے تو اگر اس کا خیال رکھا جائے کہ ہر چلو پانی بدن سے اچھی طرح لگ کر زمین میں گرے تو بہت تھوڑے پانی میں بافراغت وضو ہو جاتا ہے۔ تو حج میں ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ نماز ہی کو بہت سے لوگ حذف کر دیتے ہیں۔

حج کی لڑائی

ایک معصیت خاص حج کے متعلق زیادہ پیش آتی ہے کہ گھر سے نکل کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ حج کی لڑائی مشہور ہے۔ اچھے اچھے

دوستوں بلکہ باپ بیٹوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے اور پیر مرید کا تعلق حالانکہ باپ بیٹے سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر حج میں پیر مرید کو بھی لڑتے دیکھا ہے مگر کمال یہ کہ پیر پھر بھی ان سے خفا نہ تھے۔ باوجودیکہ شریعت میں سب سے زیادہ حق باپ کا ہے اس کے استاد کا اس کے بعد پیر کا۔ مگر یہ طبعی بات ہے کہ محبت پیر کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ پیر کا تعلق خالص دینی تعلق ہے دنیا کا اسمیں لگاؤ نہیں اور جس تعلق میں دنیا کا لگاؤ نہ ہوگا وہ ضرور مستحکم ہوگا۔ پیر چونکہ خالص دین کی تربیت کرتا ہے اسلیئے اس سے زیادہ کوئی علاقہ مؤثر نہیں۔ مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حج میں پیر اور مرید کا علاقہ بھی لڑائی سے نہیں روکتا۔ اب یا تو یہ اس سفر کی خصوصیت ہے یا ان پیر صاحب کو کچھ دنیا ان سے مطلوب ہوگی اسلیئے ان کی وقعت مریدوں کی نظر میں نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے قافلہ میں بھی لڑائی شروع ہو گئی ہے اور اسکے آثار دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا ہے اور ابھی تو جہاز کا سفر بھی شروع نہیں ہوا۔ بمبئی تو گویا گھر ہی کے مثل ہے جب یہیں یہ باتیں شروع ہو گئیں تو آئندہ کا اور اندیشہ ہے اسلیئے اسی وقت سے اسکی اصلاح کی ضرورت ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ گناہوں سے طاعات کا ثواب کم ہو جاتا ہے تو یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جس ثواب کے لیئے روپیہ خرچ کیا جائے۔ جان پر مشقت برداشت کی جائے اس کے ثواب کو دو چار باتوں میں کم کر دیا جائے۔ میں کئی روز سے ایسے آثار دیکھ رہا ہوں۔ مگر میری عادت نہیں کہ خود کسی کے معاملہ میں دخل دوں میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے۔ اسلیئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑتا پھروں اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے تو میں بھی نرمی سے کہدیتا ہوں اور بعض بزرگ ایسے بھی ہیں جن پر شفقت کا غلبہ زیادہ ہے وہ خود اپنے متعلقین کے معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی اگر کسی وقت یہ رنگ غالب ہوتا ہے

تو ایسا کرتا ہوں مگر میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے یہ دونوں مذاق ہیں اور دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے۔

اسلیئے کسی مذاق پر طعن کا کسی کو حق نہیں۔ اگر مجھ سے طریقہ دریافت کیا جائیگا بتلادوں گا۔ ورنہ جیسا کریں گے خود بھگتیں گے۔ حج کے سفر میں زیادہ تر لڑائی جھگڑے اس سے پیش آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے توقع ہوتی ہے۔ پھر جب اس توقع کے خلاف برتاؤ ہوتا ہے تو جھگڑے پیش آتے ہیں اسی لیئے فقہاء نے لکھا ہے کہ سفر حج میں زاد میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس شرکت کی وجہ سے ہر شریک کو دوسرے سے امداد اور راحت رسانی کی توقع ہوتی ہے اور سفر کی حالت میں بعض دفعہ انسان اپنی بھی امداد نہیں کرسکتا تو دوسرے کی کیا خاک امداد کریگا۔ اسلیئے ضرورت اسکی ہے کہ ہر شخص اپنا سامان کھانے پینے کا جدا رکھے اور انتظام پکانے کا بھی الگ کرے۔ دوسرے کسی سے کچھ توقع نہ رکھے اس کے بعد اگر کسی سے ذرا سی بھی راحت پہنچ جائے گی۔ اس کی قدر ہوگی اور نہ پہنچے گی تو شکایت نہ ہوگی۔ بہرحال ان وجوہ سے یہ قصے حج سے پہلے ہی شروع ہوگئے ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے خدا تعالیٰ اس کو دفع کرے یہ بھی انہی معاصی میں سے ہے جو حج سے پہلے ہوتی ہے

حج کی رقم میں احتیاط

بعض لوگ ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے۔ رشوت وغیرہ کی رقم لیکر حج کو جاتے ہیں کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے رب شعث اغبر یطیل سفرہ وملبسہ حرام وما کلہ حرام یرفع یدیہ یدعوا اللہ فان یستجاب لہ اھ اوکما قال۔ بہت سے پراگندہ بال خستہ حال آدمی جو لمبا سفر کرتے ہیں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ لباس بھی حرام کا ہے اور غذا بھی حرام ہے پھر ان کی دعا کیونکر قبول ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی اور دعا بھی عبادت ہے تو اسی سے دوسری عبادات کا حال بھی سمجھ لیا جائے کہ اور عبادات بھی حرام مال سے اگر

کی جائیں گی قبول نہ ہوں گی۔ پس حرام کمائی کے ساتھ حج بھی قبول نہ ہوگا۔ اسلئے اس کا بہت خیال کرنا چاہیئے کہ زاد وراحلہ اور روپیہ وغیرہ حرام مال سے نہ ہو حلال کمائی ہونی چاہیئے

تقوے کا ہیضہ

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ آجکل تو اکثر آمدنیاں حرام ہی ہیں پھر کسی کا بھی حج مقبول نہ ہوگا۔ سو یہ بالکل غلط ہے۔ وہی فقہا، جو رحمت عالم ہیں ان سے پوچھو دریافت کرو جو آمدنی ان کے فتوے سے جائز وحلال ہو اس کو حلال سمجھو اور فتوے کی رو سے بہت سی آمدنیاں اب بھی حلال ہیں۔ اسمیں زیادہ غلو کرنے اور تقوے بھگارنے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالےٰ فرماتے ہیں لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُم دین میں غلو مت کرو۔ یعنی بات بات میں شبہات مت نکالو۔ بال کی کھال نہ کھینچو۔ ظاہر میں تو غلو اچھا معلوم ہوا کرتا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسمیں کیا حرج ہے یہ تو تقویٰ ہی ہے کہ میں ذرا ذرا بات کی چھان بین کرتا ہوں۔

بعض لوگ عوام کے سامنے ایسی حکایات بیان کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب روزی حلال آئے انہوں نے کہا چند روز پہلے تک تو حلال تھی مگر ایک بار میرے بیل دوسرے کے کھیت میں جا گھسے وہاں کی مٹی اُن کے کھروں کو لگ گئی پھر وہ میرے کھیت میں مل گئی پھر اسمیں غلہ پیدا ہوا اسلئے حلال نہیں رہا۔ مگر اس غلو کے انجام ابتلاء فی المعصیت ہوجاتا ہے یعنی تھوڑے دنوں میں یہ تقوے بھی جاتا رہتا ہے اور فتوےٰ بھی۔ کیونکہ جب ان توہمات کے ساتھ حلال روزی کوئی سمجھ میں نہیں آتی تو شیطان یہی پڑھا دیتا ہے کہ بس دنیا میں حلال روزی تو میسر آ نہیں سکتی اور بدوں کھائے پیئے گذارہ نہیں چل سکتا تو اب حلال وحرام کی فکر ہی فضول ہے جو آجائے اور جس طرح آجائے کھا لینا چاہیئے ہمیشہ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کیونکہ توہمات کا سلسلہ کم نہیں ہوا کرتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پھر آخر کار گھبرا کر اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے جس کا شریعت نے حکم کیا تھا۔

اسی واسطے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص گیہوں کا ایک دانہ لیے پھرے کہ یہ

کس کا ہے اسکو سزا دینی چاہیئے۔ کیونکہ یہ تقوائے کا ہیضہ ہے کہ آپ ایک دانہ کو پکارتے ہو بیچتے پھرتے ہو۔ واقعی فقہاء نے شیطان کے فریبوں کو خوب ہی سمجھا ہے۔ ظاہر میں تو یہ حکم فقہاء کا گراں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے دانہ کو پڑا ہوا پائے تو اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ مگر فقہاء کی نظر انجام پر ہے کہ اس تقوٰی کی انتہاء معصیت ہے۔

مالِ حرام سے حج

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اسکو بدل لیتے ہیں گویا خدا سے بہانے کرتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ بدلین کا حکم ایک ہی ہوتا ہے۔ اس بدلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی حرام ہو جاتا ہے۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ فقہاء نے بھی تو ایسا حیلہ لکھا ہے جواب یہ ہے کہ اول تو وہ حیلہ اسطرح نہیں جس طرح تم کرتے ہو کہ حلال و حرام کا ادلہ بدلہ کرتے ہو وہ حیلہ دوسرا ہے۔ دوسرے فقہائے وہ حیلہ بھی اسلیئے نہیں لکھا کہ اسکے سہارے سے حرام مال کمایا کریں اور اسکو اپنے تصرّف میں لایا کریں۔ فقہاء نے وہ حیلہ صرف اسواسطے بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت کسی کے پاس ایسی رقم آجاوے جو کمانے والے نے تو حرام طریقہ سے کمائی ہو۔ مگر اس کے پاس حلال طریقہ سے آئی ہو مثلاً کسی کو میراث میں رقم مل گئی اور مرنیوالا سود خور رشوت خور تھا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ ساری میراث سود اور رشوت ہی کی ہے یا بالکل حلال ہے یا دونوں قسم کا روپیہ ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رشوت کس کس سے لی تھی اس صورت میں آسانی کے لیئے وہ صورت بیان کردی ہے۔ باقی جس نے خود رشوت لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں فلاں سے میں نے رشوت لی ہے اسکو اس حیلہ پر عمل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اس پر واجب ہے کہ جس سے رشوت لی ہے اس کو رقم واپس کردے اور جس سے سود لیا ہے اسکو سود واپس کردے پھر اس کے بعد دیکھے کہ حلال آمدنی کتنی بچتی ہے اگر اسمیں حج کر سکے تو حج کو جائے ورنہ اس پر حج فرض ہی نہ ہوگا۔

مگر آجکل تو لوگوں نے سستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ حرام مال خوب کماؤ بعد میں

ادلا بدلا کر کے اسکو حلال کر لیں گے۔ یہ محض خدا تعالےٰ کے ساتھ بہانہ ہے جو کبھی جائز نہیں۔ پھر فقہار نے جو صورت حیلہ کی بیان کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حیلہ کے بعد گناہ سے بھی بچ جاویگا۔ گناہ پھر بھی رہے گا کیونکہ اس حیلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام کی رقم ہو اور وہ کسی دوسرے سے قرض روپیہ لیکر اس سے حج کرکے بعد میں اس قرض کو اس حرام روپیہ سے ادا کر دے تو فقہار لکھتے ہیں کہ اس صورت میں حج صحیح ہوگا۔ کیونکہ قرض گو انتہاءً معاوضہ ہے مگر ابتداءً ابترع ہے تو گویا اس نے ایسے مال سے حج کیا جو اسکو دوسرے کے پاس سے تبرعاً ملا ہے اور انتہاءً جو مبادلہ تھا سو وہ مبادلہ دیون میں ہے۔ عین میں نہیں یعنی جب اس نے ادا کیا ہے اسکا دین اس دوسرے کے ذمہ واجب ہوگیا پھر دونوں دین میں مقاصہ ہوگیا۔ اسلئے حرام روپیہ ادا کرنے سے اُس روپیہ میں خبث نہ آئیگا جو پہلے قرض لیا گیا تھا۔

اس سے فقہار کی فہم کا اندازہ ہوتا ہے بھلا خشک محدث ان دقائق کو کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن فقہا کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس صورت میں حج صحیح ہو جائے گا۔ حج میں کوئی خرابی نہیں یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں یہ شخص دوسری معصیت کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ دوسرے شخص کو حرام مال استعمال کیلئے دیا۔

حرام مال کا نہ خود کھانا جائز ہے نہ دوسروں کو کھلانا جائز ہے حتی کہ کافر کو بھی حرام مال کھلانا جائز نہیں یہاں تک کہ ناپاک چیزوں کا کھانا جانوروں کو بھی جائز نہیں بعض لوگ ایسا کھانا جسمیں کتا بلی منہ ڈال جائے بھنگی کو دیدیتے ہیں یہ ناجائز ہے بلکہ یہ چاہئیے کہ اس سے کہدیں کہ اس چیز کو پھینک دو۔ اسکے بعد اگر وہ خود کھالے یا اپنے گھر لے جائے یہ اُس کا فعل ہے تم خود اُسکو استعمال کیلئے مت دو۔ غرض رشوت اور سُود کا مال قرض میں دینا بھی جائز نہیں۔ حدیث میں ہے لعن اللہ اٰکل الربوا و موکلہ۔ خدا لعنت کرے سود کھانے والے پر اور کھلانے والے پر مراد دوسرے کو دینا ہے۔ چونکہ لینا دینا سبب ہوجاتا ہے کھانے پینے کا۔ اسلئے اسکو آکلہ وموکلہ سے تعبیر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت ہے

اسمیں یہ صورت بھی شامل ہے کہ سود لیکر کسی دوسرے شخص کو وہ روپیہ اپنے قرض میں دیا جائے اس صورت میں اُس نے اسکو سود کا روپیہ دیا۔ ایک گناہ تو یہ ہوا اس سے بڑھ کر ایک اور گناہ کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ اکثر لوگ حرام کا روپیہ قرض میں دیکر اپنے آپ کو بری سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا ہے تاکہ اس سے توبہ کریں اور اگر اس دوسرے شخص کو خبر نہیں کی کہ یہ روپیہ سود اور رشوت سے ہم نے حاصل کیا تھا جو تم کو قرض کے بدلہ میں دے رہے ہیں تو دھوکہ دینے کا تیسرا گناہ اور ہوا۔ خلاصہ یہ کہ حرام کمائی کرنے والے حج کو جاتے ہوئے جس طرح ادلا بدلا کرتے ہیں اس سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ مال جو بدلہ میں لیا جاتا ہے حرام کا حرام ہی رہتا ہے اور جو حیلہ فقہاء نے بیان کیا ہے اس طریقہ سے اگرچہ حج صحیح ہو جاتا ہے۔ مگر ایک گناہ کے بدلے کئی گناہ لازم آجاتے ہیں۔ اسلئے اس کی بہت ضرورت ہے کہ حج کے لیے خالص حلال سفر خرچ لیا کریں

حج میں فخر و شیخی

ایک کوتاہی حج میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں کو افتخار و اشتہار کی عادت ہوتی ہے جہاں بیٹھتے ہیں اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں تاکہ لوگ انکو حاجی سمجھیں۔ لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ میں نے سفر حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا مکہ میں اتنا دیا۔ مدینہ میں اتنا خیرات کیا یَقُولُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ حق تعالے کفار کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کر کے گاتا پھر اکرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیئے یہ وہ معاصی ہیں کہ خشک مولوی بھی یہاں تک نہیں پہنچتے۔ حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم و تکریم کی خواہش نہ ہونی چاہیئے اسمیں تواضع و مسکنت ذلت و خواری ہونی چاہیئے۔

سفر حج سفر آخرت ہے

یہ سفر سفر آخرت کے مشابہ ہے کہ اپنے گھر بار زمین جائداد وغیرہ کو چھوڑ کر اقرباء سے رخصت ہو کر جاتا ہے اور تھوڑا سا سامان ساتھ لیتا ہے جیسا کہ مردہ سب سامان چھوڑ کر صرف کفن ساتھ لے جاتا ہے بلکہ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر اک کے ساتھ ہے۔

نہ معلوم کس وقت موت آجائے کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اور عوام تو اسکو بہت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ کفن ساتھ لے کر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہئیں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا تو چاہیئے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت سے مردہ تصور کرتے اور ساری شیخی اور تکبر کو بھی چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمالِ آخرت کیلئے کوشش کرتے مگر کچھ نہیں یہ کفن ساتھ لینے کی بھی ایک رسم ہوگئی ہے ورنہ بعض لوگ سفر حج میں پہلے سے گناہ کرنے لگتے ہیں۔ نماز چھوڑ دیتے ہیں جماعت کا اہتمام تو اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں اور حج کر کے اپنے کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں کیا سفر آخرت کی بھی یہی شان ہونی چاہیئے۔

سفر حج اس اعتبار سے بھی قبر کے مشابہ ہے کہ جس طرح قبروں میں کبھی دو آدمی پاس پاس دفن ہوتے ہیں مگر ہر اک کا جدا حال ہوتا ہے کوئی راحت میں ہے کوئی عذاب میں اور ایک کو دوسرے کی حال کی خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح حج میں ایک شگفتہ ہے ایک دیگر ہے اور ہر اک کو اپنی اپنی فکر ہوتی ہے دوسرے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ اور جو شخص اس سفر میں دوسروں کی خدمت کرے وہ تو گویا مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

سفرنامہ حج کا لکھنا بعض لوگ ایسے بیہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلمبند کرتے ہیں وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلمبند کرے کہ دوسروں کو سفر حج آسان ہو جائے گا۔ اس کا مضائقہ نہیں۔ مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے ہمارے ساتھ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے وہ ہندوستان کے اخباروں میں لکھ لکھ کر وہاں کے حالات بھیجتے تھے۔ اور سفر کی تکلیف کو بہت مبالغہ سے لکھتے تھے۔ تاکہ پھر کوئی حج کا نام ہی نہ لے۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے وہ بھی وہاں کی شکایت جمع کیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ میرے پاس ایک محضر لکھ کر لائے جسمیں وہاں کی تکالیف کو قلمبند کیا تھا۔ کہ اس پر دستخط کردو۔ میں نے کہا کہ حضرت تصدیق وہ کرے جس کو ان تکالیف کی اطلاع ہو مجھ کو تو کوئی تکلیف ہی پیش نہیں آئی۔ پھر کاہے کی تصدیق کروں، بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ بس ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں۔

اہل شوق کا حال

سو اگر پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ سفر آخرت کا سفر ہے پھر کوئی بھی کلفت معلوم نہ ہو مگر آجکل تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں ویسے ہی حج کے سفر میں رہیں حالانکہ سفر میں گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی بھی تکلیف تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اسوقت یاد بھی نہیں آتا کہ اسکے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا۔ بس وہ حال ہوتا ہے جو جنّت میں پہنچکر جنتیوں کا ہوگا۔ الحمد لِلّٰہِ الذی اذھب عنّا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلّنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب و لا یمسنا فیھا لغوب،

جنتی جنت میں پہنچ کر کہیں گے کہ خدا تعالےٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم کو دور کر دیا۔ بیشک ہمارا خدا بڑا بخشنے والا قدردان ہے۔ جس نے ہم کو ٹھکانے کے گھر میں پہنچا دیا اپنے فضل سے جسمیں نہ ہم کو کوئی مشقت معلوم ہوتی ہے۔ نہ کچھ تھکن محسوس ہوتی ہے۔ یہی حال بیت اللہ کو دیکھ اہل شوق کا ہوتا ہے۔

حج میں خود بینی و خود رائی

بعض لوگ سفر حج میں پریشان ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور وہ اسکو سفر آخرت نہیں سمجھتے۔ نیز جو شخص اسکو سفر آخرت سمجھتا ہوگا۔ اسمیں دعویٰ اور افتخار بھی نہ ہوگا۔ ؎

فکر خود ورائے خود در مذہب رندی نیست ؛ کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں اسی لیئے جب سفر میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مہمان نے کہا کہ حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا۔ اس بات میں اس نے جتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے یہ ریا نہیں تو اور کیا ہے؟

ریار کے طریقے بہت دقیق ہیں اگر کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداشت کرے تو اس کو نفس کے دقائق معلوم ہو سکتے ہیں لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیئے۔ سہ

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

نادار کو ترغیب حج جائز نہیں

ان قصوں کے لیے اسی کو فرصت ملتی ہے جس کا دل محبت الٰہی سے خالی ہوتا ہے اور جو تذکرہ نمائش و ریار کے لیے ہو وہ تو روکنے کے قابل ہے ہے محققین تو بعض اوقات ایسے تذکرہ کی بھی اجازت نہیں دیتے جو ظاہراً اطاعت معلوم ہوتا ہے مثلاً وہاں کے فضائل و محاسن بیان کرنا جس سے وہاں جانے کی رغبت اور شوق ہو چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر شخص کے سامنے حج کی باتیں کرنا جائز نہیں کیونکہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن پر حج فرض ہے۔ سو ایسے شخص کے سامنے تو ترغیبی مضامین بیان کرنا جائز بلکہ مستحب ہے کہ دلالت علی الخیر ہے۔ دوسرے وہ جن پر نہ فرض اور نہ ممنوع ان کے روبرو بھی بیان کرنا جائز ہے۔ تیسرے وہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کو جانا جائز بھی نہیں اس وجہ سے کہ نہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے گا۔ ان کے سامنے تشویق اور ترغیب کے قصے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے انکو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں نہ ظاہری نہ باطنی تو خواہ مخواہ دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے جس سے ناجائز امور کا ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے اسلیئے ایسے لوگوں کے سامنے حج کی ترغیب اور تشویق کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں یہ وہ مسائل ہیں جن پر لوگوں نے امام غزالی کی تکفیر پر فتوے دیئے۔

ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کی ترغیب سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ مگر حاشا وکلّا ان لوگوں نے امام کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا وہ حج کی ترغیب سے منع نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کو ناجائز امور میں مبتلا کرنے سے منع کرتے ہیں۔ کیونکہ نادار غیر صابر لوگوں کو ترغیب دینے کا یہی انجام ہوگا۔

تکالیف حج کا تذکرہ

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آکر وہاں کی تکالیف کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر واقعی کلفتوں میں اضافہ کر کے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت لوگ حج سے رُک جاتے ہیں اس کا سارا وبال ان لوگوں پر ہوتا ہے جنہوں نے اُن کو ڈرایا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ وہاں ایسی تکالیف نہیں ہیں جن کا یقینی اثر ہلاکت ہو بلکہ جیسی کلفتیں یہاں گاڑی اور بہلی کے سفر میں پیش آتی ہیں ویسی ہی وہاں اونٹوں کے سفر میں پیش آتی ہیں۔ اگر آدمی احتیاط سے کام لے اور قافلہ سے علیحدہ نہ ہو تو ذرا بھی اندیشہ نہیں اور یوں کوئی خود ہی اپنی بے احتیاطی سے ہلاک ہونا چاہے تو اس کا یہاں بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اونٹوں کا سفر ایسا پر لطف ہوتا ہے کہ اس کے سامنے یہاں کے سفر کچھ بھی نہیں پھر اگر کچھ کلفت پیش بھی آئے گی تو اس میں ثواب کس قدر ہے۔ جب یہاں دنیا کے واسطے سفر کی تکالیف برداشت کی جاتی ہیں تو خدا و رسول کی رضا کے لیے اگر ذرا سی کلفت پیش بھی آجائے تو کیا مضائقہ ہے۔

اور اگر کوئی یہ دعوے کرے کہ اس سفر میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے تو یہ بالکل غلط اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہزارہا آدمی حج کو جاتے ہیں اور قریب قریب سب ہی سلامت واپس آتے ہیں اور یوں بیس پچیس ہزار میں اگر بیس پچیس مر بھی گئے تو اتنے تو یہاں بھی ہر سال مرتے ہیں مردم شماری دیکھ لی جائے کہ پچیس ہزار آدمیوں میں سے یہاں دہ کر کتنے مرتے ہیں اس سے اندازہ ہو جائیگا۔ کہ سفر حج میں جو لوگ مرتے

[illegible]

قبولیت حج کی علامات

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سے اصلاح نفس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فضیلت [illegible] حقیقت

[illegible]

؎ گر جاں طلبی مضائقہ نیست ÷ در زر طلبی سخن دریں است

(اگر تو جان مانگتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے مصیبت تو یہ ہے کہ تو پیسہ مانگتا ہے)

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک بخیل کا کوئی دوست تھا۔ اس نے اس سے انگوٹھی مانگی کہ تمہاری نشانی رہے گی جسے تم یاد آجایا کرو گے۔ تو بخیل نے کہا کہ جب تم انگلی خالی دیکھو گے تو یاد کر لیا کیجیو کہ کسی دوست سے انگوٹھی مانگی تھی اس نے نہیں دی۔ یہ بھی ایک صورت یاد کرنے کی ہے جیسے شہرت کی صورت کبھی نیک نامی ہوتی ہے۔ کبھی بدنامی۔

کسی بد دین مسخرہ کی حکایت ہے کہ اس نے اپنی شہرت کی صورت یہ تجویز کی تھی کہ کمبخت نے بیت اللہ شریف جا کر زمزم شریف میں موت دیا۔ اب جہاں جاتا ہے انگلیاں اٹھتی ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے زمزم میں موتا ہے بدوں کا اہل محبت کے مال سے دریغ ہونے کی ایک اور حکایت یاد آئی۔

ایک بخیل روٹی شہد سے کھا رہا تھا۔ ایک دوست آگیا روٹی فوراً جا کر چھپا دی اور شہد اس لئے چھوڑ دیا کہ خالی شہد کون کھائے گا۔ اس کے بعد ان دوست کو بلایا پوچھا کہ شہد حاضر ہے۔ اس نے بے دریغ کھانا شروع کر دیا جب بخیل نے دیکھا کہ یہ سب ہی کھا جائے گا تو کہا واللہ یا اخی انہ یحرق القلب یعنی واللہ اے میرے بھائی یہ شہد دل کو جلاتا ہے دوست نے کہا۔ صدقت ولکن قلبک۔ یعنی تم نے سچ کہا لیکن تیرے قلب کو جلاتا ہے۔ ایک اور بخیل تھا وہ انجیر کھا رہا تھا ایک اعرابی آگیا۔ اس نے وہ انجیر کمبل کے نیچے چھپا دیئے اور چاہا کہ اس کو کسی طرح ٹالوں یا کسی اور شغل میں لگاؤں پوچھا۔ ھل تحفظ شیئا من القرآن۔ یعنی تم کو کچھ قرآن یاد ہے اس نے کہا ہاں اور اعوذ بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا والزیتون وطور سینین الخ بخیل نے کہا ہائیں این التین یعنی والتین کہاں گیا قال ھو تحت کسائک۔ یعنی وہ تیرے کمبل کے نیچے ہیں اسی طرح بہت حکایات مشہور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مال کا خرچ کرنا بہت گراں ہے۔ اسی طرح خدا تعالٰے کے دوست کہلانے

اختیار کرنا چاہیے اسلئے گھبرا گئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا فاتقوا اللہ ما استطعتم کہ جتنا مرتبہ تقوے کا اسوقت ہو سکے اتنا اسوقت اختیار کر لو، اسمیں کوتاہی نہ کرو پھر بتدریج دوسرے مراتب میں بقدر استطاعت ترقی کرتے رہو۔

پس یہ آیت پہلے حکم کے لیے محققین کے نزدیک ناسخ نہیں۔ بلکہ اس کا بیان ہے یعنی مطلوب تو وہی ہے کہ کامل تقوی اختیار کرو۔ مگر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول اول جتنا ہو سکے اس کو پورا کرو اسمیں کوتاہی نہ کرو۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی۔ اور ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ تم کامل متقی بن جاؤ گے۔ اور یہ تدریج اعمال تقوے کے اعتبار سے نہیں وہ تو ایک دم سے واجب العمل ہیں بلکہ ضعف و قوت مراتب کے اعتبار سے ہے اب اس اشکال کا جواب ہو گیا۔ یعنی اسی وقت سے ان ملکات رذیلہ کے ازالہ کی فکر شروع کر دو بے فکری میں مت رہو۔ اس وقت اگر آپ کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ملکات رذیلہ کو بالکل زائل کر دیں تو یہ بات تو اختیار میں ہے کہ ان کے مقتضا پر عمل نہ کرو۔ جب بار بار نفس کے تقاضوں کے خلاف عمل کیا جائے گا تو اسکی عادت پڑ جائے گی اور ضبط کی عادت سے ملکات رذیلہ کی قوت مضمحل ہو جائے گی اور اضمحلال سے پھر ان میں اتنی کمزوری ہو جائے گی کہ گویا وہ ملکات ہیں ہی نہیں اسی طرح سے آپ انشاءاللہ کامل ہو جائیں گے اور اخلاق رذیلہ کی بجائے آپ میں ملکات فاضلہ پیدا ہوں گے

لہذا حج کے سفر میں فکر اور سعی ضرور شروع کر دیجئے۔ جب آپ نے اس نیت سے فکر شروع کر دی تو آپ بھی انہی لوگوں میں شمار ہوں گے جو کامل متقی ہیں کیونکہ اہل کمال بھی اسی طرح اہل کمال بنے ہیں۔ ایک دن میں کوئی کامل نہیں ہو گیا۔

حج مردانہ

دوسرے یہ کہ کمال کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے۔ انسان کا کام طلب اور فکر اور سعی ہے اگر طلب کے ساتھ ساری عمر بھی ناقص رہے تو وہ انشاءاللہ کاملین ہی کے برابر ہو گا۔

بلکہ ممکن ہے کہ بعض باتوں میں کاملین سے بھی بڑھ جائے یعنی مشقت کے

کے ثواب ہیں کیونکہ کاملین کو نفس کی مخالفت گراں نہیں ہوتی اور مبتدی کو زیادہ مشقت پیش آتی ہے تو مشقت کا ثواب اُس کو زیادہ ہوتا ہے۔

دلیل اس کی یہ حدیث ہے **والذی یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران**۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص ماہر قرآن ہے وہ کراماً کاتبین کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس پر شاق ہوتا ہے اس کے لیے دوہرا ثواب ہے پس اس مشقت کے ثواب میں ناقص کامل سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اگرچہ دوسرے فضائل میں کامل بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادہمؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا حال گذرا فرمایا کہ مغفرت ہو گئی درجات ملے مگر ہمارا ایک پڑوسی تھا جو ہم سے کم عمل کرتا وہ ہم سے بڑھا ہوا رہا کیونکہ وہ صاحب عیال تھا۔ بال بچوں کی پرورش میں اس کو زیادہ اعمال کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتا تھا کہ اگر مجھے فراغت نصیب ہو تو خدا کی یاد میں مشغول رہوں وہ اپنی مشقت اور نیت کی وجہ سے ہم سے بڑھ گیا۔ بس اس طریق میں فکر اور دُھن بڑی چیز ہے اسی سے سب کام بن جاتے ہیں۔ ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ✿ تادم آخر دمے فارغ مباش

میرے ایک دوست نے ایک منظوم خط لکھا جس میں اس کی شکایت تھی کہ میں کام شروع کرتا ہوں پھر چھوٹ جاتا ہے پھر از سر نو جوڑتا ہوں پھر نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے غرض ایک طویل نظم میں اپنی پریشانی لکھی تھی۔ اور وہ نظم مثنوی کی بحر میں تھی میرا جی چاہا کہ ان کو نظم ہی میں اور اُسی وزن میں جواب دوں اسوقت یہ شعر ذہن میں آیا ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی ✿ کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

اور یہی حاصل ہے ان اشعار کا ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ✿ تادم آخر دمے فارغ مباش

تادمِ آخر دمے آخر بود ؛ کہ عنایت باتو صاحب سر بود

بس فکر اور دھن میں لگا رہنا چاہیئے۔ انشاء اللہ پھر آپ کا حج مردانہ ہو جائے گا جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود ؛ حج رب البیت مردانہ بود

حج رب البیت اور یہ حج رب البیت ہر شخص پر فرض ہے گو حج البیت بھی اس شخص پر فرض نہ ہو۔ کیونکہ حج رب البیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف چلنا اس کی طلب اور دُھن میں لگنا سو اس کے لیئے کعبہ اور مکہ بھی شرط نہیں اسی کو عارف مسعود بک فرماتے ہیں ؎

اے قوم بحج رفتہ کجا ئید کجائید ؛ معشوق دریں جاست بیائید بیائید

مگر قوم بحج رفتہ سے مراد سب حجاج نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج فرض نہیں اور ابھی تک انہوں نے نفس کی اصلاح بھی نہیں کی۔ اور حج کو جانے سے ان کو بعض دینی مضرتیں پہنچنا بھی محتمل ہے ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم پہ حج تو فرض ہے نہیں اور نفس کی اصلاح فرض ہے تم حج کرنے کہاں چلے تم کو پہلے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیئے۔ تمہارا مطلوب یہاں ہے اور جن پہ حج فرض ہے ان کو یہ خطاب نہیں ہو سکتا کہ تم حج کرنے مت جاؤ۔ شیخ کے پاس رہو۔ کیونکہ جس پہ حج فرض ہے اس کو خدا کا حکم ہے کہ پہلے حج سے فارغ ہو۔ اس کے لیے بدوں حج کے مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ ترک حج کے گناہ کی وجہ سے کمال سے رہ جائے گا۔ کمال یہی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو پورا کیا جائے تو جس پہ حج فرض ہے اس کو حج ضرور کرنا چاہیئے پھر کسی شیخ کی صحبت میں وہاں سے آکر رہے لیکن حج کے ساتھ جن احکام کا شریعت نے حکم کیا ہے ان کو بجا لانا بھی ہر حاجی کے ذمہ فرض ہے پس وہ اگر وہ حج سے پہلے کامل نہیں بن سکتے۔ تو کم از کم فکر اور سعی تو ابھی سے شروع کر دیں۔ اس طریقہ سے امید ہے کہ انشاء اللہ اجر میں کاملین کی برابر ہو جاویں گے۔

لیجئے اب تو بہت سہل نسخہ معلوم ہوگیا۔ اب بھی اگر کوئی اپنے حج کو کامل نہ کرے تو وہ جانے اب دعا کیجئے۔ کہ حق تعالٰی ہم کو فہم کی توفیق دے اے اللہ سب حجاج کو حج مردانہ نصیب فرمائیے اور سب کی کوشش مقبول ہو اور اُن کے لیئے اس حج آئندہ اصلاح اور کمال کا ذریعہ بنا دیجئے آمین۔

وصلی اللہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ محمدٍ سید المرسلین و علٰی آلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔
وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تحصیل المرام

فی صورۃ

حج بیت الحرام

مقصد کا حصول حج بیت اللہ کی صورت میں

تحصیل المرام فی صورت حج بیت الحرام سے موسوم یہ وعظ ۵ شوال المکرم ۱۳۲۰ھ کو بعد نماز جمعہ کھڑے ہو کر اڑھائی گھنٹہ تک ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ نے قلمبند فرمایا۔

حج کا حاصل یہ ہے کہ ایسے وسائط سے تعلق پیدا کیا گیا ہے جن سے تعلق مع اللہ کو قوت ہو. بعبارتِ دیگر یوں کہیئے کہ اور تمام عبادات تو مجاہدہ ہیں اور حج مشاہدہ ہے. اسی کو مولانا فرماتے ہیں.

حج زیارت کردن خانہ بود
حج ربّ البیت مردانہ بود

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الوعظ المسمّٰی بہ
تحصیل المرام
فی
صورۃ حج البیت الحرام

*

(دعاء) الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم
وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو ہم اپنا رستہ ضرور دکھاویں گے اور بے شک اللہ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے)

تمہید آج مجھ کو کسی قدر حج کے متعلق مضمون بیان کرنا ہے اور اس کے لئے بظاہر ضرورت اس کی تھی کہ کوئی آیت حج کے متعلق صریح اختیار کرتا مگر پھر غور کیا تو اس آیت کو بھی اس وجہ حج سے مناسبت معلوم ہوئی۔ چونکہ اس آیت کا بیان مسلسل کئی ہفتوں سے ہو رہا ہے اس لئے میں نے چاہا کہ حج کا بیان بھی اسی کے ضمن میں ہو جائے تاکہ جو مضمون اس آیت میں حج کے مناسب ہے اس کے بیان سے آیت کی تفسیر مکمل ہو جائے۔

نیز مجھ کو یہ بھی بتلانا ہے کہ حج کا مضمون بھی مضامین سابقہ سے مرتبط ہے نیز یہ بھی بتلانا ہے کہ عبادات رمضان اور افعال حج میں بھی باہم ارتباط ہے اس کا مقتضاء بھی یہی تھا کہ جس آیت کے تحت میں عبادات رمضان کا ذکر ہوا ہے اسی کے ضمن میں حج کا بیان ہو جاوے۔ اب تک یہ بتلایا گیا تھا کہ مجاہدہ کی چار قسمیں ہیں یعنی مجاہدہ حکمیہ کی جن میں سے ہر قسم کا بیان مستقل وعظ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ یہ سب مضامین تو اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا (جو لوگ ہمارے رستہ میں کوشش کرتے ہیں) میں داخل تھے کیونکہ اسی جزو میں مجاہدہ کا ذکر ہے تو مجاہدہ کی جملہ اقسام اور اس کے متعلق جتنے مضامین ذکر ہوئے ہیں وہ سب اسی ایک جملہ کی تفسیر تھے اس کے بعد لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں مجاہدہ پر ہدایت سبل کا وعدہ ہے چنانچہ ترجمہ آیت سے ظاہر ہو جاوے گا۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

مقصود طریق اور یہ ظاہر ہے کہ ہر طریق کا ایک منتہا ہوتا ہے جس پر سیر ختم ہو جاتی ہے۔ جب کوئی سفر کرتا ہے تو ایک جگہ ایسی آتی ہے جہاں سفر منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح طریق الٰہی کی بھی کہیں انتہا ہونی چاہیئے جس پر مجاہدہ منتہی ہو۔ یعنی کوئی مقصود ہونا چاہیئے جس پر پہنچنے کے لئے ان راستوں کو طے کیا جاتا ہے۔ ہرچند کہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو اپنے رستوں کی ہدایت

لہ (ہم انکو اپنے رستوں کی ہدایت کرتے ہیں) ۲ے تقلیل الطعام و تقلیل المنام و تقلیل الکلام و تقلیل الاختلاط مع الانام سب اسی سلسلہ میں بیان کئے گئے تھے

کرتے ہیں) میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں، کیونکہ ہدایت کبھی ارادت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلادیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہوکر منزل تک پہنچا دے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو اپنے رستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر دونوں احتمال ہونے کی وجہ سے مقصود تک پہنچانے کا وعدہ یقینی نہیں مگر محققین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقصود تک پہنچانے کا بھی وعدہ ہے کیونکہ اسمیں حق تعالیٰ نے ہدایت کو مفعول ثانی کی طرف بلاواسطہ متعدی فرمایا ہے اور حسب تصریح محققین اس صورت میں ہدایت کا مدلول وصول ہی ہوتا ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب دوسرا مقدمہ یہ رہا کہ مقصود کیا ہے تو جو لوگ آیات و احادیث پر نظر رکھنے والے ہیں ان کو اس میں کوئی شک نہ ہوگا کہ مقصود قرب حق جل وعلا ہے۔

حقیقت قرب حق

اسی کو کبھی رضا سے تعبیر کردیا کرتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ سے بندہ کو وہ قرب نہیں ہوسکتا جو لفظ قرب سے متبادر ہے یعنی

اِتِّصَالٌ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ فِي الظَّاهِرِ بِحَيْثُ يَقِلُّ الْمُسَافَةُ بَيْنَهُمَا

دو چیزوں میں ایسا اتصال ہوجاتا ہے کہ ان کے درمیان میں مسافت کم رہ جاوے، یہ قرب خاصہ اجسام کا ہے جو دو جسموں کے ہی درمیان ہوسکتا ہے اور حق تعالیٰ جسمیت سے منزہ ہیں اس لئے قرب حق کے یہ معنی نہیں ہوسکتے۔ بلکہ قرب حق کے معنے وہی ہیں جس کو شریعت میں کبھی رضا کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ بندہ سے راضی ہوجائیں اور اس کو اپنا مقبول بنالیں غرض شریعت میں مقصود کا پتہ کبھی قرب کے لفظ سے دیا گیا ہے اور کبھی رضا سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔

اور صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو مشاہدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔ شاید کسی نے یہی سمجھا ہو۔ کیونکہ لغت میں مشاہدہ ادراک بالحواس ہی

کو کہتے ہیں مگر یہ معنی لغوی متعارف ہیں ورنہ اصل لغت مشاہدہ ادراک بالحواس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اصل میں عموم ہے۔ حضور کو بھی مشاہدہ کہتے ہیں مگر عام طور پر مشاہدہ کے معنے لوگوں کے ذہن میں ادراک بالحواس ہی ہیں اور حاسہ بھی عام نہیں بلکہ خاص یعنی بصر کیونکہ ادراک باللسان یا ادراک بالسمع واللمس وغیرہ کو محاوراتِ عوام میں مشاہدہ نہیں کہا جاتا اور ادراک بالحواس الباطنہ کو تو اس سے بالکل ہی خارج سمجھتے ہیں۔ بس عام لوگ تو صرف آنکھ سے دیکھنے کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

دیدارِ خداوندی

چنانچہ جب کبھی سنتے ہیں کہ سالکین کو مشاہدہ حق ہوتا ہے تو عام لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کو حق تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے اور وہ خدا کو دیکھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا۔

اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے اور دنیا میں بھی وجہ استحالہ رویت اُدھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے۔ ہم اس کے متحمل نہیں ورنہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں۔

اس پر کسی کو شاید یہ شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی صفت باطن بھی تو ہے۔ چنانچہ نص میں ہے وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں صفتِ باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں بھی خفا ہے۔

اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اسکی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا نہیں بلکہ غایت ظہور سے بطون ہوگیا۔

رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہوگیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت وخفا کی بھی ضرورت ہے اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک نہیں ہوسکتا کیونکہ ادراک التفات سے ہوتا ہے اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو اسکی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی رُوح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب رُوح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں۔

پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں۔ اس لئے اسکی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو۔

اسی طرح بلاشُبہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا کا نہیں اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں، ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے تو مگر ادراک نہ ہوتا دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفاء ضوء ہی کا نام ہے نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دل میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم ✽ گر نیست غیبتے نہ دہد لذت حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں اسی لئے خفا ہو گیا کیونکہ یہاں ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہو گا وہاں روح کا بھی انکشاف ہو گا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہو گا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے، حجاب ہماری طرف سے تھا، ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے

شد ہفت پردہ چشم ایں ہفت پردہ چشم ✽ بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے سات پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے کوئی مانع نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھوں پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہو گا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا۔

اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے

لا یبقی علی وجھہ الا رداء الکبریاء

اس کے چہرہ پر سوائے کبریائی چادر کچھ باقی نہ رہے گا۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم میں ہے:

اِنَّکُمْ لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا۔

مرنے سے پہلے تم کو ہرگز تمہارے رب کا دیدار نہ ہوگا۔

اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے:

لَنْ تَرَانِیْ (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) یہ جواب قابل دید ہے۔ حق تعالیٰ نے لَنْ تَرَانِیْ (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) فرمایا ہے۔ لَنْ اُرٰی ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا، نہیں فرمایا۔ جتلا دیا کہ میں تو اب بھی اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں، مگر تم میں قوتِ دیدار نہیں تم مجھے اس وقت نہیں دیکھ سکتے محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے۔ ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بیہوش ہو گئے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں، اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول یہی ہے کہ آپؐ نے دیکھا ہے۔

مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ آیات سورۂ نجم کی تفسیر اس رویت سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ ط (ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقتور ہے) سے یقیناً حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ ان صفات کا عنوان بیان اسی کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شدید القویٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا، اب آگے چلئے

فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى

(پھر وہ فرشتہ اصلی صورت پر نمودار ہوا ایسی حالت میں کہ بلند کنارہ پر تھا) اس میں بھی ضمائر کا مرجع جبریل علیہ السلام ہی ہیں کیونکہ استوی بالافق بھی انہیں کی صفت ہو سکتی ہے اس کے بعد) ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کی برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم) میں سب ضمیریں جبریلؑ کی طرف راجع ہیں حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ورنہ انتشار ضمائر لازم آئے گا یہ رویت جبریل تو دنیا میں ہوئی تھی آگے فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى

(اور انھوں نے اس فرشتے کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس)

یہ دوبارہ رویت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے۔ وہ دو مرتبہ ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی آپ نے فرمایا هُوَ جِبْرِيلُ یعنی یہ روایت جبریل کی تھی۔

باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رویت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض صحابہ کا قول ہے کہ آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے۔ ابن عباس کا قول تو مسلم میں ہے اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوع نقل کی ہے۔ پس قرآن میں گو اس رویت کا ذکر نہیں مگر جب یہ حضرات صحابہ اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ اب ان علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالہ رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی۔ ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہے ہی نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قابلیت موجود ہو گئی تھی۔ اس لئے آپ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مکان آخرت کی خصوصیت مگر شیخ ابن عربی نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے

ہیں کہ اس قاعدہ میں استثنا کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ اپنے عموم پر بحالہا باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے اس پر نقض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں رؤیت کے قائل ہیں اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سمٰوٰت و عرش مکان آخرت ہیں وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہنچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل رویت پیدا ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہاں وہ کھانے پینے اور بول براز سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے انکی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اسوقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور اس مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے، اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت نہ ہو، اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو، یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے، وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اُسے کبھی موت نہ آوے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید ٭ گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

(جو بھی سوختہ جان کشمیر میں آئے اگرچہ مرغ کباب ہی ہو تو بھی بال پر کے ساتھ زندہ ہو جائے)

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہد ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ کی یکساں طبیعت نہیں بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت ہے، بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی عمریں ہوتی ہیں، بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں، بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہتا ہے، اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خواص دنیا کے مکانات میں بھی مشاہد ہے تو اسمیں کیا اشکال

ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو، ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کیا وجہ ہے، اس تحقیق سے سب معاویات سہل ہو جائیں گی، اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے، معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشا بجز قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں، اور اس قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے۔ زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے۔ چنانچہ جنت و دوزخ کے بارے میں جملہ اہل سنت کا قول ہے کہ وہ اسوقت موجود ہیں تو کیا وہ دنیا میں ہیں، اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جائے گا جو کہتا ہے کہ ہم نے تو تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا جنت دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔

اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب انکو پتہ چلتا، پس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ انکو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں، معلوم ہوا کہ مکان آخرت اسوقت بھی موجود ہے اور جس طرح آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے گو دیکھنے والا ابھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو، پس قاعدہ مذکور منتقض نہیں ہوا جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔

توہین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام گو قوائے بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں اور دنیا میں خواص بشریہ کے ضعیف آثار ان میں بکثرت موجود ہوتے ہیں، چنانچہ غصہ انکو آتا ہے، بیماری انکو ستاتی ہے، گرمی، سردی کا ان پر اثر ہوتا ہے۔ بول و براز سے وہ مستغنی نہیں۔

اور ان خواص کا اثر یہ ہے کہ اس حالت میں حق تعالیٰ کے دیدار کا تحمل تو کہاں جبریل علیہ السلام کی رویت کا بھی تحمل نہیں ہوتا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے، مگر یہ آپ کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال ہے، کیونکہ آپ کا کمال یہی ہے کہ آپ انسان ہیں اور انسان کامل ہیں، اور بشریت کا خاصہ یہی ہے جس کا ظہور آپ کی ذات میں ہوا کہ جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ جو لوگ آپ کو خدا کی حد میں داخل کرتے ہیں وہ آپ کی توہین کرتے ہیں کیونکہ خدا ہو کر آپ ناقص خدا ہوں گے اور بشر ہو کر کامل بشر ہیں، اور ناقص ہونے سے کامل ہونا یقیناً اچھا ہے، ایک شخص تیس سال کا جوان ہے مگر لنگڑا ہے اور ایک بچہ دو سال کا ہے مگر تندرست صحیح الاعضاء ہے، بتلائیے آپ دونوں میں کس کو اچھا کہیں گے۔ ایک شخص بہت بڑی جمہوری سلطنت کا بادشاہ ہے مگر اختیارات ناقص ہیں اور ایک شخص چند ضلعوں کا شخصی بادشاہ ہے مگر اختیارات کامل رکھتا ہے، ان دونوں میں آپ کسے افضل کہیں گے، یقیناً جس کے اختیارات کامل ہیں اسی کو افضل کہا جاوے گا معلوم ہو گیا کہ فضیلت کمال ہی میں ہے نقص میں کوئی فضیلت نہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر ہونا ہی کمال ہے کیونکہ اس صورت میں آپ کامل بشر ہیں خدا ہونا کمال نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے سامنے آپ کامل خدا تو ہو نہیں سکتے ناقص ہی ہوں گے اور نقص عیب ہے۔

بشریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

مگر آجکل بعض لوگوں کی جہالت کا یہ حال ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت لفظ بشر کو نہیں سن سکتے چنانچہ کاٹھیاواڑ میں ایک دفعہ کسی مسافر امام نے نماز میں یہ آیت پڑھ دی قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ[1] (الآیہ) تو نماز کے بعد ایک جاہل نے کہا کہ نماز نہیں ہوئی اعادہ کرنا چاہئے کیونکہ امام نے ایسی آیت پڑھی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہا گیا ہے میں کہتا ہوں کہ صرف بشر ہی نہیں کہا بلکہ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تم جیسے ہی آدمی ہیں۔ بھلا یہ تو اس کے

---

[1] آپ کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں وحی ۱۲

نزدیک بہت ہی بڑا مفسد صلوٰۃ ہوگا۔

اس جاہل سے کوئی پوچھے کہ تو نے اعتراض کس پر کیا؟ امام پر یا خدا تعالیٰ پر؟ امام پر تو اعتراض ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کا تم کو بھی اقرار ہے کہ اس نے قرآن ہی کی آیت پڑھی تھی۔ بس خدا ہی پر اعتراض ہوا تو کچھ ٹھکانا ہے اس غلو کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں حق تعالیٰ پر اعتراض کرنے لگے گویا حق تعالیٰ نے اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (میں تم جیسا آدمی ہوں) فرما کر نعوذ باللہ آپ کو کذب کی تعلیم دی ہے کہ تم واقع میں تو بشر نہیں ہو مگر لوگوں سے یوں ہی کہو کہ میں بشر ہوں۔

مگر اسے یہ خبر نہیں کہ یہ اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پہنچتا ہے کہ آپ نے اس مضمون کی تبلیغ کیوں کی، اور وہاں جن نمازوں میں آپ نے ایسی آیتوں کو پڑھا ہے کیا آپ کی بھی (معاذ اللہ) وہ نمازیں فاسد ہوئیں، اور ان کا اعادہ آپ سے ثابت نہیں تو بس آپ کی وہ نمازیں یوں ہی رہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔ واقعی یہ جہالت بُری بلا ہے خدا بچائے اس سے۔

ایک شخص نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سوال بھیجا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس بیوقوف کو بھی آپ کی بشریت میں تردّد تھا۔ بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں جن سے معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا ہونا ثابت کیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے اَنَا عَرَبٌ بِلَا عَیْنٍ (میں عرب بلا عین ہوں یعنی رب ہوں) اس کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیستاں کی کیا ضرورت تھی آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرما دیا اَنَا رَبٌّ (میں رب ہوں) ہیر پھیر کے ساتھ انا عرب بلا عین کہنے کی کیا ضرورت؟

پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا کیونکہ عرب میں با مشدد نہیں ہے مخفف ہے۔ تو عین نکال کر ربٌ (بلا تشدید) باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں ربٌّ (بالتشدید) تو ثابت نہ ہوا۔ دوسرے آپ عرب کہاں تھے۔ آپ تو عربی تھے، پھر انا عربٌ میں حمل

کیونکہ صحیح ہوگا۔ حدیث بھی گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح بلیغ تھے کہ آپ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی دھر سکے۔

اسی لئے محدثین نے فرمایا ہے کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونے کی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی رکیک ہے کیونکہ اس سے ربّ ہونا نہیں نکلتا بلکہ ربْ نکلتا ہے اور ربْ پر تشدید ایک مہمل لفظ ہے۔ ایک حدیث یہ گھڑی ہے اَنَا حَمِیْدٌ بِلَا مِیْمٍ۔ یہ حدیث نہیں بلکہ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو ان سے حالتِ سکر میں صادر ہوا ہے اور قابلِ تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو قابلِ رد ہے کیونکہ غلبہ حالت کے اقوال و افعال قابلِ اعتبار نہیں ہوتے ایک حدیث یہ گھڑی ہے،

رَأَیْتُ رَبِّیْ یَطُوْفُ فِیْ سِکَکِ الْمَدِیْنَۃِ

یہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے انہوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا،

رَأَیْتُ رَبِّیْ یَطُوْفُ فِیْ سِکَکِ الْمَدِیْنَۃِ

کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ پس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا۔ جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے۔ نعوذ باللہ۔

ع "اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں" ـــــ ان بیوقوفوں کو ان خرافات سے بدنام کر دیا مخالفین بھی ان باتوں پر ہنستے ہیں۔ ایک انگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ تم ہم کو خدا کے تین کہنے پر اعتراض کرتا ہے تمہارا ٹوپی (یعنی صوفی ۱۲) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے۔ ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھی نہیں بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے۔ انہی لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے چنانچہ اکل و شرب و بول و براز سے آپ منزہ نہ تھے جنگ احد میں کفار

کے ہاتھ سے آپ زخمی ہوئے۔ یہود نے آپؐ پر سحر کیا اور اس کا اثر ہو گیا، حضرت جبرئیل علیہ السلام سے آپ نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت دکھلاؤ جب وہ اصلی صورت میں ظاہر ہوئے تو آپ بیہوش ہو گئے سورۂ نجم میں اس واقعہ کا ذکر ہے تفسیر بیان القرآن میں یہ موقع قابلِ دید ہے۔ یہ تو دنیا میں ہوا کہ آپ حضرت جبرئیل کی اصلی صورت دیکھ کر بیہوش ہو گئے مگر معراج میں بیہوش نہیں ہوئے۔ کیونکہ اس مکان کی خاصیت سے آپ میں قوتِ تحمل پیدا ہو گئی تھی۔

غلو فی التعظیم بہر حال جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں غلو کر کے آپ کو بشریت سے نکالنا چاہتے ہیں وہ آپ کی توہین کرتے ہیں اور ان واقعات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس غلو کا ایک اثر یہ ہے کہ شعراء تو بہت حد سے نکل گئے۔ وہ آپ کی تعریف میں دوسرے انبیاء کی توہین کر گئے ہیں خصوصاً موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام تو ان کے تختۂ مشق ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

بر آسمان چہارم بیمار است ÷ تبسّم تو برائے علاج درکار است

(عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار ہیں۔ علاج کے لئے آپ کا تبسم درکار ہے)

کیا اس نے عیسیٰ علیہ السلام کی نبض دیکھی تھی آخر اسے ان کا بیمار ہونا کیسے معلوم ہوا اگر آسمان پر بھی وبا پھیلنے لگی تو خدا خیر کرے فرشتوں کی۔ واہیات ایک کہتا ہے ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات ÷ تو عین ذات می نگری در تبسمی

(ایک تجلی صفاتی سے موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے آپ تجلی ذاتی کو تبسم میں دیکھ لیتے تھے)

کتنا بڑا فیصلہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ذاتی نہ ہوئی تھی، صفاتی ہوئی تھی، پھر موسیٰ کے بیہوش نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر دنیا میں تجلی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیہوش نہ ہونے کی وجہ یہ بھی کہ آپ نے آخرت میں حق تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ آخرت میں تو موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش نہ ہوں گے، اور دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غالباً بے ہوش ہو جاتے کیونکہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو

گئے تھے، خدا کا دیدار دنیا میں ہوتا تو نہ معلوم کیا حال ہوتا۔ بھلا اگر کوئی مخالف اس شاعر پر اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو حق تعالیٰ ہی کی تجلی سے بے ہوش ہوئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے جو ایک مخلوق ہیں تو اس کے پاس کیا جواب ہوگا؟

شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مقامات ذوقی ہیں، اور ناقص کا ذوق کامل کے مقام ذوق کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم کو مقامات انبیاء میں کلام نہ کرنا چاہیئے ہمارا ذوق نبی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا غضب ہے کہ شیخ ابن عربی تو اتنے بڑے صاحب کشف ہو کر بھی مقامات انبیاء میں سکوت کی تعلیم دیتے ہیں اور آج ہر بیضاوی و جلالین پڑھنے والا بلکہ ہر شاعر مقامات انبیاء کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنی رائے سے وجوہ فضیلت بیان کرتا ہے۔ امت میں چند لوگ بڑے صاحب کشف ہوئے۔ ایک شیخ ابن عربی ان کا صاحب کشف ہونا سب کو مسلم ہے۔ دوسرے عبدالکریم جیلی یہ بھی بہت بڑے صاحب کشف ہیں انہوں نے جنت و دوزخ کی پیمائش تک لکھ دی ہے کیونکہ جنت و دوزخ گو کتنی ہی بڑی کیوں ہوں مگر پھر محدود متناہی ہیں۔ اور محدود کی پیمائش ہو سکتی ہے۔

نیز انہوں نے اپنے کشف سے ایک دریا معلوم کیا ہے جو اتنا بڑا ہے کہ اس کی ایک موج تمام عالم کو غرق کر دے، جس کی ایک موج کا یہ حال ہے خود وہ دریا کتنا بڑا ہوگا تمام زمین و آسمان اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے مگر ملائکہ اس کو تھامے ہوئے ہیں اور اسکی موجوں کو روکتے رہتے ہیں تاکہ عالم سے نہ ٹکرا دیں مگر باینہمہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہ دریا عرش سے کم ہے، عرش اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ عرش سے بڑی کوئی چیز نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اس قابل نہیں کہ حق تعالیٰ کی قرارگاہ ہو سکے کیونکہ قرارگاہ مستقر کو محیط ہونی چاہیئے اور حق تعالیٰ کو کوئی چیز محیط ہو نہیں سکتی۔ بلکہ وہی سب کو محیط ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے، اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں) کل شئی میں عرش بھی داخل ہے۔

رہا یہ کہ پھر استواء علی العرش کے کیا معنے ہیں سو یہ متشابہات میں سے

ہے جس کے معنے ہم بیان نہیں کر سکتے، سلف کا مذہب اس میں سکوت ہے۔ البتہ متاخرین نے صنعفا کی مصلحت سے کچھ مناسب معنے بیان کر دیئے ہیں، غرض جب یہ لوگ باوجود اتنے بڑے صاحب کشف ہونے کے مقامات انبیاء میں گفتگو کی جرأت نہیں کرتے تو ان شعراء یا طلبہ کی تو حقیقت کیا ہے۔

حقیقتِ مشاہدہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مشاہدہ سے عام لوگ حق تعالیٰ کا دیکھنا سمجھتے ہیں یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ رویت الٰہی دنیا میں محال ہے۔ بلکہ مشاہدہ کے معنی ہیں حضور، لیکن حضور کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ اب تک غائب ہوں، پھر آگئے۔ یہ معنے مراد نہیں کیونکہ حق تعالیٰ غیبت سے منزہ ہیں ایک صورت یہ ہے کہ تم اب تک غائب تھے پھر حاضر ہو گئے مشاہدہ سے یہی مراد ہے۔

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے محاورات میں بولا جاتا ہے جَاءَ بَعْلَبَكُّ آگیا بعلبک یا جاء تھانہ بھون، آگیا تھانہ بھون۔ اب بعلبک اور تھانہ بھون آنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تم اپنی جگہ رہو۔ اور یہ شہر حرکت کر کے تمہارے پاس آدیں مگر ظاہر ہے کہ یہ مراد نہیں ہوتا اور نہ اس کا وقوع ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ تو اپنے حال پر رہیں، اور تم حرکت کر کے ان کے پاس پہنچو، یہی مراد ہوتا ہے اور وقوع بھی اسی طرح ہے یہی حال حضور حق کا ہے کہ حق تعالیٰ تو اپنے حال پر رہتے ہیں، ہاں تم غیبت کے بعد مجاہدات و اعمال کے ذریعہ سے ان تک پہنچتے ہو تم پہلے غائب تھے پھر حضور سے مشرف ہوتے ہو۔

اور تمہارے غائب ہونے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ حق تعالیٰ کی نظروں سے غائب تھے کیونکہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز غائب نہیں چنانچہ ارشاد ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

ہم اسکی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں (اس میں قرب علمی ہی مراد ہے اور حق تعالیٰ کا علم ہر شئے کے ساتھ حضوری ہے۔ بلکہ ان کا علم تو حضوری سے بھی زیادہ حضوری ہے پھر وہاں غیبت معلوم کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے، بلکہ تمہارے غائب ہونے

کا مطلب ہے کہ تمہارا علم پہلے حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق نہ تھا اب معلوم ہوگیا۔

اسکی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تمہارے پاس موجود ہو مگر تم کو اسکی خبر نہ ہو کہ یہ میرے پاس ہے۔ اور ایسا اتفاق بہت دفعہ پیش آتا ہے کہ مجمع میں ایک شخص ہمارے پاس بیٹھا ہوتا ہے مگر ہم کو اسکی طرف التفات نہیں ہوتا اس صورت میں وہ تو ہم سے غائب نہیں مگر یہ کہنا صحیح ہے کہ تم اس سے غائب ہو کیونکہ تمہارا علم اس سے متعلق نہیں۔ اس کے بعد جب تم کو اسکی طرف التفات ہوا۔ اور تم نے اس کو پہچانا۔ اب غیبت کے بعد حضور ہوا، بہرحال غیبت سالک سے مراد عدم معرفت ہے اور حضور سے مراد معرفت ہے، اسی کو قرب کہا جاتا ہے۔

اس تقریر سے ایک اشکال کا جواب بھی ہوگیا وہ یہ کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم اسکی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) سے بظاہر یہ لازم آتا ہے کہ جب حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں تو ہم بھی ان سے قریب ہوں کیونکہ قرب و بعد امور نسبیہ خلشار کہ میں سے ہیں اور امور نسبیہ کے لئے طرفین ضروری ہیں تو جب ایک شے دوسری شے سے قریب ہے تو یقیناً دوسری بھی اس سے قریب ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ زید تو عمرو سے قریب ہو اور عمرو اس سے قریب نہ ہو بلکہ اگر وہ اس سے قریب ہے تو یہ بھی اس سے قریب ہے اور اس بنا پر لازم آتا ہے کہ سارا جہان مقرب ہو جائے۔ جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ یہ بات قرب حسی و قرب مکانی میں ہوا کرتی ہے کہ ایک شے کا دوسری سے قریب ہونا اس کے قرب کو بھی مستلزم ہے اور یہاں حق تعالیٰ کو بندہ سے اور بندہ کو حق تعالیٰ سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب مکانی حسی نہیں۔* بلکہ قرب علمی ہے اور قرب علمی میں یہ لازم نہیں کہ اگر ایک شخص کو دوسرے سے قرب علمی حاصل ہو تو دوسرے کو بھی اس

عہ فان قلت اذا کان القرب من الامور النسبیۃ یلزم فی القرب العلمی ایضاً من قرب احد الشیئین بالآخر قربہ بہ قلت لا کذا یلزم فی القرب العلمی من قرب احدھما بالآخر ھو کون الآخر قریباً منہ من حیث المعلومیۃ دون العالمیۃ فمراد الشیخ ان قرب شئی بالآخر من حیث العالمیۃ لا یستلزم قرب الآخر بہ من ہذہ الحیثیۃ فیجوز ان یکون احدھما عالماً بک وتکون انت جاہلاً بہ واما ان قرب شئی بالآخر من حیث العالمیۃ لا یستلزم قربہ بہ من حیث المعلومیۃ ایضاً فلم یردہ الشیخ اصلاً ۱۲ جامع۔

سے قرب علمی حاصل ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو دوسرے کا علم ہو اور دوسرے کو اس کا علم نہ ہو جیسا اوپر ایک مثال کے ضمن میں بتلایا گیا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو تو سب بندوں سے قرب علمی حاصل ہے مگر بندوں میں سب کو خدا تعالیٰ سے قرب علمی حاصل نہیں کیونکہ بہت سے اس سے غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ (ہم اس سے زیادہ قریب ہیں) فرمایا ہے ھُوَ اَقْرَبُ اِلَیْنَا (وہ ہماری طرف زیادہ قریب) نہیں فرمایا۔

اور یہ کوئی چیستاں نہیں ہے اسکی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا علم تو ہمارے ساتھ ہر وقت متعلق ہے اس لئے وہ اپنے علم سے ہمارے بہت نزدیک ہیں اور ہمارا علم حق تعالیٰ کے ساتھ یا تو متعلق ہی نہیں ہے یا متعلق ہے تو ہر دم متعلق نہیں، اس لئے ہم اپنے علم سے حق تعالیٰ سے ہر دم قریب نہیں ہیں خوب سمجھ لو۔

اور ہاں ایک بات پر میں اور متنبہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ مشاہدہ مطلق علم باللہ کا نام نہیں کیونکہ فی الجملہ علم تو خدا تعالیٰ کا سب کو حاصل ہے تو پھر سب کو صاحبِ مشاہدہ کہنا چاہیئے۔ بلکہ مشاہدہ اس تعلق علم کا نام ہے جو حق تعالیٰ کی صفات کاملہ کے واسطہ سے ہو۔ پھر یہ نہیں کہ ایک بار تعلق ہو گیا پھر نہ رہا بلکہ اس سے علم کا استحضار بھی مشاہدہ میں شرط ہے اسی کو معرفت کہا جاتا ہے (اور اس کے مقابل عدم معرفت سے بھی یہ مراد نہیں کہ حق تعالیٰ کا بالکل علم نہ ہو، کیونکہ اس کا وقوع عالم میں نہیں اور کم از کم مسلمانوں میں تو ہے ہی نہیں بلکہ عدم معرفت سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا علم بواسطہ صفات کاملہ کے استحضار کے ساتھ نہ ہو ۱۲ جامع)

یہاں سے یہ شبہ زائل ہو گیا کہ جب مشاہدہ قرب علمی کا نام ہے تو جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہے اور ایسے سب ہی مسلمان ہیں ان کو صاحب مشاہدہ کیوں نہیں کہا جاتا جواب یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا ویسا علم حاصل نہیں جیسا ہونا چاہیئے۔ اول تو بہت سوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا علم نہیں اگر ہے تو اجمالاً ہے تفصیلاً نہیں پس ان کے علم کی وہی شان ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا تھا اس کے ایک سونڈ بھی اور آنکھیں نہیں تھیں ظاہر ہے کہ جاننے والا یہی کہے گا کہ تو نے بادشاہ کو

نہیں دیکھا، اور جن لوگوں کو حق تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کا تفصیلی علم بھی ہے جیسے بہت سے علماء ظاہر کی یہ شان ہے تو ان کو اس علم کا استحضار نصیب نہیں اس لئے وہ بھی صاحب مشاہدہ نہیں ہیں پس مشاہدہ کے یہ معنی ہوئے کہ توجہ کرنا حق تعالیٰ کی طرف مرتبہ صفات میں یعنی بواسطہ صفات کے مع استحضار توجہ کے دائماً۔

معائنہ حق

اور ایک درجہ حضور کا اس سے آگے ہے اس کو معائنہ کہا جاتا ہے وہ توجہ کرنا ہے ذاتِ حق کی طرف بلا واسطہ صفات کے یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کو صفات کا علم نہیں ہوتا۔ صفات کا علم تو ہوتا ہے اور پہلے وہ بھی صفات کے واسطہ سے متوجہ بحق ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کی توجہ کے لئے واسطہ صفات کی ضرورت نہیں رہی بلکہ بلا واسطہ ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے گو یہ توجہ اجمالی ہی ہو مبہم ہی ہو من وجہ ہی ہو۔ لیکن ملتفت الیہ بالذات اس وقت عین ذات ہوتی ہے صفات ملتفت الیہ نہیں ہوتیں اور درجہ مشاہدہ میں ملتفت الیہ بالذات صفات تھیں اور ذات ملتفت الیہ بواسطہ تھی گو مقصود اس وقت بھی توجہ الی الذات ہی ہوتی ہے مگر چونکہ اس شخص کو بلا واسطہ صفات کے ذات کی طرف توجہ نہیں ہوتی اس لئے التفات اولی صفات ہی کی طرف ہوتا ہے پس قصد کے لحاظ سے تو مشاہدہ میں بھی ذات مقصود بالذات ہے اور صفات مقصود بالعرض مگر التفات کے لحاظ سے صفات ملتفت الیہ بالذات ہیں اور ذات ملتفت الیہ بالعرض۔

توضیح کے لئے ایک مثال میں اس فرق کو سمجھئے۔ مثلاً ایک شخص محبوب کے پاس حاضر ہے۔ لیکن محبوب کے اور اس کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے اس وقت مقصود تو اس کو بھی ذاتِ محبوب کی طرف توجہ ہے لیکن حجاب کی وجہ سے یہ عین ذات کی طرف بلا واسطہ توجہ نہیں کر سکتا بلکہ محبوب کی صفات حسن وجمال کو ذہن میں حاضر کر کے لذت لیتا اور انکو توجہ الی المحبوب کا واسطہ بناتا ہے۔ اور ایک شخص محبوب کے پاس اسطرح حاضر ہے کہ درمیان میں کوئی حجاب نہیں اسکی توجہ اولاً ذات کی طرف ہوگی گو طبعاً صفات کی طرف بھی التفات ہوگا۔ تو پہلے شخص کا ملتفت علیہ بالذات صفات تھیں اور

ذات ملتفت الیہ بالعرض، وہ تو صاحبِ مشاہدہ ہے۔ اور دوسرے شخص کا ملتفت الیہ بالذات عین ذات ہے اور صفات ملتفت الیہ بالعرض یہ صاحب معائنہ ہے۔ باقی قرب دونوں کو حاصل ہے، صاحب معائنہ کو بھی اور صاحب مشاہدہ کو بھی گو کیفیت قرب میں تفاوت ہو۔

اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صاحب معائنہ کے لئے کوئی حجاب باقی نہیں رہتا، سب حجابات مرتفع ہو جاتے ہیں نہیں حجاب اس کے لئے بھی باقی ہے لیکن یہ حجاب التفات اولی الی الذات سے مانع نہیں گو یہ التفات اجمالی ہی ہو مبہم ہی ہو مگر اولاً بالذات ذات ہی کی طرف ہے اور صاحب مشاہدہ کے درمیان جو حجابات ہیں وہ ذات کی طرف التفات اولی ہی سے مانع ہیں یہ فرق ہے دونوں میں خوب سمجھ لو۔

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ معائنہ میں صفات کی نفی نہیں انکی طرف التفات کی نفی ہے میں یہ مضامین دقیقہ مجمع میں بیان نہ کرتا۔ مگر چونکہ آجکل تصوف کی کتابیں اردو میں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں جن کو عوام دیکھتے ہیں اور سمجھتے نہیں جس سے بہت لوگوں کا ایمان غارت ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ مضامین بیان کر دیئے کہ اگر کسی کی نظروں سے کتابوں میں یہ مضامین گذرے ہوں اور حقیقت سمجھ میں نہ آئی ہو وہ اس بیان سے حقیقت کو سمجھ لے اور جس کی نظر سے یہ مضامین نہ گذرے ہوں اس کو ان کے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

مقصودِ مجاہدہ

غرض ہر قوم کی اصطلاح جدا ہے صوفیہ اس مقصود کو جس پر سفر سلوک میں درجہ منتہیٰ ہوتا ہے مشاہدہ کہتے ہیں اور مشاہدہ کے معنے ان کے نزدیک حضور ہیں اور حضور کی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی، اور مشاہدہ سے رویت مراد نہیں کیونکہ وہ دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ ہاں آخرت میں ہو گی اسی واسطے بزرگوں نے وصیت کی ہے ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں ٭ کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا بیکار، اور کوشش کرنا لاحاصل ہے اسی طرح ذات محبت کی کنہ کا ادراک نہیں ہو سکتا اس کے لئے فکر و سوچ بیکار ہے)

یعنی دیدار کی ہوس دنیا میں نہ کرو اتنا ہی بہت ہے کہ ادھر توجہ ہو جائے غیر سے توجہ ہٹالی جائے اور حق تعالیٰ کو راضی کیا جائے۔ بس یہی مقصود ہے اور اسی مقصود کو علمی اصطلاح میں قرب و رضا سے تعبیر کیا جاتا ہے نشاط۔ دنیا میں تمام مجاہدات کا منتہی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔

اس آیت میں اسی مقصود کے حصول کا وعدہ ہے گو اس کی تعبیر سبل سے کی گئی ہے کیونکہ خود مقصود میں مدارج غیر متناہی ہیں اور ہر درجہ آئندہ درجہ کے لئے سبیل ہے اس لئے یہ آیت مجاہدہ کے بعد وعدہ حصول مقصود یعنی مشاہدہ پر دلالت کر رہی ہے۔

نسبت باطنیہ اور یہاں میں ایک بات پر اور تنبیہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تقریر سابق سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ مشاہدہ مقصود ہے اور مشاہدہ کے معنی حضور ہیں مگر حضور سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف اتنی توجہ ہو کہ غیر کی طرف اتنی توجہ نہ ہو۔ بعبارت دیگر یوں کہیئے کہ دوسروں کی طرف اتنی توجہ نہ رہے جتنی حق تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہی حاصل ہے نسبت باطنیہ کا باقی یہ کہ غیر کی طرف بالکل التفات نہ ہو، سو ایسا بھی کبھی کبھی ہوتا ہے مگر محققین نے لکھا ہے کہ اس کا ہمیشہ ہونا ضروری نہیں چنانچہ عارف فرماتے ہیں ؎

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو ٭ یعنی طمع مدار وصال دوام را

مشاہدہ کا نام وصال بھی ہے۔ تو نسبت باطنیہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غیر کی طرف بالکل التفات نہ ہو بلکہ اتنا کافی ہے کہ غیر کی طرف التفات کم ہو۔ اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ زیادہ ہو کہ اکثر اوقات اسکی طرف توجہ رہے۔

حدیث شریف میں بھی اسکی تصریح ہے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حنظلہ صحابی رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راستہ میں ملے، حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا کیا حال ہے فرمایا نَافَقَ حَنْظَلَةُ یعنی حنظلہ منافق ہو گیا۔ پوچھا کیوں؟

قَالَ اِذَا كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّا عِنْدَهٗ كَاَنَّا نَرَى الْجَنَّةَ وَالنَّارَ رُؤْيَةَ عَيْنٍ وَاِذَا فَارَقْنَاهُ نَافَسْنَا الْاَمْوَالَ وَالْاَوْلَادَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ

وَاَنَا کَذٰلِكَ۔

یعنی فرمایا جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری یہ حالت ہوتی ہے گویا جنت و نار کو اپنے سامنے دیکھ لیتے ہیں۔ پھر آپ سے جدا ہو کر اموال و اولاد میں لگ جاتے ہیں۔ اور یہ حالت نہیں رہتی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے۔ اگر یہ نفاق ہے تو ہم بھی منافق ہیں، چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چل کر دریافت کریں۔

صحابہؓ کی خشیت و شدت حرص کی کچھ حد ہے کہ تغیر حالت کو بھی نفاق سمجھنے لگے وہ چاہتے تھے کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی ہے وہی حالت ہمیشہ رہے، اور اس کے تغیر سے ان کے ضعف ایمان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ تغیر احوال سے تو کیا اندیشہ ہوتا تغیر اعمال سے بھی اندیشہ نہیں ہوتا کبھی جماعت فوت ہو جاتی ہے، کبھی نماز قضا ہو جاتی ہے، کبھی غیبت و نگاہ بد میں مبتلا ہیں، اور اپنے کو صاحب نسبت اور صاحب کمال سمجھتے رہتے ہیں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہوتا کہ یہ حالت کیسی ہے، سو بات یہ ہے کہ عشق میں کمی ہے عشق کامل ہو تو بات بات میں اندیشہ اور خوف ہوتا ہے ؎

باسایہ ترا نمی پسندم ✿ عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں تو تجھ سایہ کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتا)

میرے ایک دوست مولوی صادق الیقین صاحب وہ کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہیں حق تعالیٰ مجھ سے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں کہ تو اتنا بڑا متقی کیوں تھا ان کو زیادہ تقویٰ پر بھی اندیشہ تھا۔ زاہد خشک اس کو نہ سمجھے گا۔ وہ تو یہ کہے گا کہ قلت تقوے تو اندیشہ کی چیز ہے کثرت تقویٰ میں کیا اندیشہ ہے۔ یہ تو جتنا زیادہ ہو اچھا ہے۔ مگر فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک حبہ حنطہ کو لقطہ سمجھ کر اسکی تعریف و تشہیر کرے حاکم اس کو سزائے تعزیر دے، کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ اور غلو فی الدین ہے کہ ایک گیہوں کے دانے کو پوچھتے پھرتے ہیں کہ یہ کس کا ہے، واقعی شریعت پل صراط ہے

بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے اگر تقویٰ کی کوئی حد نہ ہوتی تو تقویٰ آسان تھا مگر یہاں تو ہر چیز کی حد ہے جس سے آگے بڑھنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے مولوی صادق الیقین صاحب کو اندیشہ تھا کہ میں جو ورع و تقویٰ میں بہت سعی کرتا ہوں کہیں یہ غلو فی الدین کی حد تک نہ پہنچ گیا ہو۔

ان کا اندیشہ بھی ویسا ہی تھا جیسا حضرت حنظلہ کو اپنے اوپر نفاق کا خوف ہوا تھا۔ وہ نفاق کو عام سمجھ گئے، حالانکہ نفاق نام ہے اظہار الایمان و ابطان کفر (کفر چھپانا) کا مگر چونکہ اس حالت کو فی الجملہ اس سے مشابہت تھی اس لئے خوف ہوا اور فی الجملہ مشابہت یہ تھی کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی وہ پیچھے نہ رہتی تھی، اور نفاق میں بھی یہی ہوتا ہے کہ سامنے کچھ اور پیچھے کچھ تو جتنا حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتا تھا۔ بعد میں اس میں کمی ہونے سے اندیشہ نفاق کا ہوا۔ گو نفاق کامل نہ ہی ناقص ہی سہی کیونکہ جس طرح ایمان کے بہت سے مراتب ہیں اسی طرح نفاق کے بھی مراتب ہیں،؛ نِفَاقٌ دُوْنَ نِفَاقٍ (نفاق کم درجہ کا نفاق) وَ کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ (کفر کم درجہ کا کفر ہے) مگر عاشق کے نزدیک نفاق ناقص کا احتمال بھی خطرناک اور اندیشہ ناک ہے۔ اب دونوں حضرات طبیب کامل سید الاطباء الروحانیین کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَاللّٰہِ کُنْتُمْ بَعْدِیْ کَمَا تَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلٰئِکَۃُ علی الفرش ولکن یا حنظلۃ ساعۃ وساعۃ (او کما قال)

بخدا اگر تم میرے پیچھے بھی ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے ہوتے ہو تو تم سے فرشتے بستروں پر مصافحہ کیا کرتے۔ لیکن اے حنظلہ ایک وقت اس طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وقت اس طرح کا۔ یہاں علماء قشر کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت حنظلہ کی موجودہ حالت کامل نہ تھی، گو نفاق بھی نہ تھی۔ کامل حالت وہی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی ویسے ہی رہتی جیسے آپ کے سامنے ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ فرشتے مصافحہ کرنے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کہ غیر کی طرف التفات بالکل نہ ہو بلکہ اسکی حقیقت یہ ہے کہ غیر کی طرف حق تعالیٰ سے زیادہ التفات نہ ہو اسی لئے عارف فرماتے ہیں ؎

در بزم دور یک دو قدح درکش و برو ❊ یعنی طمع مدار وصال دوام را

(بزم دور میں ایک دو پیالے پیو اور چلتے بنو یعنی ہمارے ہمیشہ وصال کی طمع نہ رکھو) اگر ہر دم استغراق کامل ہی میں رہے تو مجذوب ہو جائیگا جو نہ اپنے کام کا ہے نہ دوسرے کے کام کا، نہ نماز کا رہے گا نہ روزے کا نہ بیوی بچوں کا نہ کھانے کمانے کا۔

واسطہ بین الحق والعبد

غرض نسبت باطنیہ کے لئے ہر وقت استغراق لازم نہیں نسبت باطنیہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف دھن اور التفات لگ جائے گو کبھی استغراق ہو کبھی نہ ہو۔ یہ دوسرا مقدمہ ہوا تعیین مقصود میں کہ وہ قرب حق ہے۔

اب تیسرا مقدمہ سمجھیے۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ یہاں دنیا میں ہم سے غائب ہیں یعنی حواس سے ان کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ چوتھا مقدمہ یہ کہ غائب کی طرف طبعاً توجہ قوی و مستمر نہیں ہو سکتی توجہ کامل و مستمر حاضر محسوس ہی کی طرف ہو سکتی ہے غائب کی طرف تھوڑی دیر توجہ ہوتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے تو اس توجہ کی قوت کے لئے کوئی واسطہ ہونا چاہیے اور واسطہ بھی ایسا ہو جو انسان کے مناسب ہو۔

یوں تو مراقبات اور اشغال بہت ہیں مگر ان میں بھی کسی محسوس کی طرف توجہ نہیں ہوتی غائب ہی کی طرف توجہ ہوتی ہے اور انسان کی خاصیت یہ ہے کہ غائب سے دفعۃً اس کا تعلق قوی نہیں ہوتا۔ اب اس تعلق کے قوی کرنے کی ۲ صورتیں ہیں۔ یا تو حق تعالیٰ خود سامنے ہوں۔ یہ تو دنیا میں دشوار ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق رکھنے والی کوئی چیز اس کے سامنے ہو جس سے حق تعالیٰ کا خاص تعلق ہو کیونکہ تعلق عام توجہ خاص کے لئے کافی نہیں عاشق محبوب کے شہر میں جاتا ہے تو گو شہر سے بھی محبوب کو تعلق ہے مگر اتنا نہیں جتنا خاص اپنے گھر سے ہے۔ اسی لئے شہر میں جا کر عاشق کی وہ حالت نہیں ہوتی جو خاص گھر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ غرض دلائل سے

اسکی ضرورت ثابت ہو گئی کہ کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جس کے ذریعے سے حق تعالیٰ کی یادداشت بڑھ جائے اور اسکی طرف توجہ جم جائے۔ شریعت نے اس کا بہت اہتمام کیا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ

یَا اَنَسُ اِجْعَلْ بَصَرَكَ حَیْثُ تَسْجُدُ

یعنی نماز میں نظر اِدھر اُدھر نہ لیجاؤ، بلکہ سجدہ کی جگہ پر نظر رکھو کہ سجدہ کی جگہ پر رحمت کا نزول ہوتا ہے جیسا ابھی آتا ہے اگر صاحب قرب کا مشاہدہ نہیں ہے تو کم از کم مقام قرار ہی کا مشاہدہ کرتے رہو۔ اس سے توجہ الی اللہ میں اعانت ہوگی۔

اسی طرح نماز میں فعل عبث سے ممانعت ہے۔ سکون کا امر ہے۔

قَالَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ وَ لَا یَمْسَحُ الْحِصَا فَاِنَّ الرَّحْمَۃَ تُوَاجِھُہٗ

یعنی کنکریوں کو نماز میں نہ چھوؤ کیونکہ حق تعالیٰ کی رحمت سامنے ہوتی ہے۔

اسی طرح نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ممانعت فرمائی اور علت اس کی یہ ارشاد فرمائی ہے:

لَا یَزَالُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ مُقْبِلًا عَلَی الْعَبْدِ وَھُوَ فِیْ صَلٰوتِہٖ مَا لَمْ یَلْتَفِتْ فَاِذَا الْتَفَتَ انْصَرَفَ عَنْہُ

جب بندہ (خدا سے اعراض کر کے) اِدھر اُدھر متوجہ ہوتا ہے۔ وہ بھی بندہ سے اعراض کرتے ہیں ان روایات میں مقام سجدہ اور جہت قبلہ کی طرف متوجہ رہنے کی کتنی تاکید ہے اب خدا تعالیٰ تو نظر نہیں آتے مگر وہی موقع جو مقام عبادت ہے اس کو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے ادھر متوجہ ہونا گویا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ بواسطہ ہی ہو سکتی ہے۔ غائب کی طرف توجہ بلا واسطہ دائم نہیں رہ سکتی ذرا توجہ کی اور اچٹ گئی اس لئے وسائط کی ضرورت ہے اور ان وسائط کو جس طرح بقاء توجہ میں دخل ہے حدوث توجہ میں بھی دخل ہے۔ کیونکہ انکو حق تعالیٰ سے تعلق ہے تو انکی طرف متوجہ ہونے سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا بھی ہوگی اور متوجہ رہنے سے توجہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بہر حال یہ وسائط محض اس لئے مشروع ہوئے ہیں کہ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غائب کی طرف بلا واسطہ ہمیشہ متوجہ نہیں رہ سکتا باقی یہ وسائط مقصود نہیں ہیں اور خیر یہ وسائط تو کیا مقصود ہوتے ان سے بڑھ کر جو وسائط ہیں یعنی وسائط فی السلوک وہ بھی مقصود نہیں ہیں۔ ہر واسطہ میں مسلمان کا مقصود صرف ایک ہی ذات ہے۔

اقسام واسطہ اور ان کی حیثیت

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وسائط کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وسائط فی العلوم جو تعلیم طریق میں واسطہ ہیں۔ دوسرے وسائط فی العمل جو توجیہ فی اداء العبادۃ میں واسطہ یعنی معین ہیں۔ اور توحید کی کس قدر حفاظت کی گئی ہے کہ وسائط طریق کو سمت عبادت نہیں بنایا گیا گو فضیلت انکی کعبہ سے زیادہ ہے۔ چنانچہ علماء امت کا اتفاق ہے کہ جس بقعہ ارض سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر مماس ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو کعبہ سے تو بدرجہ اولیٰ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فضیلت اس جگہ میں محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتصال سے آئی ہے تو خود آپ کی ذات مقدس تو یقیناً عرش سے افضل ہوگی اور عرش کعبہ سے افضل ہے تو آپ کعبہ سے بھی افضل و اعظم ہیں۔

نیز ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن کعبہ کو دیکھا اور اس کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تیری عظمت اور حرمت کو جانتا ہوں مگر مومن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے اسی لئے نماز سے فارغ ہو کر جب امام بیٹھتا ہے تو مسلمانوں کی طرف منہ کر کے کعبہ سے انحراف کر لیتا ہے۔ جب ہر مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے تو جو حضرات مشائخ طریق اور انبیاء اولیاء میں یقیناً انکی حرمت کعبہ سے بدرجہ اولیٰ زیادہ ہوگی۔ مگر بایں ہمہ انکو سمت عبادت

ع اس حدیث نے تو مخالفین کے اعتراضات کا استیصال ہی کر دیا بھلا جب مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے تو پھر استقبال کعبہ سے یہ شبہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمان کعبہ کو مقصود و مسجود و معبود سمجھتے ہیں کوئی عابد بھی اپنے کو معبود سے افضل سمجھا کرتا ہے ہرگز نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپکو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں پھر وہ انکا معبود و مسجود کیونکر ہو سکتا ہے۔ بس سوا اس کے کچھ نہیں کہ کعبہ محض سمت عبادت ہے۔ (۱۲ جامع)

نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ کعبہ تو ایک کوٹھڑی ہے۔ اس کی سمت عبادت ہونے سے کسی کو اس کے مقصود و مسجود ہونے کا وہم نہیں ہو سکتا کوئی بہت ہی احمق ہوگا جسے ایسا وہم ہو۔

بخلاف وسائط تعلیم کے کہ انکو سمتِ عبادت بنانے میں اندیشہ قوی تھا کہ جہلا ان کو مقصود و مسجود سمجھ جائیں اس لئے کہ وسائط تعلیم میں سب سے افضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی حالت یہ تھی کہ ہزاروں معجزات و خوارق عادات آپ کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے۔ آپ کی ذات بابرکات میں سینکڑوں کمالات ایسے موجود تھے جو کسی انسان میں نہ تھے اس حالت میں اگر آپ کی ذات کو سمتِ عبادت بنا دیا جاتا تو یقیناً بہت سے جاہل آپ کو خدا بنا لیتے۔ باوجود سمت عبادت نہ بنانے کے تو جہلا کی یہ حالت ہے کہ آپ کو بشریت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی ذات کو سمت عبادت بھی بنا دیا جاتا تو نہ معلوم لوگ کیا غضب ڈھاتے۔ اسی طرح اہل اللہ میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے زیادہ کمالات معنویہ ہوتے ہیں اور بعض صاحب کمالات حسیہ بھی ہوتے ہیں ان کو سمت عبادت بنانے میں یہی اندیشہ تھا اس لئے وسائط تعلیم کو سمتِ عبادت نہیں بنایا گیا۔ گو فضیلت میں وہ کعبہ سے بدرجہا زائد ہوں۔ مگر ان کے احکام اور ہیں اور وسائط فی العمل کے احکام اور ہیں وسائط تعلیم کی طرف سجدہ کرنا یا ان کی طرف جھکنا حرام ہے۔ اور وسائط فی العمل کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ عبادت میں انکی طرف منہ کیا جاتا ہے۔

ضرورت بیت اللہ الکریم ایسے ہی وسائط میں سے ایک واسطہ بیت اللہ ہے کہ اس کے خاص تعلقات حق تعالیٰ کے ساتھ ظاہر کئے گئے۔ اور اس اظہار کی تقریر کے لئے اس کے کونہ میں ایک پتھر جنت کا نصب کیا گیا ہے جس کا لقب یمین اللہ رکھا گیا۔ کیونکہ اگر آپ محبوب حقیقی کو دیکھتے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے۔ ایک معاملہ تو یہ ہوتا کہ اس کو محبوب و مطلوب اور معبود و مسجود سمجھتے اس کو تو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس کے سوا جو معاملہ بھی آپ محبوب کے ساتھ کرتے۔ ان سب معاملوں کی بیت اللہ کے ساتھ اجازت ہے۔ اگر آپ محبوب کے گھر پہنچتے تو جب تک صاحب خانہ سے ملتے اس وقت تک گھر کے گرد گھومتے پھرتے دیواروں کو چومتے (جیسا کہ

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حقیقتِ حج

اور بیت اللہ کے ساتھ اس برتاؤ کا نام حج ہے اور حج کی حقیقت مشاہدہ ہے چنانچہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ تو اب مجاہدہ کے بعد جو کہ عبادات رمضان میں مرعی ہیں مشاہدہ کا وقت ہے۔ شاید اس لئے رمضان کے متصل شوال ہی سے اشہر حج شروع ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مجاہدہ کے بعد ہی ہدایت سبیل کا وعدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

اور جو لوگ ہمارے راستہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انکو اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے۔ اور میں بدلیل کہہ چکا ہوں کہ ہدایت سبیل اس آیت میں ایصال کو مستلزم ہے اور وصول الی المقصود ہی کو مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ بس ثابت ہوا کہ مشاہدہ کا وعدہ مجاہدہ سے متصل ہے۔ اسی لئے اشہر حج رمضان سے متصل ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ گو حج ذی الحجہ میں ہوگا اور یہ محض شاعری نہیں بلکہ بعض افعال حج بھی شوال ہی سے شروع ہو جاتے ہیں یعنی احرام کہ قبل شوال مکروہ ہے اور احرام تیاری ہے مشاہدہ کی۔ اور مشاہدہ کی تیاری بھی اسی کے حکم میں ہے۔ تو اب رمضان کے بعد بلاتے ہیں کہ آؤ مشاہدہ کرو اور ہم سے ملو اور وہ ملنا یہ ہے کہ جب تک تم ہمارے دیکھنے کے قابل ہو اس وقت تک ہمارے گھر کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو ہمارے ساتھ کرتے بجز مقصودیت و مسجودیت کے کہ اس کی اجازت نہیں یہ صرف ذی واسطہ کا حق ہے۔ واسطہ کو مقصود و مسجود سمجھنا شرک و کفر ہے باقی اور سب برتاؤ کی اجازت ہے۔

افعالِ حج کی حکمتیں

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ حج کی حقیقت مشاہدہ ہے۔ چنانچہ محبوب سے ملنے کے لئے عاشقانہ انداز سے تیاری کرتے ہیں احرام باندھتے ہی سر ننگے ہو جاتے ہیں۔ سلے ہوئے کپڑے چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ عاشق کو یہ تکلفات کہاں سوجھتے ہیں کہ اچکن ہو کرتہ ہو۔ پاجامہ، وہ تو ویسے ہی کپڑا لے کو لپیٹ لیا کرتا ہے اس لئے احرام میں بھی چادر و لنگی پہنی جاتی ہے اور سر کھلا رہتا ہے مگر پیر نہیں ننگے ہوتے کیونکہ کانٹا وغیرہ لگنے کا اندیشہ ہے جس سے تکلیف کا خوف

ہے تو وہ عاشق نواز بھی ہیں کہ اپنے عشاق کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔

دوسرے یہ بھی بتلا دیا کہ تمہارا عشق چاہے کتنا ہی زیادہ ہو۔ ناتمام ہی رہے گا کامل کبھی نہ ہوگا۔ اس لئے نقصان ظاہر کرنے کو جوتہ نکالنے کا حکم نہیں کیا۔

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است ؛ باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خط و خال کی احتیاج نہیں ہے)

اسی لئے کھانے کی اجازت ہے ہاں وحشی کے شکار کی ممانعت ہے اور مچھلی کے شکار کی اجازت ہے نہانے کی اجازت ہے اور خوشبو لگانے خط بنوانے ناخن کترنے کی ممانعت ہے حالانکہ عاشق کو تو نہ مچھلی کے شکار کی فرصت ہوتی ہے نہ وحشی کے، نہ نہانے کی فکر ہوتی ہے نہ حجامت کی۔ تو چاہیئے تھا کہ ان سب افعال کی ممانعت ہو جاتی مگر ایسا نہیں کیا، بلکہ بعض کی اجازت دی اور بعض سے روک دیا تاکہ معلوم ہو کہ ہمارا عشق ناتمام ہی رہے گا۔

غرض نفس حج کا مشروع ہونا تو عقلی مسئلہ ہے، خود عقل اس کا تقاضا کر رہی ہے آگے افعال عاشقانہ ہیں ان کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔

اور اگر اس بنا کا لحاظ کیا جائے جس کی وجہ سے عقل مشروعیت حج کا تقاضا کر رہی ہے تو یہ افعال بھی عقلی اور سراسر مطابق عقل ہیں کیونکہ مشروعیت حج کا مبنیٰ تو یہی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے ایسے افعال کئے جائیں۔ جن سے تعلق بالغائب مستحکم و دائم ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو۔ اور یہ بنا تمام افعال حج میں موجود ہے، کیونکہ وہ سب عاشقانہ افعال ہیں، تو اب وہ بھی عقلی ہو گئے چنانچہ احرام و طواف کا عاشقانہ فعل ہونا تو معلوم ہو چکا۔

اب آگے چلو تو عاشق کبھی جنگلوں جنگلوں مارا مارا پھرا کرتا ہے، اسی طرح حجاج کبھی منیٰ میں جاتے ہیں کبھی مزدلفہ میں کبھی صفا پر چڑھتے ہیں کبھی مروہ پہ کبھی آہستہ چلتے ہیں کبھی دوڑ کر پھر کبھی عاشق کو اپنے گھر سے نکال بھی دیا کرتے ہیں یا تو عتاب کی وجہ سے یا کسی حکمت کی وجہ سے محبوب اگر حکیم ہو تو تجدید نشاط کے لئے کبھی عاشق کو اپنے سے الگ

کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک جگہ میں رہنے سے شوق کم ہو جاتا اور ولولۂ عشق فرو ہو جاتا ہے۔ اہل مکہ میں جو حکما رہیں وہ تجدید نشاط کے لئے مکہ والوں کو باہر جانے کی ترغیب دیا کرتے ہیں تاکہ سفر میں کعبہ سے غیبت ہو تو پھر شوق تازہ ہو اور ولولہ پیدا ہو۔ اسی طرح حجاج کو ایک دن حد حرم سے باہر جانے کا حکم ہوتا ہے۔ یہ وقوف عرفہ ہے۔ رمی جمار کی یہ حکمت ہے کہ عاشق رقیب کے ڈھیلے پتھر مارا کرتا ہے۔ حجاج بھی شیطان کے جلانے کو خاص موقع پر پتھر مارتے ہیں گو شیطان رقیب نہیں کیونکہ حق تعالیٰ سے اس کو محبت نہیں مگر عشاق کے لئے مانع تو ہے دشمن تو ہے۔ پھر جس طرح کہ عاشق محبوب کے سامنے نذر پیش کرتا ہے اسی طرح حجاج خدا کے نام پر قربانی کرتے ہیں جو ان کی جان کا فدیہ ہے۔ عشق کا مقتضا تو یہ تھا کہ اپنی جان کو نذر میں پیش کرتے مگر حق تعالیٰ عاشق نواز ہیں اس لئے جان کے عوض میں ان کے محبوب جانوروں کی جان کو قبول فرما لیتے ہیں اس کے بعد پھر دوبارہ مشاہدہ بیت کے لئے بلاتے اور طواف زیارت میں اظہار محبت کی اجازت دیتے ہیں۔ غرض اول سے آخیر تک سب افعال عاشقانہ ہیں۔

افعال حج کے اثرات

پھر جب حق تعالیٰ نے ان افعال کو مشروع کیا ہے تو ان میں اثر بھی رکھا ہے اس کا مشاہدہ ایسے ہوتا ہے کہ بیت اللہ کے برابر کسی چیز کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ بیت اللہ کو دیکھ کر گھر دل پانی آنکھوں سے امنڈتا ہے جس کو حج نصیب ہو وہ جا کر دیکھ لے آخر کوئی تو بات ہے حجاج جب لبیک کہتے ہیں تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے جب ننگے سر لنگی چادر پہنے ہوئے فقیر بادشاہ ایک صورت میں نظر آتے ہیں۔ تو کفار کے دل پر بھی اثر ہوتا ہے کہ کس چیز نے سب کو برابر کر دیا۔ بس سب کا یہ حال ہوتا ہے۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی ؛ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(اے جامی تو بندہ عشق ہے نسب کو چھوڑ کہ اس راستہ میں فلاں بن فلاں کوئی چیز نہیں ہے) عشق نے سب کو برابر کر دیا۔ نہ بادشاہ بادشاہ معلوم ہوتا ہے نہ غلام غلام سب ایک صورت میں ننگے سر ہوتے ہیں۔ سب کے بال بڑھے ہوئے ناخن لمبے لمبے ہیں۔ اور گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے جو جگہ مس کئے ہوئے ہے۔ وہ عرش سے بھی افضل ہے

تو بیت اللہ سے بدرجہ اولیٰ مگر باینہمہ روضہ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم (قبہ خضرا) کو دیکھ کر جو حالت ہوتی ہے وہ اس قسم کی نہیں جو بیت اللہ کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ وہاں رونا محبت جمال سے ہوتا ہے اور یہاں محبت جلال سے۔ اور کیوں نہ ہو مشاہدہ بیت میں مشاہدہ رب البیت کا اثر کچھ تو ہونا چاہئیے۔ پس حج کا حاصل یہ ہے کہ ایسے وسائط سے تعلق پیدا کیا گیا ہے جن سے تعلق مع اللہ کو قوت ہو بعبارت دیگر یوں کہیئے کہ اور تمام عبادات تو مجاہدہ ہیں اور حج مشاہدہ ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود ٭ حج رب البیت مردانہ بود

(حج خانہ کعبہ کی زیارت کرنا ہوتا ہے حج رب البیت مردانہ ہوتی ہے)

جو لوگ طریق مجاہدہ کو صحیح طور پہ طے کر چکے ہیں وہ واقعی صرف حج بیت نہیں کرتے بلکہ حج رب البیت کرتے ہیں اگر ظاہری آنکھوں سے گو دیدار نصیب نہ ہو مگر حج میں قلب سے ان کو مشاہدہ حق ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

حج کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ لغت میں حج کے معنی قدوم غلبہ کے بھی ہیں اور قدوم وصال کا ہم معنی ہے اور غلبہ کامیابی کا مرادف ہے پس لفظ حج میں وصال و کامیابی پر دلالت ہے اور اس کو اصطلاح میں مشاہدہ کہا جاتا ہے ۱۲ جامع) حج کی حقیقت مشاہدہ ہونا خود اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ جس طرح لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھا دیں گے) میں سبیل کا لفظ وارد ہوا ہے اسی طرح حج کے بارے میں مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا (جو شخص استطاعت رکھے اس کی طرف راستہ کی) فرمایا گیا ہے۔ دونوں جگہ لفظ سبیل ہے۔ مادہ ایک ہی ہے معلوم ہوا کہ جس مشاہدہ کا وعدہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھا دیں گے) میں فرمایا ہے اس کا ظہور حج میں ہوتا ہے، اشارہ کے لئے اتنا کافی ہے باقی مدلول نص تو میں اس کو کہتا نہیں، خلاصہ یہ کہ اعمال رمضان مجاہدہ ہیں اور اعمال حج مشاہدہ ہیں اور مشاہدہ بعد مجاہدہ کے ہوا کرتا ہے اس لئے حج رمضان کے متصل مشروع ہوا۔ میں اسی اتصال زمانی کی وجہ سے اکثر رمضان کے بعد حج کا معمولاً بیان کیا کرتا ہوں۔

حج و رمضان میں باہمی مناسبت

مگر اب مجھے یہ مضمون ذہن میں آیا کہ ان دونوں میں اتصال زمانی کے ساتھ اتصال معنوی بھی ہے وجہ یہ کہ اعمال رمضان سے جو محبت اور توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے حج سے اس کا دوام و استحکام کیا جاتا ہے اجمالاً یہ مضمون میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ

دوام و استحکام کیا جاتا ہے۔ اجمالاً یہ مضمون میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ ان وسائط سے محبت کو باقی رکھا گیا ہے اس اجمال کی برکت سے یہ تفصیل میرے قلب پر وارد ہوئی کہ غائب کے ساتھ تعلق بلا واسطہ دائم نہیں رہ سکتا، توجہ بلا واسطہ تھوڑی دیر ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسے وسائط کو اختیار کیا گیا جن کے واسطے سے یہ محبت اور توجہ دائم ہو جاوے۔

تذکرۂ حج کا اثر

اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ پھر چاہیے تھا کہ حج ہر سال فرض ہوتا یا ہر شخص پر فرض ہوتا کیونکہ جب حج کو دوام محبت و استحکام توجہ الی اللہ کے لئے مشروع کیا گیا ہے تو لازم آتا ہے کہ جن لوگوں نے حج نہیں کیا بس انکی محبت فنا ہو جائے گی دائم نہ رہے۔

جواب یہ ہے کہ جس طرح ان وسائط میں یہ دخل ہے کہ انکو دیکھ کر محبت قوی ہوتی ہے اسی طرح ان وسائط کے تذکرہ میں بھی یہ اثر ہے اور ان عشاق کو دیکھنے میں بھی یہ اثر ہے جو ان کی زیارت کو جاتے ہیں، چنانچہ ایک بڑے عارف فرماتے ہیں ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد ⁂ بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(عشق محض دیکھنے ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ دولت محبوب کے تذکرہ اور گفتگو سے حاصل ہوتی ہے) صاحبو! مشاہدہ کر لو کہ جب کوئی حج کو جاتا ہے تو اس کو دیکھ کر مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ دل پر ہر سال ایک نشتر سا لگتا ہے کہ ہائے ہم بھی جاتے اگر بیت اللہ کا وجود ہی نہ ہوتا تو یہ اثر کیوں کر ہوتا۔ پس بیت اللہ کی زیارت سے تو حجاج کی محبت قوی ہوتی ہے اور حجاج کو جاتے ہوئے دیکھ کر دوسروں کے دل پر جو نشتر لگتا ہے اس حسرت و شوق سے ان کی محبت قوی ہوتی ہے بس بیت اللہ کی وہ شان ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد ⁂ برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت

پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تروتازہ رکھتی ہے، صاحبو! حج کے تذکرہ میں بھی ایک تاثیر ہے جس سے دل امنڈ آتا ہے۔ یہ تو ان کا حال ہے جن کو حج نصیب نہیں ہوا اور جن کو ایک دفعہ نصیب ہو چکا ہے ان کا حال کچھ نہ پوچھو کہ ہر سال موسم حج میں ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

غائباں را چوں نوالہ مے دہند ؛ حاضراں از غائباں لاشک بہ اند

(غائبوں کو جب لقمہ دیتے ہیں تو حاضر غائبوں سے بیشک بہتر ہیں) واللہ اکثر لوگ کلیجہ مسوس کر رہ جاتے ہیں اور ہر دن یہ خیال ہوتا ہے کہ ہائے آج حاجی مکہ میں پہنچے ہوں گے، کل کو منیٰ جائیں گے۔ آج عرفات میں ہوں گے، اب عرفات سے لوٹ رہے ہوں گے۔ یہی ایک عبادت ایسی ہے کہ ایک بار کر کے دوبارہ اس کو جی چاہتا ہے جو لوگ حج کر چکے ہیں ان کے دل سے پوچھو کہ وہ بار بار حج کرنے کی کیسی تمنا کرتے ہیں۔

حج و شہادت میں باہمی مناسبت

پس حج کی مثال شہادت جیسی ہے شہید بھی جنت میں یہ تمنا کرے گا کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور خدا کے راستہ میں بار بار شہید ہوں بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل بھی بار بار شہادت کی تمنا فرماتے تھے چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

وَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ الحدیث۔

(میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہوں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں ۱۲) آخر آپ کے دل پر کچھ تو گزرتی ہو گی جو دل بار بار قتل کی تمنا فرماتے ہیں، یہی حال حج کا ہے کہ اس سے بھی دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ بیت اللہ میں کچھ خاصیت ہے کہ وہ دل کو کشش کرتا ہے، ملاحدہ یورپ بھی اس کشش کا انکار نہ کر سکے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل بھی کعبہ کی طرف کھنچتے ہوں گے، چنانچہ ایک انگریز محقق نے لکھا ہے کہ جس طرح مقناطیس میں حدید کی خاصیت ہے، اسی طرح حجر اسود میں جذب قلوب کی خاصیت ہے یہ لوگ برکت وغیرہ کے تو معتقد نہیں اسباب طبعیہ کے معتقد

ہیں اس لئے اس بیچارہ نے اپنے مذاق کے موافق حجر اسود کی کشش کو بھی اسباب طبعیہ میں داخل کر دیا۔ خیر کچھ ہی ہو اس کا اقرار تو ان کو بھی ہے کہ حجر اسود قلوب کو کشش کرتا ہے خواہ سبب کچھ ہی ہو۔ اب یہ اشکال جاتا رہا کہ جو لوگ حج کو نہیں گئے کیا ان کی محبت زائل ہو جائے گی جواب کا حاصل یہ ہوا کہ بیت اللہ کا نام سن کر ہی ان کے دل میں زیارت کا ولولہ اٹھتا ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ تمنا حج سے کوئی مسلمان غالباً خالی نہ ہوگا۔ تو یہ ولولہ بھی ان کی محبت باقی رکھنے کے لئے کافی ہے۔

پھر حجاج کو دیکھ کر یہ ولولہ اور تیز ہو جاتا ہے جس سے محبت کو ترقی ہوتی ہے اور جو لوگ ایک دفعہ حج کر چکے ہیں ان کی محبت باقی رکھنے کے لئے ایک ہی حج کافی ہے۔ دوبارہ فرضیت حج کی ضرورت نہیں کیونکہ بیت اللہ کی کشش کی وجہ سے ہمیشہ ان کے دل مشتاق زیارت رہتے ہیں اور ہر سال ان کے دل پر نشتر لگتا ہے یہی نشتر ان کی محبت بڑھانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور اگر دنیا میں بیت اللہ کا وجود نہ ہوتا اور کوئی اسکی زیارت کو نہ جاتا تو نہ حاضرین کی محبت بڑھتی نہ غائبین کی۔ اب اس کے وجود سے جانیوالوں اور نہ جانے والوں سب کی محبت قوی ہو رہی ہے (بشرطیکہ دل میں کچھ ایمان کا اثر ہو) اور جن کے دلوں پر محبت دنیا نے اتنا غلبہ کر لیا ہے کہ دین کا ان کو کچھ بھی خیال نہیں ان کا یہاں ذکر نہیں۔ گو کشش کعبہ سے ان کے قلوب بھی ضرور متاثر ہیں۔ مگر وہ اثر ایسا ہی ہے جیسے ملاحدۂ یورپ کے قلب پر اس کا اثر ہے اور ضعیف اثر محبت بڑھانے کے لئے کافی نہیں جامع ۱۲)

عاشق نوازی

بہر حال اس مجاہدہ کے بعد جو کہ اعمال رمضان میں ہو چکا ہے اب حق تعالیٰ آپ کو مشاہدہ کے لئے بلا رہے ہیں اور عشق کا مقتضا تو یہ تھا کہ مشاہدۂ محبوب کے لئے سب پر حاضر ہونا فرض کر دیا جاتا مگر حق تعالیٰ بڑے عاشق نواز ہیں۔ وہ اپنے عشاق کی راحت و آسائش کا بھی بہت لحاظ فرماتے ہیں۔ اس لئے حج سب پر فرض نہیں کیا بلکہ ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا

اور اللہ کے لئے لوگوں پر حج بیت اللہ واجب ہے اس پر جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔ اور طاقت سے یہ مراد نہیں کہ جوان ہٹا کٹا ہو محض جوان ہونے پر فرضیت حج کا مدار نہیں کیونکہ بعض جوان پیدل نہیں چل سکتے بلکہ استطاعت سبیل سے مراد زاد و راحلہ ہے یعنی جو سوار ہو کر آرام سے آ سکے اور آرام سے لوٹ سکے وہ آئے اور جو سواری پر نہ آ سکے اس کے ذمہ حج فرض نہیں۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی رعایت ہے کہ زاد و راحلہ کا خرچ حوائج اصلیہ ضروریہ سے زائد ہو اور مدت سفر تک یعنی جانے سے لوٹنے تک اپنے اہل وعیال کا خرچ بھی اس سے الگ دے سکے تب حج فرض ہوتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی رعایت ہے کہ راستہ میں امن ہو کوئی اس کو تنگ نہ کر سکے خطرہ کا یقین یا احتمال غالب نہ ہو باقی اوہام کا اعتبار نہیں جیسا بعض لوگ ذرا ذرا سی بات سُن کر حج ملتوی کر دیتے ہیں۔ سو خوب یاد رکھو کہ توہم خطرہ سے ساقط نہیں ہوتا ایسا کونسا سفر ہے جس میں خطرہ کا وہم بھی نہ ہو۔ یوں تو سہارنپور سے مظفر نگر تک بھی خطرہ ہے کہ شاید ریل لڑ جائے اور کبھی کبھی ایسے واقعات ہو بھی جاتے ہیں۔ مگر شاذ و نادر جن کا کوئی اعتبار نہیں کرتا، تو ایسے اوہام کا حج میں بھی اعتبار نہیں۔ بحمد اللہ آجکل حج میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہاں سفر مدینہؑ میں کچھ خطرات بعض دفعہ بڑھ جاتے ہیں۔ سو وہ سفر مستحب ہے مستحب کی وجہ سے فرض کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ غرض فرضیت حج میں امن طریق بھی شرط ہے۔ یہ اتنی رعائتیں اس لئے ہیں کہ ہمارا عشق ناتمام ہے اگر راستہ میں خرچ کے کم ہو جانے سے کوئی تکلیف پیش آئی یا کسی نے تنگ کر دیا تو رہا سہا عشق بھی جاتا رہے گا۔ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ روز ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ۔ ایک مسخرے نے سُن لیا اس نے یہ حرکت کی کہ ایک دن سویرے سے درخت پر

ؑ الحمد اللہ یہ خطرہ بھی عرصہ دراز سے بالکل ختم ہو گیا ضرور مدینہ منورہ حاضری دیں۔ وفاسلام اللھم وفقنا لما تحب وترضی ۱۲۔

رسی لے کر جا بیٹھا۔ جب اس نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ، تو اس نے آہستہ نرم آواز سے کہا کہ اے میرے بندے یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا۔ اور رسی میں پھانسی بنا کر لٹکا دی۔ یہ بڑا خوش ہوا کہ دعا قبول ہو گئی۔ بس آج میں اللہ میاں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مسخرہ نے تدبیر تو خدا تعالیٰ کے پاس پہنچانے ہی کی تھی۔ گلا گھٹ کر مر جاتا تو خدا تعالیٰ کے پاس ہی پہنچتا، اس نے خوشی خوشی رسی گلے میں ڈال لی۔ اس نے کھینچنا شروع کیا جب یہ زمین سے ایک دو بالشت بلند ہوا تو رسی گلے میں پھنسی اور گلا گھٹنے لگا تو تڑپ گیا اور کہنے لگا اے اللہ مجھے مت کھینچ میں نہیں کھنچتا۔ بس ذرا سی تکلیف میں سارا عشق ختم ہو گیا۔ یہی حال ہمارا ہے کہ محبت کے سارے دعوے اسی وقت تک ہیں جب تک آرام سے گذر رہی ہے اور جہاں تکلیف پہنچی بس عشق و محبت سب جاتا رہا۔ دوسرے ان رعایتوں میں یہ بھی نکتہ ہے کہ عاشق کامل و عاشق ناقص کا کمال و نقصان چھپا ہے اگر زاد و راحلہ کی قید نہ ہوتی تو ہمت والے جاتے اور کم ہمت نہ جاتے اس وقت یہ لوگ رسوا ہو جاتے کہ ان میں خدا تعالیٰ کی محبت نہیں ہے فرض کو ترک کر رہے ہیں، اور اب رسوا نہیں ہوتے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس زاد و راحلہ نہیں اس لئے نہیں گئے ہمارے ذمہ حج فرض ہی نہیں۔

میں نے ان احکام کی (یعنی شرط فرضیت حج کی) حکمت اس لئے بیان کر دی کہ یہاں ایک اشکال ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب حج تحریک عشق و تقویت محبت کے لئے مشروع ہوا ہے تو اس کے احکام سب عاشقانہ ہونے چاہئے اور عشق و محبت میں زاد و راحلہ اور امن طریق وغیرہ کی پرواہ نہیں ہوا کرتی عاشق کبھی یہ نہیں دیکھا کہ میرے پاس محبوب تک پہنچنے کے لئے خرچ بھی ہے یا نہیں، سواری بھی ہے یا نہیں راستہ مامون بھی ہے یا نہیں، اس کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ ایک بار مجنوں لیلے کے پاس جا رہا تھا اونٹنی پر سوار تھا اس اونٹنی کے ایک بچہ تھا جس کو وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی مجنوں اس کو آگے چلانا چاہتا وہ بچہ کی محبت میں پیچھے دیکھتی تھی، اس طرح راستہ بہت کم طے ہوتا تھا بھلا عاشق کو تاخیر کب گوارا ہے۔ مجنوں سے نہ رہا گیا کہنے لگا ؎

هَوَى نَاقَتِي خَلْفِي وَقُدَّامِي الْهَوٰى ۞ فَاِنِّي وَاِيَّاهَا لَمُخْتَلِفَانِ

(میری اونٹنی کا محبوب پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے میں اور وہ مطلوب میں مختلف ہیں)
یہ کہہ کر دھڑام سے اونٹنی کے اوپر سے گر پڑا اتنا بھی انتظار نہ کیا کہ اسے ٹھہرا کر بٹھلا
کر اترتا۔ جب گرا تو پیر میں چوٹ بھی لگی اب پیدل بھی نہ چل سکا تو گھسٹنا شروع کیا اور
گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ عشق کا تو یہ تقاضا ہے پھر شریعت نے سفر حج کے لئے جو کہ عاشقانہ
سفر ہے زاد و راحلہ و امن طریق وغیرہ کی قیود کیوں لگائیں؟

جواب میری تقریر سے ظاہر ہے کہ قیود میں ہمارے عشق ناتمام کی رعایت ہے۔
کہیں تکالیف سے رہا سہا عشق بھی زائل نہ ہو جائے۔ ہاں جو لوگ مجنوں کی طرح عاشق
کامل ہوں ان کے لئے کچھ قید نہیں ان کو پیدل حج کرنا بھی جائز ہے اور کھانے پینے کا
خرچ بھی ساتھ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسا شخص متوکل بھی ہوگا اور کسی سے سوال بھی
نہ کرے گا۔

پیدل سفر حج

بعض خشک مولوی ان لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ پیدل سفر
کرنا اور نفس کو مشقت میں ڈالنا جائز نہیں مگر ان لوگوں نے قرآن
کی یہ آیت نہیں پڑھی،

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ
ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ط

ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دو تو وہ آپ کے پاس
پیدل چل کر آئیں گے، اور دُبلی اونٹیوں پر بھی سوار ہو کر آئیں گے۔
اس میں بتلا دیا گیا کہ بعضے عشاق پیدل بھی حج کو جائیں گے۔ اگر پیدل سفر کرنا
مطلقاً ممنوع ہوتا تو قرآن میں رجالاً کا بلا نکیر ذکر نہ ہوتا اور ذکر بھی کیسا کہ پیدل آنے
والوں کو سواروں سے پہلے ذکر فرمایا۔
اور بات یہ ہے کہ نفس کو مشقت میں ڈالنا بیشک ممنوع ہے لیکن اگر کسی کو اس
میں مشقت ہی نہ ہو بلکہ لذت آوے تو پیادہ چلنا اس کے لئے القاء نفس فی التہلکہ (نفس
کو ہلاکت میں ڈالنا) کہاں رہا۔ خوب سمجھ لو۔ غرض حج کی حقیقت مشاہدہ ہے اور اس بناء

پر لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے) میں حج کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اس آیت کے تحت میں حج کا بھی بیان کر دیا۔

اور یہ حقیقت بزرگوں کے کلام سے سمجھ میں آئی ہے میں اس کو مدلول نص قرار نہیں دیتا اگر کوئی اس کا انکار کرے تو گناہ نہ ہوگا۔ ہاں ایک طرح گناہ بھی ہوگا کہ جن کے قلوب پر یہ واردات ہوئے ہیں ان پر انکار کرنے لگے وارد کے انکار کا تو آپ کو حق ہے مگر صاحب وارد پر انکار کا کسی کو حق نہیں۔

بحمد اللہ بقدر ضرورت اس آیت کا بیان اپنے علم کے موافق مکمل ہو گیا۔ باقی عجائب قرآن کا احاطہ کون کر سکتا ہے اس کی تو شان ہے لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ (نہیں ختم ہوتے قرآن کے عجائبات) اس سے پہلے چار بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا حاصل مجاہدہ ہے اور اس بیان کا مجاہدہ مشاہدہ ہے۔ مجاہدہ کے بعد مشاہدہ ہی ہوا کرتا ہے اس لئے اس کو چاروں سے خاص مناسبت ہے۔ اگر کوئی لغزش ہوتی ہو تو حق تعالیٰ معاف فرماویں اصل مقصود یہ ہے کہ محبت بڑھانے کی کوشش کرنا چاہیے جس کا بڑا ذریعہ حج بھی ہے جس کا زمانہ شروع ہو گیا ہے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جن پر حج فرض ہو وہ جلدی کریں۔ بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت کاملہ عطا فرمائے اور اعمال صالحہ کی توفیق ہو۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وعلی آلہٖ واصحابہ اجمعین ۔

مبادیاتِ حدیث

:- علیٰ نہج مقدمۃ مشکوٰۃ المصابیح :-

تالیف :- حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہٗ العالی

ترتیب و اضافہ :- مولانا مفتی محمود الحسن بارڈولی۔

علمِ حدیث کے طلباء کے لئے ایک مشعلِ راہ جسمیں مقدمہ مشکوٰۃ کی واضح تشریح، حدیث شریف کے متعلق جملہ مبادیات اور ضروری مباحث، نیز محدثینِ عظام کے حالات بھی خوبصورت اور دلکش انداز میں تحریر کئے گئے ہیں۔

علمِ حدیث کے طلبہ کے لئے یہ ایک بیش بہا خزانہ اور ایک نادر شاہکار ہے۔ بلکہ علمِ حدیث کے طلبہ کیلئے یہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس لئے آج ہی ایک خط لکھکر ہم سے بذریعہ ڈاک حاصل کریں، اور اپنی علمی لائبریری کے وقار میں اضافہ کریں۔

التہذیب ۶

(اسرارِ حج)

حضرت حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲ رشوال المکرم ۱۳۳۲ھ کو جمعہ کے روز بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد دو سو تھی۔

محترم جناب مولوی عبد الحلیم صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اسکو سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب محسوس کرتا ہے۔ اور جو وہاں گئے ہیں اُن سے پوچھو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ اور بالاضطرار آنسوؤں کا مینہ برسنے لگتا ہے۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے۔ ورنہ ایک تعمیر میں رولانے کا اثر کیا معنی ؟

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے پردۂ زنگاری میں

(از حضرت حکیم الامت رح)

وعظ التہذیب نمبر ۶

یعنی

اسرارِ حج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰینا محمداً عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝

تمہید چند سال سے میرا معمول ہے اور ترتیب کا بھی یہی مقتضا ہے کہ بعد گذر جانے رمضان المبارک کے حج کے متعلق بیان کیا کرتا ہوں اور نیز اشہر حج شوال سے شروع بھی ہوتے ہیں اسلئے کہ اشہر حج شوال ذو القعدہ ذو الحجہ ہیں۔

ہر چند کہ شوال اور ذو القعدہ پورے پورے اور ذی الحجہ کا ایک معتد بہ حصہ یہ اتنی مدت ہے کہ فی نفسہٖ ضروری نہیں تھا کہ شروع شوال ہی میں

اس کو بیان کیا جائے اس مدت کے اندر، اندر جب چاہے بیان کر دیا جاتا۔ لیکن چونکہ ہم لوگ مکہ معظمہ اور عرفات سے مسافت بعیدہ پر ہیں تو اگر بیان کو موخر کیا جائے گا۔ تو جن لوگوں کا بیان سن کر جانے کا خیال ہوگا وہ نہیں جا سکتے اسلئے معمول یہی ہے کہ شروع شوال میں بیان کر دیا کرتا ہوں۔

اس مرتبہ بعض روایات سے معلوم ہوا تھا کہ راستہ کے خطرناک ہونے کی وجہ سے پہنچنے میں شبہ ہے اور بعض روایتوں سے امن معلوم ہوا لیکن اکثر روایات سے شبہ قوی ہوتا چلا گیا۔ اسلئے ارادہ تھا کہ اس بیان کو ملتوی کر دوں لیکن غور کرنے کے بعد مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ بیان کیا جائے اسلئے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ ہم کو شبہ ہو تو سب کو ہی ہو اور اگر ہو بھی تو تحقیق کر لیں گے۔ اور اگر نہ بھی تحقیق کریں یا تحقیق کے بعد بھی شبہ رہے تو کم از کم احکام سے تو فی نفسہا اطلاع ہو جائیگی۔ جو شخص شرائط کے اعتبار سے ضروری سمجھے گا وہ ارادہ کریگا ورنہ فی نفسہ حج ایک رکن اسلام ہے اس کے آثار و خواص کا علم ہی ہو جائیگا اور نیز اس عبادت کی عظمت ذہن میں آ جائیگی۔ یہ بھی بڑا فائدہ ہوا۔ ان وجوہ سے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ذکر ترک نہ کروں۔ اسلئے میں نے یہ آیت پڑھی ہے میں اسوقت حج کی فرضیت اور فرعی مسائل بیان نہ کروں گا۔ اسلئے کہ فرض ہونے کو تو سب جانتے ہیں اور مسائل اس کے اردو کے رسائل میں موجود ہیں اور نیز اسوقت ان کا بیان کرنا بھی زیادہ مفید نہیں اسلئے کہ حج کے مسائل یاد ہی نہیں رہتے۔ میں اس کے متعلق بھی ایسے ہی مضامین بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے روزہ اور تراویح وغیرہ کے متعلق بیان کئے ہیں یعنی لطائف اور اسرار اور روح اور جوہر اس عبادت کا بیان کرونگا۔ اس سے اعتقاد فرضیت بھی بوجہ احسن موکد ہوگا اور نیز اس کی عظمت اور وقعت بھی پیدا ہو گی۔ اسلئے زیادہ مہتم بالشان اسی کا ذکر کرنا ہے اور وہ مضمون مخترع نہ ہوگا۔ بلکہ صیام و قیام کے مضامین کی طرح ان شاء اللہ تعالٰی نصوص سے تائید ہوتی چلی جائیگی۔

نوعیتِ مضمون میں نے جو آیت تلاوت کی ہے وہ اس مضمون کے استنباط کے لیے کافی وافی ہے لیکن کچھ مقدمات صحیحہ اسمیں منضم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اب میں اس مضمون کی نوعیت کی تعیین کرتا ہوں اور ہر چند کہ اس تعیین کی ضرورت نہ تھی۔ اسلیئے کہ جو مضامین صیام وقیام سے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔ ان کا یاد کر لینا کافی ہے۔

چنانچہ میں نے روزہ تراویح اور اس کی تقریب سے اعتکاف کے متعلق بیان کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان مجاہدات کی تکمیل اعتکاف سے ہوتی ہے یعنی اعتکاف کو بھی مجاہدہ میں داخل کیا گیا تھا یہ حاصل تھا ان مضامین کا یہی نوعیت حج کے متعلق بھی ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالٰے نے اپنے بندوں پر بڑی رحمت فرمائی ہے کہ ان کو تطہیر قلب و تزکیۂ نفس کے لیے ایسے طریقے تعلیم فرماتے ہیں کہ فلسفی اور کسی مرتاض اور کسی اشراقی کو وہاں تک رسائی ہونا کیا معنی اسکی ہوا تک بھی نہیں پہنچی یہ بجز وحی کے کسی واسطہ سے معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان مجاہدات کی تفصیل میں غور کرنے سے یہ امر بیّن طور سے واضح ہے یہاں تک بیان تھا اس مضمون کی نوعیت کے متعلق۔

مقصود بیان اب آگے مقصود شروع کیا جاتا ہے ہر چند کہ خصوصیت کا مقتضٰی یہ ہے کہ حج کا ذکر اسوقت کیا جائے تو قربانی کا ذکر عید الاضحٰے میں ہو لیکن جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا تعلق جیسا حج سے ہے۔ ایسا ہی قربانی سے بھی ہے اور نیز قربانی حج کامل کے بعض اقسام کا جزو بھی ہے۔

اور کامل کی قید میں نے اسلیئے لگائی ہے کہ قربانی نفس حج کا جزو نہیں ہے نفس حج تو وقوف عرفات اور طواف زیارت سے ادا ہو جاتا ہے ہاں کمال اس کا قربانی سے ہے۔

پس جبکہ قربانی بھی اس کا جزو ہے گو کسی درجہ ہو۔ جیسا ابھی مذکور ہوا کہ حج کا جزو ہے اور اسمیں قران و تمتع کا۔ عہ

تو یہ نامناسب ہے کہ حج کے متعلق تو بیان ہو اور اس کے ایک بڑے جزو کا بیان ترک کر دیا جائے اس سے حج کا بیان بھی ناتمام رہے گا اسلیئے کہ حج تمام ایک افعال کے مجموعہ کا ہے جسمیں بعض احوال میں قربانی بھی داخل ہے اور نیز ایام عید الاضحیٰ میں قربانی کے احکام بیان کرنے کی ضرورت ہوگی اور اسوقت احکام نہ بیان کیے جائیں گے۔ بلکہ قربانی کی روح اور حقیقت اور اسکا بیان ہوگا۔ اسلیئے ایام ذی الحجہ کا انتظار نہیں کیا گیا اور اسی طرح حج کا بیان بھی احکام تفصیلہ کے بیان سے نہ ہوگا۔ جیسا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے اسلیئے کہ وہ احکام یاد نہیں رہتے اور نیز خود بیان کرنے والوں کو یاد نہیں جیسے ایک طوطے کو کسی نے اَلَمْ تَرَ کَیْفَ تک سورتیں یاد کرادی تھیں۔ جب اس سے کوئی پڑھواتا تھا۔ تو وہ فرفر پڑھ دیا کرتا تھا۔ اور جب کہتے کہ آگے پڑھو تو وہ کہتا تھا کہ آگے تو میاں کو بھی یاد نہیں۔

عجیب دربار

اسی طرح احکام حج کے تو مجھے بھی یاد نہیں بیان تو کیا کروں گا اور اگر کسی کو یاد بھی ہوں تب بھی وہاں جاکر نئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سب پڑھا لکھا بھول جاتا ہے۔ شعر

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب راوی ہیں کہ بہت بڑے عالم مکہ معظمہ حج کے لیے آئے جب مطوف معلم طواف کرانے کے لیے ان کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم کو معلم کی ضرورت نہیں ہم خود واقف ہیں۔ معلم الگ ہوگئے۔ جب حرم شریف میں پہنچے تو باب

عہ حدیث شریف میں بھی وارد ہے الحج العج الثج اس سے بھی قربانی کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوتا ہے ۱۲ جامع۔

باب السلام سے داخل ہوتے ہیں اور باب السلام دو ہیں ایک احاطہ میں اور ایک بالکل اندر باہر کے باب السلام میں تو انہوں نے غلطی نہیں کی۔ لیکن جب اندر پہنچے تو اندر کے باب السلام سے داخل نہ ہوئے۔ ایک بچہ نے اسی وقت بتلا دیا یا شیخ ادخل من ھٰنا اے شیخ ادھر سے داخل ہوجیئے جب آگے طواف کے لیے پہنچے تو حکم یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دیکر داہنی طرف جسطرف خانہ کعبہ کا دروازہ ہے چلنا چاہیئے وہ بائیں طرف کو چلے اسی وقت لڑکے نے بتلا دیا اور کہا اخطأت یا شیخ امش من ھٰنا یعنی اے شیخ آپ نے خطا کی اس طرف سے چلیئے۔ جب بار بار ان سے غلطی ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے میرا تکبر توڑا ہے واقعی یہاں بغیر معلم کے کام نہیں چلتا۔ اسوقت انہوں نے معلم کو بلایا وہ عجیب دربار ہے وہاں اچھے اچھے عقلاء بھی بے عقل ہوجاتے ہیں اور وجہ اسکی یہ ہے کہ وہاں جا کر ایک حیرت[عہ] اور کیفیت طاری ہوتی ہے کہ جس سے عقل ایک طرف رہ جاتی ہے اسلیئے میں احکام بیان نہ کروں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حج اور قربانی دو مضمون ہوں گے پہلے مواعظ میں نماز اور روزہ کے متعلق بیان تھا۔ دو عبادتوں کا آج ہوگا۔ ارکان اسلام کے کل پانچ ہی ہیں۔ تلفظ شہادتین جس کا بیان محتاج بیان نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جسمیں سے بجز زکوٰۃ کے سب کا بیان ہوجائے گا۔ لیکن طبعاً زکوٰۃ کا بیان بھی آجائیگا۔

اقسام مجاہدہ

قبل اس کے کہ حج کے متعلق کچھ بیان کیا جائے مواعظ سابقہ کے حاصل کو سمجھنا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے تطہیر قلب و تزکیہ نفس کے واسطے کچھ مجاہدات اپنے بندوں کو تعلیم فرمائے ہیں

عہ یہ حیرت کم و بیش ہر مسلمان کو طاری ہوتی ہے اور اگر کسی کو نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ اس کا سبب قساوت قلب اور غفلت ہے جیسے قرآن اور نماز سے بعضے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن اس سے محزون نہ ہو بلکہ علاج میں مشغول ہو ۱۲ جامع۔

اور ان مجاہدوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً ایک مجاہدہ روزہ ہے ایک نماز ہے ایک زکوٰۃ منجملہ ان مجاہدات کے حج اور قربانی بھی ہے مواعظ سابقہ میں روزہ نماز کے متعلق بیان ہو چکا ہے۔ پس اگر ایام حج بھی اسوقت نہ ہوتے۔ تب بھی چونکہ بعض مجاہدات کا بیان ہو چکا ہے تو مجاہدہ ہونے کے اعتبار سے حج کا بیان بھی ضروری تھا یہ حسن اقتران ہے کہ ایام بھی اس عبادت کے ہی ہیں۔

ان اقسام مختلفہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل دو رنگ یا دو نوع کے مجاہدے ہیں ایک وہ مجاہدہ ہے جس میں عقلیت کی شان غالب ہو اور ایک وہ ہے جسمیں ادراک بالعقل غالب نہ ہو بلکہ اسمیں طبیعت اور تعبدیت غالب ہو۔

اور راز اس تنویع میں یہ ہے کہ مجاہدہ کا حاصل منازعات نفس کا مغلوب کرنا ہے یعنی جو طاعت میں کشاکشی کریں۔ انکو مغلوب کر دینا اور دبا دینا مقصود ہے اور وہ منازعات مختلف قسم کے ہیں۔ کوئی مجاہدہ کسی منازعت کے مغلوب کرنے کے لیے ہے اور کوئی کسی منازعت کے دبانے کے لیے۔ چنانچہ نماز سے جاہ کو دبانا مقصود ہے۔ اور قوت بہیمیہ کا انکسار روزہ سے مطلوب ہے۔ غرض مجاہدہ کی حقیقت منازعات کو مغلوب کرنا ہے

مانع حق عقل

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ منازعت کرنیوالی کیا کیا چیز ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منازعت کرنیوالی آدمی کے اندر دو شے ہیں عقل اور طبیعت یہی دو چیزیں انسان کو حق سے روکتی ہیں۔ چنانچہ حکماء کو جس شے نے اتباع حق سے روکا۔ اور انبیاء کا اتباع نہیں کرنے دیا وہ عقل ہی ہے اسلئے کہ طبیعت کے اقتضاءات کا تو انہوں نے بخوبی علاج کر لیا تھا۔ چنانچہ اخلاق ان کے مہذب تھے نفس کا تزکیہ بالکلیہ کر لیا تھا۔ بڑے بڑے مجاہدات سے وہ شائستہ ہو گئے تھے اسلیے طبعی منازع تو ان میں بالکل نہ تھے صرف عقل ان کی اتباع سے مزاحم ہوتی تھی چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسکی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں فرحوا بما عندھم من العلم یعنی اپنے علم پر اترا گئے اپنے علوم کے سامنے انبیاء کے علوم کو پست

سمجھتے تھے جیسے مدعیان عقل قرآن شریف پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ قرآن میں تو معمولی مضمون ہیں۔ کہیں مچھر کا ذکر ہے کہیں مکھی کا۔ اللہ میاں کا کلام اور ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اللہ تعالےٰ نے جیسے عظیم الشان ہیں۔ ایسی ہی چیزوں کا ذکر ہونا چاہیئے اور احمق یہ نہ سمجھے کہ مچھر اور مکھی کا ذکر قرآن مجید میں بطور تمثیل کے ہے اور تمثیل کے اندر یہ ضروری ہے کہ ممثل لہ جس درجہ کا ہو مثال بھی اسی درجہ کی ہوتی ہے چنانچہ بتوں کی کمزوری دکھلانے کے لیے ان کو مکھی سے تشبیہ دی ہے چنانچہ ارشاد ہے وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ۔ اور اللہ تعالےٰ کے سوا دوسرے کو اللہ ماننے کو مکڑی کے جالے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اگر مشبہ اور مشبہ بہ میں تناسب کی رعایت نہ ہو تو جو تشبیہ سے غرض ہے وہ فوت ہو جاوے گی۔ پس پابندان خیال محققین کے کلام کو ہمیشہ بوجہ اپنی کم فہمی کے پست اور معمولی بتلاتے چلے آئے ہیں اسی طرح انبیا علیہم السلام کو اور ان کی کلام کو معمولی بات کہتے چلے آئے ہیں۔

علوم انبیا علیہم السلام

اور راز اسمیں یہ ہے کہ انبیاء اور محققین کو اصل میں نفع رسانی مقصود رہی ہے اور نافع مضمون کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے عوام سے لیکر خواص تک نفع حاصل کریں اور ایسے مضامین عجیب و غریب نہیں ہوتے۔ بلکہ سننے سے معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو اسوقت ان کا نفع معلوم ہوتا ہے اور جس قدر ان میں غور کیا جاتا ہے اسی قدر زیادہ باریکیاں اسمیں نکلتی ہیں اور حقائق دقائق اور مضامین غامضہ سے چونکہ کوئی نفع نہیں اسلئے انبیاء اور ان کے جانشین، ایسے مضامین بیان نہیں فرماتے نہ اس وجہ سے کہ ان کو معلوم نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ فہم عوام سے باہر ہیں اور نیز کوئی نفع بھی نہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیئے کہ حکیم محمود خاں کی دو تام میں دو شانیں ہیں ایک تو جسوقت وہ طالب علموں کو پڑھاویں اور ایک جسوقت نسخہ لکھیں تو اگر کوئی شخص مطب میں ان کو دیکھ کر کہے کہ میں نے تو سنا تھا

کہ حکیم محمود خان صاحب طب کے بڑے عالم ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ سو نعف اگر یہ
کوئی بتلادے تو وہ شخص احمق ہے اس کو یہ عقل نہیں کہ جو لوگ اُن کے پاس اس وقت
جمع ہیں یہ مریض ہیں ان کے لیے یہی مناسب ہے۔ اگر اس کو طب کی تحقیقات
سننے کا شوق ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ اسوقت کا انتظار کرے جب کہ وہ طالب
علموں کو نفیسی اور قانون کا سبق پڑھاتے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کے دو موقع ہیں۔ ایک تو جبکہ عوام سے خطاب کرتے ہیں
ایک وہ جبکہ خواص ان کے مخاطب ہوتے ہیں۔ خواص کو جو خطابات ہوتے
ہیں ان کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضور صلے اللہ
علیہ وسلم کو خطاب الٓمٓ حٰمٓ عٓسٓقٓ کٓھٰیٰعٓصٓ۔ اب ان حروف کے معانی بجز
حضورؐ کے کوئی نہیں سمجھا کسی شخص نے کسی بزرگ سے معراج کے متعلق پوچھا تھا
کہ وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں اس کا کیا خوب جواب دیا ہے۔ ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ۔ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد
میاں عاشق و معشوق رمزیست ۔ کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

خود ملائکہ حامل وحی کو بھی خبر ہونا ثابت نہیں کہ ان لفظوں کے کیا معنی ہیں
ایک مرتبہ کانپور میں۔ میں یہی تقریر کر رہا تھا۔ ایک کورٹ انسپکٹر بھی
موجود تھے۔ ان کو اس سے بڑا حظ ہوا اور کہنے لگے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔
اور انہوں نے حکایت بیان کی کہ میں اناؤ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بیٹھا
تھا۔ ان کے پاس ایک کتاب رکھی تھی۔ میں اٹھا کر دیکھنے لگا کہنے لگے کہ تمہارے
کام کی نہیں تم نہیں سمجھو گے۔ یہ خاص اصطلاحیں خفیہ پولیس کی ہیں جن کو وہ باہم
سمجھتے ہیں لیکن تشریع عام سب کو بتلائی گئی ہے یہ ایسے خطابات ہیں کہ سوائے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرا نہیں سمجھتا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ کی برکت سے بعض خواص اولیاء اللہ کا فہم بھی ان کے
کسی حصہ تک پہنچا ہو۔ چنانچہ شیخ اکبر نے اوائل سورۂ روم سے فتح صورت کے

حالات مع قید وسن و مع قید ناموں کے سمجھ کر لکھ دیئے ہیں۔ لیکن زبان ایسی اختیار کی ہے کہ ہر کوئی ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھ سکتا اور کسی شخص نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ مگر ان بھلے مانس نے بھی ایسے طور سے لکھا ہے کہ ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس پر بھی بہت قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی سمجھ جائے تو کسی سے ظاہر نہ کرے۔

غرض انبیاء اور اولیاء کے سینوں میں وہ علوم غامضہ ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان احمقوں نے اس پر نظر تو نہیں کی نظر اس پر کی کہ عوام سے جو ان کے خطابات ہیں وہ معمولی ہیں حالانکہ یہ خطابات بھی ان کے نہایت علو درجہ پر دال ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہیں ایک تو شرح ملا تک پڑھا ہوا ہے تو وہ اگر میزان الصرف پڑھائے تو اس قدر عجیب نہیں اور ایک دوسرا شخص جو علم کے اندر ایک بحر ذخار ہے وہ اگر میزان پڑھائے اور آسان کر کے پڑھاوے تو اس کا کمال ہے اسلئے کہ میزان کے ہر صفحہ پر جو اس کی نظر پڑے گی۔ تو ہر ہر جملہ پہ اسکو علم کا بے انتہا خزانہ نظر آئیگا اور بڑے بڑے مضامین اس کے سامنے آئیں گے اور وہ ان کو اپنے درجہ سے تنزل کر کے نہایت سہل عنوان سے بیان کریگا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام مضامین عالیہ کو نہایت سہل عنوان سے بیان فرماتے ہیں۔ شاعر کا بڑا کمال یہ ہے کہ شعر سہل ٹھیٹھ زبان میں کہے اور پھر مضمون اچھا ہو۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کی قدرت جیسی بڑے حسین کو پیدا کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اس سے بڑھ کر بدصورت کے پیدا کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ کامل خوشنویس اگر بگاڑ کر ایسا لکھدے کہ بدخط معلوم ہو یہ اس کا کمال سمجھا جائے گا۔ پس صنائع اور بدائع سے جیسے حضرت حق کا کمال ظاہر ہوتا ہے ناقص کو دیکھ کر اس سے زیادہ استدلال ہوتا ہے بڑا فصیح و بلیغ اگر دیہات کی زبان میں گفتگو کرے تو یہ اسکا نہایت کمال ہے حضرت

گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گنواروں کے ساتھ گاؤں کی زبان میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے آدمی بچوں کے ساتھ بچوں کی سی بولی بولا کرتے اور اگر مخاطب کے رتبہ کے موافق نہ بولیں تو ایسے خطاب سے کچھ فائدہ نہیں۔

جیسے لکھنؤ میں ایک مولوی صاحب تعلقہ دار تھے گاؤں کے کاشتکار ان کے پاس آئے تو آپ اُن سے پوچھتے ہیں امسال آپ کے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں۔ تو وہ چودھری آپس میں ایکدوسرے کو کہنے لگے کہ بھائیو! ٹھہر کر آئیو ابھی تو میاں قرآن پڑھ رہے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو بہت مبتذل لغت بولے ہیں۔ پس اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے مقام رفیع پر رہ کر گفتگو کریں تو ایک حرف بھی کسی کی سمجھ میں نہ آوے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقام تو بہت عالی ہے۔ اولیاء امت میں ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جب اپنے مقام پر رہ کر کلام کیا ہے تو ان کے ہمعصروں کو سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر حال غالب تھا۔ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے حال پر غالب تھے اسی واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کا حال اپنے رتبہ کے موافق کلام کراتا تھا۔ ایک مرتبہ رامپور میں آئے اور تقریر فرمائی جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کسی عامی نے کہا کہ ہم تو سمجھے نہیں ایک بزرگ نے جواب دیا کہ افسوس ایک شہباز عرش کا کہ جس کا پرواز عرش پر ہے۔ اس سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اُتر کر چلے۔ مولانا حال رفیع رکھتے تھے۔ اور ایک امتی تھے اس سے سمجھ لیجئے کہ اگر انبیاء اپنے مقام رفیع سے کلام فرماتے تو کون سمجھتا۔

کلام خداوندی

اور اس سے آگے اور نظر کو وسعت دیجئے کہ اگر خدا تعالیٰ ہماری طاقت فہم سے بالاتر کلام فرماتے تو کیا ہوتا۔ وہ کلام کیا ہوتا ایک تجلی خاص ہوتی کہ اس کے ظہور ہوتے ہی ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا۔

؎ چوں سلطان عزت علم درکشد ٭ جہاں سر بجیب عدم درکشد۔

یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اپنے کلام کو الفاظ حادثہ کا لباس پہنا کر متجلی فرمایا ہے

اگر کلام قدیم اپنی قدم کی حالت سے متجلی ہوتا تو نہیں ہوتا نہ تم ہوتے ۔ پس یہ رحمت ہے کہ یہ کلام الفاظ حادثہ کی صورت میں نازل ہوا ہے ۔ لیکن الفاظ ہی تک نہ رہنا چاہیئے کسی نے خوب لکھا ہے ؎

البحر بحر علی ما کان فی قدم ؛ ان الحوادث امواج وانھار
لا یحجبنک اشکال تشاکلھا ؛ عمن یشکل فیھا فھی استار

یعنی الفاظ ہی کی طرف نظر نہ رکھنا چاہیئے الفاظ بمنزلہ قشر ظاہر کے ہے اور صفت کلام جو قدیم ہے جس کی یہ صورت ہے وہ بمنزلہ مغز اور لُب کے ہے اور ان الفاظ کے مدلولات بمنزلہ قشر باطن کے ہے گویا یہ مدلولات صفت قدیم اور ان الفاظ حادثہ کے درمیان ایک برزخ ہے کہ جس کے اندر قدم اور حدوث دونوں شان ہے مختلف درجات میں یعنی اس مدلول کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو کلام نفسی کا مدلول کہا جاسکے وہ مثل دال کے قدیم ہے اور دوسرا درجہ جس کو کلام لفظی کا مدلول کہا جاسکے وہ مثل اپنے دال کے حادث ہے ان میں معانی کا مشاہدہ کرنا چاہیئے ۔ اور گویہ وہ مرتبہ ہے جس کو عرفی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق کیا ہے جناب وہ کہتا ہے ؎

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل ۔ ؛ سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

پس یہ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تو ثابت کرنا خلاف واقع کے ہے اور صحیح نہیں ہے ہاں البتہ مدلول کلام الٰہی کی یہی شان ہے مولانا شہیدؒ نے عرفی کے اس شعر پہ رد فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کا جسد عنصری حادث ہے اس کے قدم کا تو کوئی قائل ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہاں نور کے اندر کلام ہو سکتا ہے سو وہ بھی حدیث اول خلق اللہ نوری سے حادث ہے اس لیئے کہ خلق ایک فعل ہے اور خلق کا تعلق نور سے ہوا ہے تو خلق خود حادث ہے اور نور اس کا اثر ہے وہ ضرور اس سے متاخر ہوگا ۔ اور بدرجہ اولیٰ حادث ہوگا ۔

حقیقتِ محمدیہ:۔ اس مقام پر ایک اور بات بھی سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بعضوں کو صوفیہ کی ایک اصلاح سے دھوکا ہو گیا ہے کہ حضورؐ کے اندر شان قدم کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت محمدیہ قدیم ہے اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اندر شان قدم کی ہے حالانکہ یہ ان کی ایک اصطلاح ہے حقیقت محمدیہ سے مراد وہ علم الٰہی کا ایک مرتبہ لیتے ہیں اور اس کو حضورؐ کی طرف اسلئے نسبت کرتے ہیں کہ یہ شان الٰہی حضورؐ کی مربی ہے اور حضورؐ اس شان الٰہی کے مظہر ہیں۔ حقیقت تو اس کو اسلئے کہتے ہیں کہ وہ ایک امر باطن ہے اور حضورؐ چونکہ اس شان سے فیضیاب ہوتے ہیں اسلئے اس کو آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

منشا دھوکہ کا یہ ہوا کہ حقیقت کے معنی وہ لے لیے جو منطقیوں نے لیے ہیں حالانکہ ان کی مراد یہ معنی نہیں معقول کی جدا اصطلاح ہے اور تصوف کی علیحدہ اس التباس کی وجہ سے یہ سمجھ گئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدیم ہیں۔ یاد رکھو کہ حضورؐ بجمیع اجزائہ شریفہ حادث ہیں۔ پس عرفی کا یہ شعر قرآن شریف کے بارہ میں تو بہت مناسب ہے۔

تجلی کلامی الحاصل اگر کلام الٰہی کو یہ لباس حدوث کا نہ پہنایا جاتا تو یہ حالت ہوتی۔ لو انزلنا ھذا القراٰن علی جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ ۔ یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو اس کو اللہ کے خوف سے دب جانے والا اور پھٹ جانے والا دیکھتا۔ کوہ طور پر ایک ہی تجلی تو ہوئی تھی جس نے اسکو ریزہ ریزہ کر دیا تھا موسیٰ علیہ السلام نے اول رویت کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی ۔ یعنی تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر جما رہا تو تم مجھ کو دیکھ لوگے فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا وخر موسیٰ صعقا یعنی رب موسیٰؑ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور بیہوش ہو کر گر گئے۔ بس یہی حال تجلی کلامی کا بھی ہوتا کہ

کسی کو اس کی تاب نہ ہوتی۔ حدیث شریف میں ہے لو کشف سبحات وجہہ لاحرق ما انتہی الیہ بصرہ۔ پس غایت رحمت ہے کہ اپنے کلام کو ایسی صورت سے اس عالم میں اتارا کہ ہمارے قلوب اس کے متحمل ہو گئے تو لازم تو یہ تھا کہ اس کا احسان مانیں نہ کہ الٹا اعتراض کریں۔ غرض انبیاء اور اولیاء اللہ کا کلام تنزل کے بعد بھی نہایت رفیع الشان ہوتا ہے وہ کلام سہل ممتنع ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایسی رعایت اور پہلو ہوتے ہیں کہ نہایت مفید اور نہایت مفید ہونے کے ساتھ نہایت عالی کہ ارسطو اور افلاطون اور مشائین اور اشراقیین بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس اس پر اعتراض کرنا نری حماقت ہے اور عقل پرستی نہیں بلکہ وہم پرستی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان عقلاء کی عقل نے راہ ماری ہے اور فرحوا بما عندہم کے پورے مصداق ہیں۔

مانع حق طبیعت

دوسری شے حق سے روکنے والی طبیعت ہے طبیعت کا مقتضٰی یہ ہے کہ تمام شہوات اور لذات سے تمتع حاصل ہو اور سب پر غالب ہو کر رہوں سب میرے ماتحت ہوں بعضوں کو تو اس تسخیر کا یہاں تک خبط ہوتا ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر چاہتے ہیں کہ جنات بھی ہمارے تابع ہو جائیں میرے پاس بہت خطوط آتے ہیں کہ کوئی عمل تسخیر کا بتلا دیجئے۔ بھی ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں تسخیر جن کا خبط ہوا تھا۔ میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا تھا کہ حضرت کوئی عمل تسخیر جن کا بتلا دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں ایسے عمل ہیں مگر یہ تو بتلاؤ کہ کیا حق تعالیٰ نے تم کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ تم خدا بنو تم کو حق تعالیٰ نے بندہ بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ بندہ بنو ؎

زخاک آفریدت خداوند پاک ⁂ پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ پر چند حرفوں کی تہمت لگ گئی ہے ورنہ اپنے کو ایسا مٹاتا کہ کوئی نام بھی نہ جانتا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانہ بھون تشریف لائے تھے وعظ بھی فرمایا تھا مجھ کو یاد ہے کہ حضرت چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے اور انگرکھے کے بند اور گھنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اللہ اکبر

اس قدر مٹایا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا تھا۔ سنا تھا کہ مولانا محمد مظہر صاحبؒ کے پاس نائی خط بنانے آیا حضرت اسوقت چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے نائی کو حکم ہوا کہ سرہانے بیٹھ جا۔ اس نے کہا حضور میری کیا مجال ہے تیزی سے کہا ارے بیٹھ بھی۔ ان حضرات نے اپنے آپ کو کیسا مٹایا تھا۔ مگر اس مٹانے کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی اور شان بھی تھی وہ یہ جانتے تھے کہ چھوٹوں کے سامنے تواضع کرنے سے اُن کو تکلیف ہوتی ہے اسلئے وہ زیادہ تواضع نہ فرماتے تھے۔ شاگردوں کو ان کا نام لے کر پکارتے تھے۔ مجھے فرمایا کرتے تھے اشرف علی خدا جانتا ہے کہ مولانا کے اس طرح پکارنے سے اس قدر جی خوش ہوتا تھا کہ اوروں کے مولانا صاحب کہنے میں وہ لطف نہیں آتا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مذاق جدا تھا۔ وہ شاگردوں کو بھی مولوی صاحب اور شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے بات یہ ہے۔ ع۔ ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است ؎

بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است

مختلف شانیں ہیں۔ کسی پر تواضع غالب ہے کسی پر شفقت و رحمت کا غلبہ ہے کسی کے اندر جلال کسی میں جمال کی شان ہے۔ بعض لوگ جو بزرگوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ فلاں نرم ہیں اور فلاں تیز ہیں یہ نری جہالت ہے۔ تم کو ان کے حال کی کیا خبر ہے تم ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی حالت پر رہو۔ بزرگوں کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ گیدڑ اگر شیروں کا فیصلہ کیسے تو اس کی کم بختی آتی ہے تم اپنی خیر مناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے درمیان میں تم نہ ڈھے جاؤ ؎

آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ بر نہ تابد کوہ را ایک برگ کاہ۔

حاصل مجاہدہ

غرض مانع عن الحق دو شی ہیں عقل اور طبیعت۔ عقل خواص کی راہزن ہیں اور طبیعت سب کی۔ پس مجاہدہ کا حاصل یہ ہوا کہ عقل اور طبیعت دونوں کو مغلوب کیاجائے پس دو قسم کے عمل کی ضرورت ہے

ایک تو وہ عمل کہ جس پر عقلیت غالب ہو مثلاً نماز ہے کہ اس سے مقصود جباہ کو مخلوق کرنا۔ اور جناب باری کے سامنے نیاز مندی کا اظہار ہے تو عقل بھی نیاز مندی اور نماز میں مناسبت سمجھتی ہے اسلئے کہ اسمیں دست بستہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اشرف اجزاء یعنی سر کو ارذل العناصر یعنی زمین پہ رکھا جاتا ہے غرض اس کے ہر ہر جزو سے اس کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ کو سمجھیئے کہ وہ قوت بہیمیہ کے انکسار کیلیے ہے اور مناسبت دونوں میں سمجھ میں آتی ہے پس ان دونوں عبادتوں میں عقلیت کی شان غالب ہے ان کے ادا کرنے سے عقل کی رعایت ہے اور دوسری قسم عمل کی وہ ہونا چاہیئے کہ جسمیں عقلیت کی شان مغلوب ہو۔ عقل برداشت اس کو نہ سمجھے۔ بلکہ اسمیں طبیعت کا غلبہ ہو اور اس کے ادا کرنے میں طبیعت کی رعایت ہو۔ جب عقل اور طبیعت دونوں کی رعایت کر کے دونوں کو کام میں لگا دیا جائے تو دونوں کو حق تعالےٰ سے تعلق ہو کر ان میں شان انقیاد کی آجاوے گی اور دونوں اعتدال پہ آجاویں گے اور یہی دونوں جیزیں حق سے روکنے والی تھیں تو سوقت بندہ پر حق واضح ہو جاوے گا۔ اور مجاہدہ بھی کامل ہو جائیگا۔

رعایت طبیعت

اس سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ جیسے ہم کو پہلی قسم کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دوسری قسم کی بھی ضرورت ہے اسلئے ہم کو اس میں سے بھی حصہ دیا گیا ہے۔

اور صرف عقل کو رام کر لینا کافی نہ تھا۔ اسلئے کہ طبیعت اس کی مزاحم ہوتی ہے۔ اور عقل اور طبع میں جب تنازع ہوتا ہے تو غلبہ ہمیشہ طبع کو رہتا ہے۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طبع پر وہم کا اثر غالب رہتا ہے۔ دیکھو اگر بڑی اونچی دیوار ہو اور ایک گز اس کا عرض ہو اور ادھر ادھر کوئی آڑ اس پر نہ ہو اور وہاں پر کسی آدمی کو چھوڑ دیا جاوے تو سوائے نٹ کے کوئی اس پر کو نہ گذر سکیگا۔ بلکہ گذرنا تو علیحدہ وہاں بیٹھ نہ سکے گا۔ حالانکہ عقل کہتی ہے کہ چلنے کے لئے تو صرف ہاتھ بھر بلکہ اس سے کم جگہ کافی ہے اور عقل برابر زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ گرو گے نہیں۔ مگر وہم کہتا ہے کہ ضرور گرو گے اور اُسی کا غلبہ رہتا ہے۔

بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ بہت اونچی دیوار پر جو انسان ڈرتا ہے۔ اور بسا اوقات گر بھی جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شئے کا مرکز کی طرف میلان ہے۔ مرکز یعنی زمین اس کو کشش کرتی ہے۔ اسلئے ڈرتا ہے۔ یہ بالکل بے ہودہ بات ہے اسلئے کہ اگر کسی اندھے کو وہاں چھوڑ دو اور یقین دلا دو کہ حافظ جی اس کے دونوں طرف دیواروں کی آڑ ہے گرو گے نہیں تو ہرگز اس کو خوف نہ ہوگا۔ اور جب اسکو بھی علم ہو جاویگا تو وہ بھی خائف ہوگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہم کے غلبہ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

دیکھو ننھے بچے ایسی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں کہ بڑے وہاں نہیں جا سکتے۔ اسلئے کہ ان کو ہوش نہیں اور وہم پرستی سے ان کا دماغ خالی ہے ان کو زمین کیوں نہیں کشش کرتی۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ اسی طرح پتھر جو اوپر سے نیچے کو آتا ہے تو حکماء قدیم تو یہ کہتے ہیں کہ پتھر کے اندر نیچے جانے کا میلان ہے اور اسوقت کے فلاسفہ کہتے ہیں کہ زمین اس کو اپنی طرف کشش کرتی ہے یہ سب گپ ہے ہاں پہلی بات کچھ جی کو لگتی ہے قرآن شریف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ارشاد ہے۔ ان اللہ یمسک السموٰت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ اور ارشاد ہے ویمسک السماء ان تقع علی الارض ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان زمین پر گرنا چاہتا ہے مگر حق تعالیٰ اسے روکے ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شئے مرکز کی طالب ہے۔

الحاصل طبع پر وہم کا غلبہ رہتا ہے پس اگر مجاہدہ کے اندر صرف عقل کی تعدیل کی جاتی اور طبع کو مہمل چھوڑ دیا جاتا۔ تو سخت مصیبت ہو جاتی۔ مثلاً نماز کا وقت آیا تو عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھنا چاہیے اور طبع پر سستی غالب ہوئی اور پہلے گذر چکا ہے کہ عقل اور طبع کی مزاحمت کے وقت طبع کو غلبہ رہتا ہے۔ پس اس صورت میں بھی طبع کو غلبہ رہتا۔ پس اس کا ضروری اور لازمی اثر

تھا کہ نماز ترک ہوتی۔ حق تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ طبع کو بھی رنگین بنا دیا۔ اور اس کو خاص خاص مجاہدوں سے مہذب بنا دیا۔ اب خود اس کا اقتضاء ہے کہ وہ اٹھا کر کھڑا کر دیتی ہے اسی واسطے منتہا مجاہدہ کا یہ ہے کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن جاویں اسی کی نسبت کسی نے کہا ہے۔ ؎

صنمارہ قلندر سزد از بمن نمائی ۞ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

رہ قلندر سے یہی مراد ہے کہ طبع پر رنگ چڑھ جاوے کہ بدوں اسکے چین نہ آوے بفضلہٖ تعالیٰ اس رنگ کا حصہ کم و بیش دینداروں میں موجود ہے۔

اختلافِ طبیعت

دیکھو اگر کسی نمازی کو نماز کے وقت دو آدمی پکڑ کر رسّے باندھ دیں تو وہ رسّے توڑ کر بھاگے گا۔ تو اسمیں کیا راز ہے یہی ہے کہ اس کی طبیعت بدل گئی ہے وہ کشاں کشاں اسکو اپنے مقتضیٰ کی طرف لئے جاتی ہے۔ اس کو ملکہ راسخہ اور طبعیہ ثانیہ کہتے ہیں۔

کسی بزرگ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک آقا اور غلام چلے جارہے تھے غلام نمازی تھا نماز کا وقت آگیا وہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور آقا صاحب مسجد سے باہر رہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو آقا نے پکارا کہ آؤ۔ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ فرق کیا تھا کہ نماز اس غلام کی طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ اور مولیٰ کی طبیعت مہذب نہ تھی۔

اس کی وہ حالت تھی جیسے کسی قصائی کا بیل چھوٹ کر مسجد میں گھس گیا۔ لوگوں نے ملامت کی تو کہنے لگا کہ میاں جانور بے عقل تھا چلا آیا کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے اللہ اکبر طبیعت کا کیسا اختلاف ہے اور یہی طبیعت کبھی ایسا پلٹا کھاتی ہے کہ تکبیر اولیٰ بھی اگر قضاء ہو جائے تو گویا غم کا پہاڑ آگرتا ہے ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود ۞ گر ز باغ دل خلالے کم بود۔

اسلئے بہت زیادہ ضروری طبیعت کا مسخر کرنا ہے۔

طبیعت اور عقل کی مثال

طبیعت اور عقل کی مثال ریل کی سی ہے کہ انجن میں جو کلیں ہیں ان کے ذریعے سے پہیے کو گھما کر بھی چلا سکتے ہیں لیکن سخت تکلیف ہوگی اور کچھ دور جا کر یقیناً رک جائیگی اور زیادہ مسافت قطع نہ کر سکے گی۔ یہ مثال تو عقل کی ہے کہ عقل کے ذریعہ سے گو بدن سے کام لے سکتے ہیں لیکن بہت کم اور بڑی مشقت سے اور اگر اس میں آگ اور پانی بھی ہو اور اس کے بعد کلوں کو گھمایا جائے تو پھر اس سے بے تکلف ہزاروں میل قطع ہو سکتے ہیں۔ یہ مثال طبیعت کی ہے کہ اگر طبیعت رنگین ہو جائے تو اس سے بڑے بڑے کام بے تکلف لے سکتے ہیں۔ بس ایسے مجاہدوں کی بھی ضرورت واقع ہوئی کہ جن سے طبع مسخر ہو۔

حج سے تسخیر طبیعت

ان میں سے ایک بہت بڑی شے حج بھی ہے اور اس میں یہ رنگ ہونا اس آیت سے سمجھ میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ واسطے اللہ کے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج ہے جو اس تک راہ کی مقدور رکھتے ہیں۔

اس آیت میں جو لفظ حج البیت واقع ہوا ہے تو اس اضافت سے اس کا پتہ چلتا ہے اللہ اکبر قرآن شریف کا ایک ایک حرف ایک علم کا دریا ہے دیکھو اس اضافت سے کتنا بڑا علم مستنبط ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عقل اور طبیعت کے آثار میں تفاوت ہے عقل کا مقتضے یہ ہے کہ نفس عبادت کا اہتمام ہو اور قیود اور ہیئات کا اہتمام بالکل نہ ہو اسلئے کہ عقل تجرد کو چاہتی ہے اور تعینات اور تشخصات سے اس کو تنفر ہے اور طبیعت چونکہ محسوسات سے مالوف ہے اسلئے اسکو قیود اور ہیئات و تعینات سے انس ہے اور جس شخص میں تجرد ہو اس کو الفت و انس نہیں ہے مثلاً نماز ہے اسکی روح خشوع اور خضوع ہے تو عقل محض اس معنیٰ سے آشنا ہے اور جو قیود اسکے علاوہ ہیں وہ دو قسم ہیں ایک تو وہ ہیں جو نماز کے مقام اور محقق ہیں جیسے رکوع اور سجدہ

عقل کو ان سے بھی گریز نہیں ۔ اسلئے کہ یہ سب خشوع اور خضوع کی صورتیں ہیں اور اسی طہارت کی قید سے بھی اس کو انکار نہیں اور دوسری قسم قیود کی وہ ہیں جو زائد اور خارج ہیں جیسے مکان خاص یا زمان خاص عقل اس قسم کی قیود کو تجویز نہیں کرسکتی ایسے قیود طبیعت کا حظ ہیں : اسی واسطے میں نے کہا تھا ۔ کہ نماز کے اندر عقلیت کی شان کا غلبہ ہے اور طبیعت مغلوب ہے پس عقل ایسی عبادت کی مجوز ہے جو زمان اور مکان کی قید سے مبرا ہو جیسے ذکر اللہ کہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں چنانچہ ارشاد ہے یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً اور حدیث میں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل حین ۔ لیکن طبیعت کی رعایت کر کے بعض عبادتوں میں قیدیں لگائی گئی ہیں اسلئے کہ طبیعت کا تعلق جزئیات محسوسہ سے ہے اور اسکا مقتضے یہ ہے کہ ہر قسم کی قید ہو پس جو عبادات عقل کی تسخیر کے لئے ہیں ان میں قیدیں نہ ہونی چاہئیے اور طبیعت کی تسخیر کے لئے ہیں ان میں قیود جو نا ضروری ہیں اسلئے ہر قسم کی عبادتیں حق تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں

اس کے بعد سمجھنا چاہئیے کہ قیود کی تین قسمیں ہیں ۔ اول قید زمان ۔ دوسرے قید مکان تیسرے علاوہ ان دونوں کے کوئی قید مناسب ہو ۔ ان تینوں قسموں کے درمیان جو غور کر کے دیکھا جاتا ہے تو زمان کی قید عقل سے اتنی بعید نہیں ہے جس قدر کہ مکان کی قید بعید ہے اسلئے کہ زمان بھی ہر چند کہ قید ہے لیکن وہ ایسی قید ہے کہ اطلاق کے مناسب ہے اسلئے کہ زمان خود ایک ایسی شئے ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کا اطلاق ہے خواہ فلاسفہ کے قول کے موافق فلک الافلاک کی حرکت کو کہا جائے یا متکلمین کے قول کے موافق ایک امتداد موہوم سے تعبیر کیا جائے ہر صورت میں زمانہ ایک ایسی شئے ہے کہ اسمیں اطلاق کی مشابہت ہے پس اس قید سے بھی عقل کو زیادہ انکار نہیں ہے ۔ باقی رہی قید مکان کی یا وہ قید جو محسوس ہوتے ہیں مکان کی طرح ہو اس سے عقل کو بالکلیہ انکار ہے وہ خاص طبع کے لئے ہیں پس حج چونکہ بیت کیطرف مضاف ہے اور بیت نام ایک مکان خاص کا ہے اسلئے یہ عبادت طبع کی تسخیر کے لئے ہوئی اور عقل اس کو بالکل تجویز نہیں کرتی ہے ۔

مجاہدۂ حج چنانچہ حج کو اول سے آخر تک دیکھ لیجئے کہ اس کے سب افعال ایسے ہی ہیں۔ دیکھئے سب سے پہلے حج میں کیا ہوتا ہے۔ سب سے اول یہ ہوتا ہے کہ اپنے گھر آرام سے اپنے اہل وعیال اور عزیزوں میں بیٹھے ہوتے ہیں دل میں آیا کہ حج کریں۔ سفر کی تیاری ہوئی عقل یہاں سے ہی مانع ہوتی ہے کہ کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً جبکہ عقل نے یہ اشعار بھی سن لیے ہیں۔ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ✤ معشوق دریں جاست بیائید بیائید

حالانکہ یہ شعر خاص ان لوگوں کے واسطے ہے جو حج کرکے خدا سے اور زیادہ دور ہو جاتے ہیں یعنی پاس کچھ نہیں ہے اور شوق ہوا حج کا چل دیئے اور راستہ میں نمازیں قضا کر رہے ہیں اور لوگوں سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خطاب ہے کہ محبوب تو یہاں ہی ہے یعنی اس کی مرضی نہیں ہے کہ تم وہاں جاؤ اور مرضیات کے خلاف کرو غرض عقل اول ہی سے سد راہ ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت حق تو مقید مکان کے ساتھ نہیں تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔ غرض عقل کو سخت کشمکش ہوتی ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ آجکل جو بعض عقل پرست حج پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عقل کے خلاف ہے اس امر کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور اسی کو ہم ثابت کرتے ہیں کہ واقعی عقل کے خلاف ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ عقل جس بات کو تجویز نہ کرے وہ ضروری نہیں ہے یہ عبادت طبع کی تسخیر کے لیے ہے اور اس کا تسخیر کرنا ضروری ہے کما مر۔

اب آگے چلیے آگے یہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے آدمیوں کی صورت سے نکل کر یہ وحشت ہوئی کہ سب کپڑے اتار دیے صرف ایک لنگی باندھ لی اور ایک چادر بدن پر اوڑھ لی اور سر ننگا کر لیا۔ یہاں بھی عقل کو وحشت ہوئی کہ ہائیں یہ کیا ہوا یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ ننگے سر رہو اور اچھے خاصے کپڑے اتار کر مردوں کا سا کفن بدن سے لپیٹ لیا۔

اس کے بعد دو رکعت پڑھ کر چلانا شروع کیا لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ۔

اب عقل پھر روکتی ہے کہ یہاں چلاتے کیوں ہو یہ تم کو کیا سودا ہوا۔ لیکن وہ ایک نہیں سنتا۔ اس کے بعد آگے چلے جب خانہ کعبہ تک پہنچے اور اس کو دیکھا تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہو گئے۔ عقل کہتی ہے کہ باولے کیوں ہو گئے روتے کیوں ہو؟ آگے بڑھے تو کیا سوجھی کہ دیوانوں کی طرح ایک مکان کے چاروں طرف پھر رہے ہیں۔ اور پھر یہ حرکت کہ آپ دوڑتے ہیں اور شانے ہلاتے جاتے ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ بس جی بالکل ہی دیوانگی آگئی اور وہ جواب دیتا ہے ؎

مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم ٭ ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم

ہر کسے را دید و در خانہ نشد ٭ او ست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

غرض عقل وہاں لنگڑی، لولی کھڑی تکتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس بھلی مانس سے کوئی پوچھے کہ تو یہاں آئی کیوں۔ اس کو مناسب تھا کہ یہ یہاں نہ آتی۔ لیکن طبیعت سے پوچھو وہ باغ باغ ہے اور عقل کو ملامت کرتی ہے کہ تو یہاں کیوں آئی یہاں تیری دعوت نہیں ہے یہاں تو ہماری دعوت ہے تو یہاں محض طفیلی ہے ایک طرف چپکی کھڑی رہ اگر ذرا دم مارا تو کان پکڑ کر نکال دی جائے گی۔ خیر عقل بے چاری چپ ہو گئی۔ اس نے اور صبر کیا خیر۔

وہاں سے پھر پھر آ کر صفا مروہ کی طرف گئے وہاں کیا حرکت کی کہ اچھے خاصے متانت کے ساتھ چلتے چلتے میلین اخضرین کے درمیان ایکدم سے بھاگے۔ عقل کو سخت وحشت ہوئی پھر ایک دفعہ نہیں سات مرتبہ یہی کیا۔ اس کے بعد خیر عقل نے مغلوب ہو کر تسلیم کر لیا کہ یہ اللہ میاں کا گھر ہے یہاں ایسے ہی افعال مناسب ہیں اس کے بعد آٹھویں تاریخ جب آئی تو عرفات کو چلے عقل یہاں بھی روکتی ہے کہ میاں یہ کیا وحشت ہے۔ اللہ میاں کے گھر کو چھوڑ کر جنگل کیوں چڑھ گئے پھر وہاں کوئی شئے نہیں محض ایک میدان ہے اور وہاں جا کر کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا۔ ایک نماز تھی جو عقل کا حظ تھا وہ بھی اپنے وقت پر نہیں ہے۔ یعنی عصر کی نماز اس روز ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ خیر عقل نے جوں توں کر کے تمام دن گذارا۔ اب مغرب کا وقت آیا عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھو لیکن نماز

نہیں پڑھتے اسلئے کہ اس روز مغرب کی نماز مزدلفہ میں جاکر عشاء کے وقت میں پڑھی جاتی ہے مغرب کا وقت گذر رہا ہے اور عقل سخت پیچ وتاب میں ہے کہ یہ کیا اسرار ہے کہ نماز بھی اڑگئی۔ عقل اس پارلیمنٹ سے بالکل علیحدہ ہے اس کے بعد منا میں پہنچے وہاں تین پتھر ہیں ان کو کنکریاں مارو یہاں بھی عقل منع کرتی رہی کہ یہ کیا دیوانگی ہے پھر جانور ذبح کرو۔ ذبح خود عقل کے خلاف نہ کہ اس شان کے ساتھ۔ اس کے بعد سر منڈاؤ اچھے خاصے بھلے سر کدو سے نکل آتے۔ اور عورتوں کے لیئے بجائے سر منڈانے کے تھوڑے سے بالوں کا کترانا ہے اسلئے کہ عورتوں کے سر کے بال مردوں کی داڑھیوں کے قائم مقام ہیں جیسے مردوں کی زینت داڑھی سے ہے عورتوں کی زینت سر کے بالوں سے ہے اسلئے حج اور غیر حج کسی وقت انکا بالکل کترڈالنا یا مونڈنا جائز نہیں۔

اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں اُن کو چاہیئے کہ عورتوں کے سر کے بال منڈایا کریں۔ اسلئے اگر داڑھی کے منڈانے سے ان کے زعم میں زینت ہوتی ہے تو عورتوں کے سر کے بال منڈانے سے بھی ہونی چاہیئے۔

غرض حج کے جسقدر افعال ہیں اول سے آخر تک سب عقل کے خلاف ہیں اسلئے کہ اس مجاہدہ میں عقل کی رعایت نہیں ہے طبیعت کے مذاق کے موافق ہے اسلئے کہ طبیعت قیود مکانیہ کو مقتضی ہے یہ تو اجمالی بیان تھا۔ حج میں رعایت طبیعت کا۔

خاصیت محبت

اور تفصیلی بیان یہ ہے کہ تتبع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اصل میں طبع جس شے سے مغلوب ہوتی ہے وہ صرف ایک شے ہے جس کا نام محبت ہے محبت ہی وہ شے ہے جس سے طبیعت مغلوب ہوجاتی ہے اور اس کے سامنے بیکار ہوجاتی ہے۔ طبیعت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ وہم کی مسخر تھی لیکن محبت کے سامنے سب اوہام جاتے رہتے ہیں۔ دیکھو اگر کوئی کسی مردار عورت پر عاشق ہوجاتا ہے تو ذلت اور خواری جو کہ طبیعت کے خلاف

تھی سب گوارہ کرتا ہے اور اگر کبھی ان چیزوں کی مزاحمت ہوتی ہے تو کہتا ہے سہ

من آن نیستم کہ یاراں ہمہ کار ÷ بگذارند و خم گیسوے یارے گیرند

طبیعت کہتی ہے کہ رسوا ہو جائیگا۔ محبت کہتی ہے۔ سہ

تا ساز عشق را کنج سلامت ÷ خوشا رسوائی کوئے ملامت

طبیعت چاہتی ہے کہ میری بڑائی اور ننگ و ناموس محفوظ رہے لیکن محبت کا مقتضے

یہ ہے سہ

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ÷ اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما ÷ اے تو افلاطون و جالینوس ما

اور واقعی طبیعت کو دبانے کے لیے بھی ایسی ہی سخت شے کی ضرورت تھی۔ عقل کو تو اس نے دبالیا تھا۔ لیکن محبت جیسا زبردست پہلوان نہ ہوتا تو واقعی طبیعت عقل پہ غالب آکر بہت فساد اٹھاتی۔ غرض محبت طبیعت سے مغلوب ہوتی ہے محبت کا بقاء اور ظہور ہوتا ہے اسباب سے اور اسباب اس کے یہ ہیں کہ محبوب کے ساتھ کچھ تلبس ہو مثلاً محبوب کو دیکھ لیا یا اس کی آواز کان میں آگئی یا اگر خوش قسمتی سے ہاتھ ملالیا تو محب ذبح ہی ہو جائے گا۔ اور اگر کبھی معانقہ نصیب ہوگیا تو یوں سمجھو سب کچھ مل گیا۔ اور اگر ان اسباب میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو محبت ضعیف تو یقیناً جاتی رہے گی اور محبت قوی بھی یا تو ضعیف ہو کر قریب الزوال ہو جائے گی اور یا محب کو فنا کر ڈالے گی۔

طریق اظہار محبت پس جب محبت کا یہ خاصہ معلوم ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ یہاں محبوب ہیں اللہ تعالےٰ اور وہ بالکل نظروں سے غائب ہیں نہ ان کو دیکھ سکتے ہیں نہ کوئی آواز اُن کی سُنائی دیتی ہے اور نہ ہاتھ ملانا اور معانقہ کرنا تو کیسے ہو سکتا ہے پس اگر اس محبت کی بقاء کا کوئی سبب ظاہری دنیا میں نہ بنایا جاتا تو محبین یا تو ہجر میں فنا ہو جاتے یا محبت انکی رخصت ہو جاتی اسلیے حق تعالےٰ نے اپنی رحمت بے نہایت سے دنیا میں ایک گھر بنایا۔ اور اس کو

اپنی طرف منسوب فرما کر اس کا نام بیت اللہ رکھا۔ اور اس پر ایک خاص تجلی اپنی صفات کی رکھی اور اسمیں ایک پتھر حجر اسود رکھا گیا جس کا نام یمین اللہ رکھا گیا اور اس کی زیارت مستطیعین پر فرض کردی کہ اپنی جان اور مال لے کر دار محبوب تک جاؤ اسلئے کہ محبوب حقیقی کو اس عالم میں دیکھ نہیں سکتے اس کے تخت یعنی تجلی گاہ سے ہی اپنی محبت کا اظہار کرو اور اپنے جوش محبت کو نکالو اس کے گرد پھرو اس سے معانقہ کرو اس سے مصافحہ کرو یعنی حجر اسود کو تقبیل یا مس کرو اور عشاق کی سی صورت بناؤ اور جیسے عشاق کی چال اور افعال میں وقار اور متانت نہیں رہتا ایسے ہی تم بیت اللہ شریف کے گرد شانے ہلاتے ہوئے دوڑو اور اگر کوئی ان افعال سے مانع ہو اور ملامت کرے تو اس کو پتھروں سے مارو یعنی رمی جمار کرو۔

اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اسلئے تجویز کی گئی ہیں کہ بڑے بڑے پتھر اگر ہوتے تو ان سے کسی آنے جانے والے کے چوٹ لگ جاتی اور مارنا مقصود ہے شیطان کو۔ اور اس کو درحقیقت مارنے والی شے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور یہ کنکریاں اس کی ظاہری علامت ہے۔

اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حج کے افعال سب عقل کے خلاف ہی ہونا چاہیئے چنانچہ صورت بھی مجنونوں کی سی ہو جاتی ہے۔ سر ننگا۔ بال بڑھے ہوئے جوئیں چلتی ہوئی۔ نہ سر کا ہوش۔ نہ بدن کی خبر اور مناسب تو یہ تھا کہ وہاں اس حالت سے جا کر اپنی جان دے ڈالتے۔ لیکن یہ محبوب کی طرف سے رحمت ہے کہ انہوں نے بجائے تمہاری جان کے ایسی شئے کی جان کو قبول کر لیا کہ جو ان کی جنس قریب میں شریک ہے یعنی بکرا یا گائے یا اونٹ کی قربانی کا حکم دیا۔

فلاسفر قربانی پر اعتراض کرتے ہیں کہ مال کے ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے اسلئے کہ اس کا گوشت بھی نہیں کھایا جاتا۔ لیکن یہاں تو عقل کو بالائے طاق رکھدیا ہے اس کو تو یہ کہا جاتا ہے تو ایک طرف کھڑی رہ تیرا یہاں کام نہیں ہے یہاں تو طبیعت کو بلایا گیا ہے بس فلاسفہ کو بکنے دو یہ کیا جانیں کہ اسمیں کیا لطف ہے۔ غرض

یہ موقع جان دینے کا تھا۔ لیکن یہ رحمت ہے کہ بجائے تمہاری جان کے محبوب نے جانوروں کی جان قبول فرمائی۔

اور دیکھئے کہ محبوب کے مکان کی عظمت عاشق کے دل میں بے حد ہوتی ہے یہاں اسکی عظمت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ وہاں کے جانور کا شکار نہ کرو اور وہاں کی گھاس نہ کاٹو۔ فلسفیانہ نظر سے تو یہ کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن عاشق سے پوچھو کہ اس کو محبوب کی درودیوار کو دیکھ کر کیا حالت ہوتی ہے سے

ومن ویدی فی حب الدیار لاھلہا ✤ وللناس فیما یعشقون مذاھب

اور ایک اور شاعر کہتا ہے)

تمتع من شمیم عرار نجد ✤ فما بعد العشیۃ من عرار (جامع)

وہ عاشق ہی کیا ہوا جس نے محبوب کے مکان کی قدر نہ کی اور وہاں کے گل تو علیحدہ وہاں کے خار کو بھی نظر محبوبیت سے نہ دیکھا اور وہاں کے جانوروں کا شکار تو بہت بڑی خیانت ہے اس تقریر سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ حج کے تمام افعال میں محبت کا ظہور ہے۔ اسیواسطے اسکے تمام افعال عقلی سطح کے خلاف نظر آتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سبب ظاہری ہے۔ محبوب حقیقی کی محبت کے بڑھنے کا اور جب محبت بڑھے گی تو یہ شخص محب ہوگا اور رفتہ رفتہ محبوب بن جاتا ہے

حج سے ازدیاد محبت گو حق تعالےٰ کی محبت اور عبد کی محبت میں اتنا فرق ہے کہ عبد کی محبت کا تو آثار سے شور و غل ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کی محبت مثل حق تعالیٰ کے پوشیدہ ہوتی ہے سے

عشق معشوقاں نہاں ست و ستیر ✤ عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر

لیک عاشق عاشقاں تن رہ کند ✤ عشق معشوقاں خوش و فربہ کند

عشق من پیدا و معشوقم نہاں ✤ یار بیروں فتنہ او در جہاں

اور حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اسکو سمجھتا ہے چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب محسوس

کرتا ہے اور جو وہاں گئے ہیں ان سے پوچھ لو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو جاتا ہے اور بالاضطرار آنسوؤں کا مینہ برسنے لگتا ہے اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے۔ نہ ایک تعبیر میں رولانے کا اثر کیا معنی ہے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ٭ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

یہ ضروری بات ہے کہ حق تعالیٰ مقید بالمکان نہیں ہے لیکن مکان کے ساتھ ایک بے کیف اتصال اور تعلق ضرور ہے لیکن وہ اتصال ایسا نہیں کہ جسکی ہم کیفیت یا کمیت تبلاسکیں مولاناؒ اسی مضمون کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ٭ ہست رب الناس را باجان ناس،

اور مولاناؒ کعبہ کی نسبت فرماتے ہیں ؎

کعبہ را ہر دم تجلی میفزود ٭ ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

اور یہ تجلیات اگر نہ ہوتیں تو اس میں کیا تھا۔ مثل دیگر امکنہ کے وہ بھی ایک مکان تھا۔ پس حجاج دراصل حج البیت نہیں کرتے بلکہ حج رب البیت کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود ٭ حج رب البیت مردانہ بود۔

یہ حج کے اسرار ہیں جو بزرگوں کے کلام سے اول کتاب اور سنت کے اشارات سے میں نے بیان کئے ہیں۔

خاصیت حج

خلاصہ یہ ہے کہ اس سے حفاظت مقصود ہے مذاق محبت کا اور ثمرہ بھی اس کا وہی ہے جو عشق و محبت کا ثمرہ ہونا چاہئیے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ حج مبرور سے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں عشق کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے ماسوا محبوب کے سب فنا ہو جاتے ہیں۔ عشق کی مثال آگ جیسی ہے کھیت میں اگر جھاڑ جھنکار ہوں تو ایک کو اگر اکھاڑا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی۔ اور اگر آگ لگا دو تو ایک دم سے سب جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائیں

گے۔ یہی حال آتش عشق کا ہے کہ ماسوائے کو سوخت کر دیتی ہے۔

اور یہ وہ آگ ہے کہ پلصراط پر جب مومن کا گذر ہوگا تو نار دوزخ کہے گی۔ جز یا مومن فان نورک اطفأ ناری یعنی اے مومن جلدی گذر جا تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا۔ بزرگوں دین نے فرمایا ہے کہ اس نور سے مراد آتش عشق ہے حاجی صاحب کا شعر ہے ؎

اگر ظاہر کروں سوز جگر کو ٭ کروں شرمندہ دوزخ کی شرر کو

مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ٭ ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

اور گناہ بھی ماسوا میں داخل ہیں وہ بھی سوختہ ہو جاتے ہیں اسلئے ارشاد فرمایا کہ حج کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا یہ حاصل ہے حج کا اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ حج کا خاصہ کیا ہے چنانچہ حج کرنے والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بعد حج کے ان پر محبت کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اگر کوئی عارض مانع نہ ہو گیا۔

اب ایک شبہ رہ گیا وہ یہ ہے کہ جس کو حج کی استطاعت نہ ہو تو وہ ناقص رہے گا۔ اسلئے کہ طبیعت اسکی مسخر نہ ہوگی۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ میں نے اول بیان کیا ہے کہ نماز روزہ میں بھی بقیہ لات ہیں اسلئے طبع ان سے مسخر ہو جائیگی لیکن فرق اس قدر ہے کہ حج سے تسخیر کامل ہوتی ہے اور نماز روزہ سے اسقدر نہیں ہوتی۔ گو رفتہ رفتہ بتدریج کمال حاصل ہو جائے لیکن حج سے دفعتًا ہو جاتی ہے ایسی مثال ہے جیسے کسی لکڑی کو آہستہ آہستہ کاٹو تو مدت کے بعد وہ کٹ جائیگی۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ دفعتًا کٹ جائے پس نماز روزہ سے تو تدریج طبع پر اثر ہوگا اور حج سے فورًا رنگ بدل جائے گا۔

عہ لیکن یہ کمال استعداد اور قوت اور موانع کے ارتفاع کے اعتبار سے ہوگا۔
۱۲-جامع

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ گو حج نہ کرے لیکن نیت بلکہ شوق ہو تو ہر مومن کو ثواب حج کا ہوتا ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ **نیۃ المومن خیر من عملہ** پس وہ بھی مثل حج کرنے والے ہی کے ہوگا اور اس کے شوق اور دوسری عبادات کے شوق میں بھی فرق ہے اس کا شوق سب سے بڑھ کر ہے چنانچہ دیکھ لو کہ ساری دنیا کے مسلمان حج کے شوق میں مٹے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا تذکرہ آجاتا ہے تو ہر مسلمان تمنا ظاہر کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو نصیب فرمائے یہ تو ان کا حال ہے جن کو نصیب نہیں ہوا۔ اور جو مشرف ہو چکے ہیں ان کا ایک مرتبہ بلکہ دس مرتبہ سے بھی جی نہیں بھرتا۔ جتنی مرتبہ بھی جاؤ گے جی نہ بھرے گا۔ پھر دل چاہے گا کہ جائیں۔ پس ایسا شوق بھی نائب ہو جاتا ہے۔ اصل کا۔

ایک شبہ اور ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں بھی تو قید مکان کی ہے کہ مسجد کی میں پڑھتے ہیں پس چاہیے کہ اس سے اسی درجہ کی تسخیر طبع کی ہو۔ جواب یہ ہے کہ مسجد کی قید نماز میں فضیلت کی ہے نفس صلوٰۃ بغیر اس قید کے بھی ہو جاتی ہے بخلاف حج کے کہ وہ اس مکان کے بدوں محقق نہیں ہوتا۔ اور قید بھی ایسی عجیب و غریب ہے کہ وہ قید بھی خود مقید ہے۔

حقیقت بیت اللہ تفصیل اس مجمل کی یہ ہے کہ بیت اللہ شریف نام اس خاص بیت کا اسی وقت تک ہے جب کہ وہ اس مکان خاص اور اس جو خاص کے ساتھ مقید ہے چنانچہ اگر اس کے پتھر اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیں تو وہ بیت اللہ نہیں ہے لوگ سمجھتے ہوں گے۔ کہ وہ ایک کوٹھا ہے جب اس کو منہدم کر دیا جائے تو بس حج گیا یہ نہیں ہے بلکہ اس زمین کا نام بھی نہیں ہے چنانچہ اگر تحت الثریٰ تک وہاں کی مٹی اٹھا کر دوسری جگہ پھینک دیجائے تب بھی بیت اللہ موجود ہے۔ پس درحقیقت بیت اللہ اس بعد مجرد کا نام ہے جو تحت الثریٰ سے عنان سما تک ہے نہ کوٹھا بیت اللہ اور نہ زمین چنانچہ اگر کوئی بیت اللہ کے اوپر کسی ایسے مکان کے اوپر نماز پڑھے جو بیت اللہ سے بلند ہے تو نماز ہو جاتی ہے

یہاں سے یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ شعائر اسلام کی بنیاد کس قدر قوی ہے کہ ان کا مدار کسی ضعیف اور بے اصل شے پر نہیں اور یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی ہوگیا۔ کہ جو بعض غیر قومیں نے کیا ہے کہ مسلمان بھی بت پرستی کرتے ہیں یعنی کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔

تقریر جواب کی یہ ہے کہ اوّل تو ہم خانہ کعبہ کو مسجود نہیں سمجھتے اور دوسرے یہ کہ خانہ کعبہ ان پتھروں کا نام نہیں جیسا کہ ابھی واضح ہوگیا۔ بت پرستی میں تو اگر اس بُت کو اٹھا کر پھینک دیا جائے تو اس طرف کوئی سجدہ نہ کرے گا۔

تشبیہ بالحجاج

اور اسی تقریر سے قربانی کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی کہ وہ ہمارے جان کے قائم مقام ہے باقی اور مقامات پر جو سب مسلمان قربانی کرتے ہیں تو اس کا راز یہ ہے کہ حج کے برکات تو انہیں کو حاصل ہوتے ہیں جو حج سے مشرف ہوتے ہیں اور جو وہاں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس کے برکات سے محروم تھے اسلیئے حق تعالےٰ نے حج کا ایک جزو ان پر واجب کردیا کہ تشبیہ بالحجاج سے اُن کو بھی ان برکات کا ایک حصہ نصیب ہوجائے اور نیز اول بیان کیا گیا ہے کہ قربانی بھی منجملہ ان مجاہدات کے ہے جو طبیعت کی تسخیر کے لیے ہیں اور طبیعت کی تسخیر کی ہر ایک کو ضرورت ہے اسلیے سب کو یعنی غیر حجاج کو بھی قربانی کا حکم ہوا اور یہ سنت ابراہیمی ہے۔

قربانی کا راز

اور اصل تو اس کی یہ تھی کہ بیٹے کی قربانی کریں لیکن چونکہ ہم ضعیف تھے اور بیٹا اپنی جان سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اسلیئے بجائے اسکے یہ حکم ہوتا کہ اپنی جان قربان کرو اسلیے کہ اپنی جان دینا بھی لوازم عشق سے ہے۔

چنانچہ بعض بزرگوں کو یہ دولت نصیب بھی ہوئی کہ خانہ کعبہ پہنچکر انہوں نے اپنی جان دیدی ہے۔ حضرت نجم الدین کبریٰؒ یا کسی اور بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک شخص آپ کی مجلس اس مصرع کا تکرار کرنے لگا۔ ؏

جاں بدہ جاں بدہ جاں بدہ۔ حضرت کو جوش ہوا اور فرمایا کہ میاں محبوب

جان مانگ رہے ہیں اور کوئی اتنا نہیں ہے کہ جان دیدے اور یہ کہہ کر فرمایا جان دادم جان دادم وجان دادم اور وصال ہوگیا۔ پس اصل تو عشق کا مقتضے جان دینا ہے۔

اور اگر وہ جان مانگتے تو حق تھا۔ چنانچہ ارشاد بھی ہے وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْہِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ الخ اور وہ تو سلطان السلاطین ہیں دنیا کے جب لیسے خطرناک موقعوں پر لے جاتے ہیں کہ جہاں جان کا خطرہ ہے اور انکار نہیں کرتے تو وہ تو بطریق اولےٰ اسکے مستحق ہیں خاصکر جب کہ جان بھی ہماری نہ ہو ان کی ہی دی ہوئی ہو اگر وہ جان لے لے تو کیا حرج ہے۔ مولانا تو اہل اللہ کے لیے فرماتے ہیں۔ ؎

آنکہ جان بخشد اگر بکشد رواست ؛ نائب است و دست او دست خدا است

ہمچو اسمٰعیل بہ پیشش سر بنہ ؛ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی طرح تفویض محض کر دو کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی۔ یعنی بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کرتا ہوں تم سوچ کر اپنی رائے بتلاؤ۔ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ۔ یعنی اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا اے ابا آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے انشاء اللہ تعالےٰ آپ مجھ کو صابرین سے پائیں گے۔ اللہ اکبر کیسے باپ بیٹے تھے کہ دونوں راضی ہو گئے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پچھاڑ کر ان کے گلے پر چھری چلادی۔ لیکن حق تعالےٰ نے بجائے ان کے ایک مینڈھے کو رکھ دیا اور وہ ذبح ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ وہ مینڈھا جان کا فدیہ ہو گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا۔ کہ قربانی جان کا عوض ہے

بیان زکوٰۃ

غرض اس تمام تر تقریر سے قربانی کا راز بھی معلوم ہو گیا اور بحمد اللہ یہاں تک اسلام کے تمام ارکان کے اسرار کا بقدر ضرورت بیان ہو گیا۔ صرف ایک رکن باقی رہ گیا ہے زکوٰۃ لیکن اس کے امرار بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلئے کہ اسمیں عقلیت کی شان اغلب ہے اسلئے کہ مالی اعانت مساکین

کی کیسی شے ہے کہ اس کے استحسان میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہے اور نیز اسمیں کسی مکان یا زمان خاص کی بھی قید نہیں یعنی کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اسوقت اگر ادا نہ کریں تو یہ عبادت قضا ہو جائے۔ باقی چالیسویں حصہ کی تعیین یہ سہولت کے لیے ہے اسلیئے کہ چالیس روپیہ میں سے ایک روپیہ دیدینے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ نصاب مقرر فرمانا بہ معنی سہولت کے لیے ہے مصارف جو مقرر فرمائے ہیں کہ نہ بیٹا ہو نہ پوتا نہ باپ نہ دادا ہو یہ اسلیئے ہے تاکہ نفس پر گراں ہو اسلیئے کہ ان لوگوں کو دینے سے نفس کو کچھ گرانی نہ ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ اول تو اسمیں بہ نسبت اور مجاہدات کے قیدیں ہی کم ہیں اور جو قیدیں ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ اجمالاً ہر شخص ان کا راز سمجھ سکتا ہے گو تفصیلاً اسمیں بھی بعض قیود تعبدی ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تاکہ اسمیں بھی مثل نماز کے عقلیت غالب اور دوسری حیثیت مغلوب ہو۔ مگر چونکہ زیادہ حصہ اسمیں معقول ہے اسلیئے اس کو مستقل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

جذب و سلوک

خلاصہ یہ ہے کہ نماز اور روزہ میں تو عقلیت غالب ہے اور تعبدیت مغلوب اور زکوٰۃ میں عقلیت اغلب ہے اور تعبدیت بہت کم بمنزلہ اس کے کہ گویا نہیں ہے اور حج میں طبیعت اور تعبدیت اغلب ہے اور عقلیت نہایت کم اور ہر قسم کے مجاہدہ کا جدا اثر ہے جسمیں عقلیت غالب اور یا اغلب ہے وہ عقل کی تعدیل کے لیے ہیں اور جس میں طبیعت کا غلبہ ہے وہ طبیعت کی تسخیر کے لیے ہیں اور جن میں عقلیت غالب ہے ان کا اثر سلوک ہے اور جن میں طبیعت غالب ہے ان کا اثر جذب ہے اور یہی دو طریق ہیں قبول کے۔ چنانچہ ان دونوں طریقوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ؀ اجتباء سے طریق جذب اور ہدایت سے طریق سلوک کی طرف اشارہ ہے اور ہم کو اللہ تعالےٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں کہ ان کے حقوق

ادا کرنے سے جذب اور ہدایت سے طریق سلوک کی طرف اشارہ ہے اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں کہ ان کے حقوق ادا کرنے سے جذب اور سلوک حاصل ہو جاتا ہے۔ پس نہ خلوات طویلہ کی ضرورت ہے اور نہ ترک لذات کی حاجت ہے اور نہ تعلقات قطع کر کے گوشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے ان ہی مجاہدات سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ہاں بصیرت و خلوص کی بے شک ضرورت ہے۔ پس خلاصہ اول رمضان سے اب تک کے مواعظ کا یہ ہوا کہ سلوک اور جذب کی تعلیم ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرما دیں۔ (آمین ثم آمین)

بعض مقولات منقولات از شبلیؒ مشتمل بر

بعض رموز حج بتائید بعض مضامین وعظ ہذا

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض متعلقین سے دریافت کیا کہ تونے حج کی نیت منعقد کی تھی اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا جتنے علاقہ اس کے مخالف تیری پیدائش کے وقت سے تھے تونے سب کو قطع کر دیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلی نے کہا تو بس حج کی تونے نیت ہی منعقد نہیں کی (کیونکہ نیت حج کی روح یہی قطع تعلقات ماسوی اللہ ہے جب یہ نہ ہوا تو ظاہر ہے نیت مثل جسد بلا روح کے ہے جو غیر معتد بہ ہے)

پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تونے (احرام کے وقت پہلے سلے ہوئے اپنے کپڑے اتارے تھے اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کیا (کپڑے اتارنے کے وقت تو ہر چیز سے مجرد ہوگیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تونے کپڑے بھی نہیں اتارے (کیونکہ ان کپڑوں کے اتارنے کی روح یہی تجرد عما سوی اللہ ہے، بدوں اسکے کپڑے اتارنا جسد بلا روح ہے)

پھر شبلیؒ نے پوچھا تونے (احرام کے وقت) وضو یا غسل کیا تھا اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا تیرے وضو یا غسل کے وقت تجھ سے تمام (باطنی) علتیں دور ہوگئی تھیں اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا کہ تونے بس تونے وضو و غسل ہی نہیں کیا۔ (کیونکہ اس طہارت ظاہری کی روح یہی طہارت باطنی ہے جب یہ نہیں تو وہ کالعدم ہے) پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تونے (احرام کے وقت) لبیک کہی تھی اس نے کہا ہاں۔ شبلیؒ نے پوچھا تونے لبیک کا جواب ویسے ہی لبیک سے پایا تھا۔ اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تونے لبیک ہی نہیں کہی کیونکہ اس لبیک یعنی حاضری کی روح محبوب کی طرف سے قرب و حضور کی دولت کا میسر ہونا ہے

جس کا اثر قلب پر ظاہر ہوتا ہے۔ بدوں اسکے لبیک کہنا خالی لفظ ہے)

اور اپنے بعض متعلقین سے جو حج کرکے آیا تھا حضرت شبلی رح نے پوچھا (غالباً یہ کوئی اور شخص ہوگا اور ممکن ہے کہ پہلا ہی ہو مگر تفریق اجزاء قصہ کے سبب ناقل نے لفظوں میں ایسا عنوان اختیار کیا ہو جو دونوں شخصوں کے متغائر ہونے کا موہم ہو) غرض اس سے پوچھا کہ تو مسجد (حرام) میں داخل ہوا تھا اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا کہ تو نے کسی مقام قرب میں داخل ہونا بھی معلوم کیا اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو مسجد ہی میں داخل نہیں ہوا۔ (کیونکہ دخول مسجد کی روح دخول مقام قرب ہے جس کا اثر قلب پر ہوتا ہے اور جسد بلا روح کالعدم ہے) پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تو نے کعبہ کو دیکھا اس نے کہا ہاں: انہوں نے کہا کہ تو نے اسکو بھی دیکھا جس کے لیے خود کعبہ کا قصد کیا تھا (یعنی حضرت حق اور یہ رؤیت بالقلب ہوتی ہے) اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے کعبہ ہی کو نہیں دیکھا۔ (کیونکہ روح رؤیت کعبہ کی یہی تھی یہ نہیں تو وہ محض جسد ہے)

پھر شبلی رح نے اس سے پوچھا کہ تو (طواف میں) تین بار دوڑ کر اور چار بار آہستہ چلا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تو دنیا سے اس طرح بھاگ گیا کہ تجھ کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس سے جدا ہو گیا۔ اور وہ تجھ سے منقطع ہو گئی (کہ یہ بھاگنا روح ہے اس طواف میں دوڑنے کی) اور کیا تو نے اپنے چار بار آہستہ چلنے میں اس (دبلا دنیا) سے امن پایا جس سے تو بھاگا تھا پھر اس پر تو نے مزید شکر کیا ہو (کہ اس امن کا معلوم ہونا روح ہے۔ اس آہستہ چلنے کی کیونکہ امن میں آہستہ چلتے ہیں اور خوف و بلا میں دوڑ کر پس یہ دونوں رفتاریں اشارہ ہے اس خوف اور امن کی طرف) اس نے کہا نہیں شبلی نے کہا تو بس تو طواف میں دوڑ کر ہی نہیں چلا (یعنی یہ چلنا محض صورت بے معنی ہوا۔ اور اسی طرح آہستہ چلنا بھی)

پھر اس سے پوچھا تو نے حجر اسود سے مصافحہ کیا تھا اور اس کو بوسہ دیا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے ایک چیخ ماری اور کہا کمبختی مارے واللہ یہ کہا گیا ہے

(یعنی اکابر نے کہا ہے) کہ جو شخص حجرِ اسود سے مصافحہ کرتا ہے وہ خدا تعالےٰ سے مصافحہ کرتا ہے اور جو خدا تعالےٰ سے مصافحہ کرتا ہے وہ مقام امن میں آجاتا ہے (یعنی دوزخ سے محفوظ ہو جاتا ہے) کیا تجھ پر کچھ اثر امن کا ظاہر ہوا (مثلاً معاصی سے نفرت ہو گئی ہو کہ جو سبب ہے دوزخ میں جانے کا کہ یہ ظہور ہے اثر امن کا)

اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے (حجرِ اسود سے) مصافحہ ہی نہیں کیا (کیونکہ جب اسمیں روح نہیں تو جسد محض صورت بے معنیٰ ہوا)

اور ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا خواہ وہ پہلا ہی شخص ہو یا کوئی اور ہو (جیسے یہی دو احتمال اوپر بھی آچکے ہیں) حضرت شبلیؒ نے کہا کیا خدا تعالےٰ کے روبرو مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور دو رکعت (طواف) کی پڑھی تھیں اس شخص نے کہا ہاں: شبلیؒ نے پوچھا کہ تیرا جو مرتبہ خدا تعالےٰ کے نزدیک ہے۔ تو اس پر بھی قائم ہوا پھر تو نے اپنا مقصود بھی ادا کیا (جسکی طرف اشارہ ہے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا یعنی خدا تعالےٰ کے نزدیک ایک مرتبہ قرب کا حاصل ہوا اور مقام قرب کے مناسب جو مناجات و مکالمت ہے وہ میسّر ہو) اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا بس تو نے نماز ہی نہیں پڑھی۔ (کیونکہ جب اس نماز کی روح ہی نہیں تو قالب بے جان ہے۔

اور ایک شخص سے (کہ وہی شخص مذکور تھا یا دوسرا) حضرت شبلیؒ نے کہا کہ تو کوہ صفا کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کہ تجھ سے تمام علتیں دور ہو گئیں تھیں یہاں تک کہ تو (سب سے) صاف ہو گیا تھا۔ (جیسا مادہ صفا میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔ و نیز صفا سے ابتداء ہوتی ہے حرکت سعی کی اور حرکت مسلمان کی تہذیب نفس کے لیے ہونا احق ہے۔ ایلیے بھی اس حرکت کی روح زوال علل ہے۔ اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نہ صفا پر چڑھا اور نہ اترا۔

پھر شبلیؒ نے کہا کیا تو (صفا و مروہ کی سعی میں میلین اخضرین کے درمیان دوڑا بھی تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے کہا ؏ تو کیا اپنے سامان (ہوش) سے بھاگ کر

؏ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں

اپنی ہستی (کی حقیقت پہچاننے) تک پہنچا (کہ روح اس دوڑنے کی یہی ہے اور مسلمان کے لئے یہی دوڑنا لائق ہے کہ پندار کو حذف کرکے اپنی ہستی فانی پر نظر کرکے حق عبدیت ادا کرے) اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے فرمایا بس تو دوڑا ہی نہیں۔

پھر شبلیؒ نے پوچھا تو نے مروہ پر پہنچکر (اپنے نفس میں، سکون (و طمانیت علی المقضیات الالٰہیہ) کو پایا کہ اس کو تو نے حاصل کیا ہو اور اس کا تجھ پر نزول ہوا (کہ مروہ پر اخیر پھیرے میں حرکت سعی ختم ہوتی ہے گویا یہ اشارہ ہے اس سکون نفس کی طرف جو بعد حرکت مجاہدہ کے میسر ہوتا ہے) اس شخص نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا بس تو مروہ ہی پر نہیں پہنچا۔

اور شبلیؒ نے ایک حج کرنے والے شخص سے (کہ وہی شخص سابق تھا یا اسکے علاوہ دوسرا) پوچھا تو منی کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا ہاں۔ شبلیؒ نے پوچھا کیا تو نے (وہاں پہنچکر) غیر حالت معصیت کی تمنا کی تھی۔ اُسنے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو منیٰ ہی میں نہیں گیا۔ (کیونکہ منیٰ کے مادہ میں مینہ بمعنیٰ آرزو سے مناسبت ہے تو اسمیں اس آرزو کی طرف اشارہ ہے)

پھر حضرت شبلیؒ نے اسکے پوچھا کہ تو مسجد خیف میں (جو کہ منیٰ میں ہے) داخل ہوا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں! شبلیؒ نے کہا تو نے اپنے اس آنے جانے میں خدا تعالےٰ سے خوف کیا تھا اور تو نے (اپنے دل میں، خوف کا ایسا درجہ پایا تھا جو اسی مقام میں تجھ کو حاصل ہوتا ہو۔ اس شخص نے کہا نہیں۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو مسجد خیف میں داخل نہیں ہوا (کیونکہ لفظ خیف کو مناسبت ہے لفظ خیفہ سے جس میں کسرۂ ماقبل اور خود ساکن ہونے سے واؤ کو یا سے بدل لیا گیا ہے اور اس کی اصل خوف ہے پس وہاں

عہ منقول عنہ میں یہ عبارت تھی خضرات من زادك و وصلت الی جودك۔ اسی پر ترجمہ کیا گیا۔ اور جی کو یہ لگتا ہے کہ یہ عبارت اسطرح ہو۔
من مرادك الی معبودك واللہ اعلم۔
حاشیہ ہذا بقیہ صفحہ گذشتہ۔

جانا مذکر ہونا چاہیے۔ خوف حق کا جب یہ نہ ہوا تو وہاں جانا نہ جانا برابر ہوا۔ اور حضرت شبلیؒ نے دخول خیف (منیٰ) وجود وصفا میں الفاظ کو مذکر احوال کا قرار دیا کہ عبرت کے لیے لیے اشارات و مناسبات بھی کافی ہیں اسی طرح آگے لفظ عرفات میں اسی مناسبت کا اعتبار فرمایا۔

اور شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا (یہاں بھی وہ دونوں احتمال ہیں اور اغلب مغائرت ہے) فرمایا تو عرفات گیا تھا اس شخص نے کہا ہاں! حضرت شبلیؒ نے فرمایا کیا تو نے اس حالت کی معرفت حاصل کی جس کے لیے تو (ماضی میں) پیدا کیا گیا ہے اور (اسی طرح) اس حالت کی جس پر تو (فی الحال) وارد ہوتا رہتا ہے۔ اور (اسی طرح) اس حالت کی جس کی طرف تو (مستقبل میں) رجوع کریگا۔ اور کیا معرفت بخشنے والے نے تجھ کو ان احوال کی معرفت کرائی۔ اور کیا تو نے اس مکان کو دیکھا۔ جس کی طرف یہ سب اشارات (مذکورہ) ہیں؟ مکان سے مراد مقام معرفت اور اشارات سے مراد عرفات کا احوال مذکورہ کی معرفت کی طرف مشیر ہونا) کیونکہ یہی مقام ہے جس نے انفاس عمر کو احوال مذکورہ میں سے) ہر حال میں عذر سے رہائی دی ہے (یعنی حالات ماضیہ وحالیہ و استقبالیہ مذکورہ کو اسباب معصیت سے بعید رکھنا یہ ثمر معرفت ہی کا ہے) اس شخص نے کہا نہیں حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو نے وقوف عرفات ہی نہیں کیا۔ (کیونکہ عرفات سے ان ہی معارف کی طرف اشارہ ہے جس کی مناسبت کا ابھی اوپر دخول مسجد خیف میں ذکر ہوا ہے)

اور حضرت شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا۔ (خواہ وہ عین اول ہو یا غیر اول) فرمایا تو مزدلفہ کی طرف واپس آیا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا تو نے مشعر حرام (جو کہ مزدلفہ میں ہے) دیکھا تھا۔ اس نے کہا ہاں انہوں نے کہا تو نے وہاں اللہ تعالیٰ کا ایسا ذکر کیا تھا۔ جس نے ماسوا کو بھلا دیا ہو اور تو اسی میں مشغول ہو گیا ہو۔ (جس کا حکم اس آیت میں ہے فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ الآیۃ اور ظاہر ہے کہ ذکر میں درجہ مطلوبہ وہ ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

روح الحج والثجّ

حج اور قربانی کی روح

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۸ شوال المکرم ۱۳۳۲ھ کو جمعہ کے روز بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد دو سو تھی۔

محترم جناب مولوی عبدالحلیم صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

فنائے اتم حج کی روح ہے۔ اور فنائے تام قربانی کی ــــــ نفس فنا میں دونوں شریک ہیں مگر چونکہ قربانی میں عقل کے خلاف کم ہے۔ فقط اتعابِ نفس ہے، اسی لئے فنا تو وہ بھی ہے مگر حج کے برابر نہیں ہے۔ اور دونوں میں تام اور اتم کا تفاوت ہے۔ یہ ان دونوں کی روح ہوئی۔

(از حضرت حکیم الامت رح)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الوعظ المسمّٰی بہ

روح الحج والثج

*

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـئًا وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ۝ وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ۝ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ وَيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ فِىۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ

عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۝ ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَھُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَھُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ ۝ ترجمہ: (یعنی جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کو خانۂ کعبہ کی جگہ بتلا دی اور حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک کرنا اور میرے اس گھر کو طواف کرنیوالوں کے اور قیام اور رکوع و سجدہ کرنیوالوں کے لئے پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو وہ تمہارے پاس حج کو چلے آویں گے پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دُور دراز رستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے دینی اور دنیوی فوائد کے لئے آموجود ہوں اور ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو انکو اللہ تعالیٰ نے عطا کئے ہیں سو ان قربانی کے جانوروں میں سے تم کو بھی اجازت ہے کہ کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو پھر لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں اور اپنے واجبات کو پُورا کریں اور خانہ کعبہ کا طواف کریں ")

تمہید ان آیات میں حق جل شانہٗ نے حج اور قربانی کے متعلق مقصوداً اور بعض اقسام انفاق مالی (خرچ کرنا) کے متعلق تبعاً مضمون ذکر فرمایا ہے اور ان میں اوّل حکایت ہے ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے خطاب کی پھر اس سے انتقال کر کے خطاب ہے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حاصل ہے ان آیات کا۔

وجہ ان آیات کے اختیار کرنے کی یہ ہے کہ میرا معمول ہے کہ جب جیسا موقعہ اور جیسی ضرورت دیکھتا ہوں اس کے متعلق کچھ بیان کر دیتا ہوں اور یہ کام تو مصنف کا ہے کہ جو ضروریں واقع یا متوقع ہوں سب کے لحاظ سے وہ مضامین کو جمع کر دیں لیکن کسی خطاب کرنے والے کا جس کو واعظ کہتے ہیں۔ منصب صرف اسی قدر ہے کہ وہ جس وقت جو حکم مناسب ہو اس کے متعلق بیان کرے۔ اس لئے میرا معمول ہے کہ بعد رمضان و عید کے حج کے متعلق مضامین کلیہ ذکر کیا کرتا ہوں۔

اشہر حج اس وجہ سے کہ بعد رمضان شوال کا مہینہ ہے اور یہ اشہر حج میں ہے جس کو ایک آیت میں حق جل وعلیٰ نے خود ذکر فرمایا ہے اَلْحَجُّ

اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ (حج کا زمانہ چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں) اور اس کی تفسیر شوال و ذیقعدہ و ذی الحجہ سے کی گئی ہے تو گویا شوال سے مہینہ حج کا شروع ہوتا ہے نہ اس معنی کر کہ اس ماہ میں حج کر سکتے ہیں بلکہ اس معنی کر کہ بعد شوال کے بلا کراہت حج شروع ہو سکتا ہے شروع سے مراد احرام ہے ہر چند کہ شوال سے پہلے بھی احرام صحیح ہے مگر اس میں کراہت ہے اور اگر شوال سے شروع کیا جائے تو بلا کراہت صحیح ہے اور احرام چونکہ شرائط حج میں سے ایسا ہے جیسے تکبیر شرائط صلوٰۃ میں سے یعنی ایسی شرط جو مشابہ ارکان کے ہے اس معنی کر شوال و ذیقعدہ کو بھی اشہر حج میں سے قرار دیا گیا اور ذی الحجہ کا تو اشہر حج میں سے ہونا ظاہر ہی ہے اس واسطے کہ بڑے بڑے ارکان حج کے اسی میں واقع ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے میری عادت اس کے متعلق شوال کے شروع میں بیان کرنے کی ہے۔ اب کے بھی اس کے ذکر کرنے کا پہلے سے ارادہ تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی ارادہ تھا کہ ایام قربانی میں قربانی کے متعلق کچھ مضامین ذکر کئے جائیں گے اور جس طرح اب کے رمضان میں روزہ، تراویح، اعتکاف، شب قدر اور عید کے متعلق خاص طرز پر مضامین بیان کئے گئے کہ اس کے قبل کبھی اس طرز پر بیان نہیں ہوئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ شوال میں حج کے متعلق اور ذی الحجہ میں قربانی کے متعلق اسی طرز خاص پر کچھ مضمون بیان کیا جائے تاکہ یہ سب مضامین ایک طرز پر ایک مجموعہ میں شائع ہو جائیں۔

اسی واسطے میں نے اپنے ان دوست کو جنہوں نے اب کے رمضان کے مواعظ ضبط کئے ہیں اس وعظ کے لکھنے کے لئے بھی ٹھہرا لیا ہے اور ذی الحجہ میں بھی آنے کو کہہ دیا تھا تاکہ وہ وعظ جو قربانی کے متعلق ہوگا وہ بھی ضبط ہو جائے۔ لیکن اس وقت میرا یہ خیال ہے کہ اس زمانہ تک کیوں انتظار کیا جائے اس زمانہ میں اگر موقع ہوا قربانی کے احکام شرعیہ بیان کر دیئے جائیں گے۔ باقی بیان مضامین مقصودہ ابھی بیان کر دیئے جاویں۔ بس اس پہلے خیال میں اتنی ترمیم ہو گئی۔ اس لئے قصد ہے کہ دونوں کے متعلق اسی وقت بیان کر دوں۔ اسی واسطے ایسی آیت اختیار کی کہ جس میں دونوں

مذکور ہوں۔ گو قربانی کی زیادہ خصوصیات ان ایام کے ساتھ نہیں جیسا کہ حج کی ہیں، اسی طرح ان آیات میں بھی مقصود بالذات حج کا ذکر ہے اور قربانی و حج دونوں شریک ہیں۔ اس واسطے مناسب معلوم ہوا کہ دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا جائے۔ پھر اس کے بعد مجھ کو یہ خیال ہوا کہ رمضان کے مواعظ میں روزہ، تراویح، اعتکاف شب قدر چراغیر میں عید کے متعلق مضامین مذکور ہوئے تھے۔ مگر یہ سب عبادات بدنیہ کے متعلق تھے۔

اقسام عبادت

اور عبادت کی تین قسمیں ہیں بدنیہ محضہ، مالیہ محضہ، مرکب بدنیہ اور مالیہ سے اور اس وقت حج و قربانی کے متعلق بیان کروں گا کہ یہ دونوں مرکب ہیں بدنیہ و مالیہ سے۔ اب ایک قسم رہ گئی وہ کون سی جو مالیہ محضہ ہے مثل زکوٰۃ کے اور اس کے بیان کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ اس لئے مناسب ہوا کہ یہ کیوں رہ جاوے۔ اس کو بھی بمناسبت حیثیت مالیت حج و قربانی کے بیان کر دیا جائے جس کے اندر صدقہ فطر، زکوٰۃ، خمس، عشر (پانچواں حصہ، دسواں حصہ) وغیرہ سب داخل ہو جائیں اور اسی طرز خاص پر اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ اس لئے آج اس کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اس بناء پر آج کے بیان میں تین قسم کے مضمون مذکور ہوں گے ایک عبادت مالیہ محض اور ایک مرکب بدنی و مالی سے، پھر اس کی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک حج دوسری قربانی۔ کل تین ہو گئے۔ اور عبادات بدنیہ محضہ کے متعلق رمضان میں مذکور ہو چکے ہیں۔ اس طرح سے سب اقسام بیان ہو جاویں گے۔

حج وقربانی میں مناسبت

حاصل یہ کہ اس وقت حج و قربانی وانفاق مالی کے متعلق بیان ہو گا۔ اسی واسطے سوچ کر میں نے ایسی آیت اختیار کی ہے کہ اس میں تیسری قسم بھی تبعاً ذکر ہے غرض تین قسم کی عبادت کے متعلق مضمون مذکور ہو گا۔ حج، قربانی، انفاق مالی چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

بہر حال ایک تو وجہ یہ ہوئی حج و قربانی کے جمع کرنے کی۔ دوسری مناسبت دونوں کے جمع کی یہ ہے کہ جیسا کہ بعض اعتبارات سے یعنی احرام کے اعتبار سے حج کی ابتدا شوال سے اور معظم ارکان کے وقوع کے اعتبار سے انتہا ذی الحجہ میں ہے۔ اسی طرح قربانی کے بھی بعض اعتبارات ذی الحج سے پہلے ہو سکتے ہیں، چنانچہ تسمین ضحایا مامور بہ ہے جو عادۃً ذی الحجہ کے قبل سے خرید کرنے میں ممکن ہے یعنی قربانی کے جانور پہلے سے خرید کر موٹا تازہ کرنا۔ تو گویا پہلے سے سامان اس کا مطلوب و مندوب ہے۔ پس قربانی میں بھی تسمین (یعنی قربانی کا جانور موٹا کرنا) پہلے سے ہوگی جیسا کہ حج میں احرام پہلے سے ہوتا ہے اور بعض حجاج کے اعتبار سے سفر بھی پہلے سے ہوتا ہے۔ خصوصاً ہمارے بلاد میں کہ عموماً شوال میں اور بعضے اخیر درجہ میں ذیقعدہ میں سفر کرتے ہیں اور یہ اتفاق عجیب اور لطیفہ ہے کہ سفر کے اعتبار سے بھی حج شوال ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شوال میں اس کا بیان اکثر کیا کرتا ہوں تاکہ جو حج کو جانے والے ہوں تیاری کرلیں۔

اختیار اسباب کی فرصت

اور گو امسال محض اس بنا پر بیان کرنا پہلے سے مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا، کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ راستہ حج کا بند ہے اگر بند نہیں تو مخدوش ضرور ہے تو ایسی حالت میں پھر ترغیب کی کیا غایت، مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ جانے والے جا رہے ہیں نہ راستہ بند ہے نہ خدشہ ہے، یہ ضرور ہے کہ پہلے سے کچھ تفاوت ہے مگر خدشہ غالب نہیں اور ایسے ضعیف خدشہ کا کیا اعتبار ایسا خدشہ تو گھر سے بازار تک جانے میں بھی ہے کہ شاید کوئی دیوار راستہ میں اوپر گر پڑے، غرض خدشہ نہیں بلکہ اطمینان ہے۔ اگر قلب میں قوت اور ہمت ہے دیکھئے حکام نے بھی اجازت دے دی ہے اگر خدشہ قوی ہوتا تو حکام اجازت نہ دیتے باقی خیر خواہی و احتیاط کی وجہ سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ہم ذمہ دار نہیں، آگے قلوب مختلف ہیں بعضوں کو یہ خیال ہوا کہ جب حکام ذمہ دار نہیں تو خدا جانے کیا پیش آئے گا لیکن ہمت ہو

کو کچھ بھی نہیں کیونکہ جب ذمہ دار تھے ادھر سے ذمہ داری نہ ہوتی تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔
یعنی حکام ذمہ دار ہوئے لیکن خدا ذمہ دار نہیں ہوا اور سمندر میں طوفان آیا اور جہاز غرق ہو گیا تو بتاؤ حکام کی ذمہ داری کیا کر سکتی ہے۔ تو ذمہ دار حکام کا اتنا ہی فرض تھا کہ اصلی واقعہ بیان کر دیں۔ ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ضعیف اندیشہ کو بھی ہم سے چھپایا نہیں اب تم اپنے قلوب میں ہمت واطمینان پیدا کر و اور قواعد شرعیہ سے معلوم کر لو کہ اسوقت جانا کیسا ہے۔ قاعدہ شرعی یہ ہے کہ جب سلامت غالب ہو اور خطرہ مغلوب ہو تو حج فرض ہے چنانچہ آجکل بھی سلامت غالب ہے اور لوگ برابر جا رہے ہیں۔
اب رہی اس کی تفصیل کہ کہاں ٹکٹ ملے گا کب جہاز چھوٹے گا۔ سو میں نے اسکی کاوش نہیں کی۔ آپ تحقیق کر لیجئے۔ اگر بمبئی میں کسی سے ملاقات ہو تو اس سے دریافت کر لیجئے۔ اور اس سے اعلیٰ درجہ تحقیق کا یہ ہے کہ خود بمبئی جا کر معلوم کر لیجئے تاکہ شک و شبہ بھی نہ رہے اور وہ ایسی جگہ بھی نہیں جہاں جانا دشوار ہو کیونکہ یہاں تو آپ کو باسی خبر مل سکتی ہے اور وہاں بالکل تازہ خبریں ملیں گی۔ اور اگر وہاں نہ جا سکیں اور کسی سے جان پہچان ہو تو پھر ایک نیک شخص کا پتہ میں بتلائے دیتا ہوں۔ حاجی احمد جان صاحب سوداگر شاہی بازار سہارنپور ہی پتہ ہے ان سے پوچھ لیں اور میں یہ پتہ اس لئے بتائے دیتا ہوں کہ اگر کسی کو شوق وہمت ہو تو وہ متردد اور پریشان نہ ہو اور ان باتوں کو ان سے معلوم کر کے چل کھڑا ہو۔ لو اب میں نے یہ تدبیر ایسی بتلا دی کہ گویا تمام واقعات بتلا دیئے۔
یہ تو میں کہتا نہیں کہ ایسا توکل کرو کہ سمندر کی سیدھ باندھ کر چل کھڑے ہو بلکہ اسباب سے کام لو۔ مگر اس میں غلو نہ کرو ورنہ اس طرح تو دنیا کا بھی کوئی کام نہیں چل سکتا۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی نے زہر ملا دیا ہو۔ تو اس قسم کے احتمالات خود ہی مردود ہیں ہاں جو احتمال ناشی عن الدلیل دلیل سے پیدا ہوا وہ معتبر ہے لیکن دلیل جلیل ہو ذلیل نہ ہو کوئی معتدبہ دلیل ہو تو اس پر عمل کرنے میں مضائقہ نہیں۔

بہر حال چونکہ یہ عالم اسباب ہے اس لئے اعتدال کے ساتھ اسباب کے اختیار کرنے کا بھی حکم ہے ، چنانچہ حج کے اندر بھی ارشاد ہے وتزودوا یعنی زاد راہ بھی لو کر صغار کے لئے واجب بھی ہے ۔ اس واسطے کہ روپیہ ہوگا تو طمانیت رہے گی ورنہ قلب میں پریشانی ہوگی پھر کیا انشراح ہوگا ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدابیر سے کام لینا مامور بہ ہے ۔ اسی واسطے میں بتلاتا ہوں کہ اول بمبئی جاؤ اور اگر بمبئی نہ جا سکو وہاں کسی سے خطوط کے ذریعہ سے دریافت کر لو ۔ اور اگر کسی سے جان پہچان نہ ہو تو پھر سہارنپور میں حاجی احمد جان صاحب سے دریافت کر لو مگر مہربانی کر کے ٹکٹ جواب کے لئے رکھ دینا گو اگر ٹکٹ نہ بھی ہوگا تب بھی وہ جواب دیں گے مگر یہ واہیات بات ہے کہ اپنی غرض کے لئے خواہ مخواہ ایسی تکلیف دینا جو خود اٹھا سکتے ہو ۔ بہر حال یہ تدبیر میں نے بتلا دی ہے اور اس سے واقعات جزئیہ سفر کے معلوم ہو سکتے ہیں ۔ اب وہ مانع تو رفع ہو گیا کہ جب حج ممکن ہی نہیں تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنا اور ترغیب دینا کیا ضرور ؟ جب ثابت ہو گیا کہ ممکن ہے تو مناسب ہوا کہ اس کے متعلق کچھ بیان کیا جائے تاکہ ہمت و رغبت ہو اور جن کے ذمہ حج فرض ہے وہ چل کھڑے ہوں ۔ بہر حال ہمارا ابتدائے سفر شوال سے ہوتا ہے ۔

ایک وجہ اشتراک (شریک ہونے) کی یہ بھی ہے کہ قربانی بھی ایام حج میں ہوتی ہے تو اس اعتبار سے بھی قربانی و حج ساتھ ساتھ ہیں جیسا کہ قرآن و رمضان کہ دونوں میں ایک خاص مناسبت ہے ۔ گو بعض قربانی ان ایام میں واجب ہے اور بعض مستحب خصوصاً حجاج کے واسطے ان ایام حج میں اور حرم میں اس کی اور زیادہ فضیلت ہے غرض چونکہ دونوں میں مناسبتیں متعددہ تھیں اس وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ ساتھ ساتھ دونوں کو بیان کیا جائے ۔

مال و بدن سے مرکب عبادات

اور میں نے جو حج اور قربانی کو مرکب مالی و بدنی سے کہا ہے سو فقہاء نے حج کو تو تصریحاً مرکب ٹھہرایا ہے یعنی حج کے اندر بذل نفس بھی ہے یعنی سفر کرنا اور ارکان بھی بدن ہی سے ادا ہوتے ہیں تو بدنی ہونا تو ظاہر ہے ۔ رہا مالی ہونا سو مالی اس معنی کو ہے نہیں کہ بدون بذل

مال (خرچ) کے حج ہی نہ ہو سکے کیونکہ ہم ایسا شخص فرض کرتے ہیں جو مکی ہے اور مفلس ہے اس نے قران وتمتع ہی اس لئے نہیں کیا کہ وہ حنفی ہے یا ہم اسے شافعی فرض کرتے ہیں کہ اس نے قران وتمتع بھی کر لیا لیکن اس نے بجائے دم قران وتمتع کے تین روزے رکھ لئے یا یہ صورت ہی قران وتمتع کی نہ فرض کرو کیونکہ بدل کو مبدل منہ ہی کا حکم ملتا ہے تو حکماً گویا اس نے بدل مال کر لیا پس فرض کرو کہ اس نے افراد ہی کیا اور تمام ارکان پیادہ ہی ادا کئے تو دیکھئے ٹکا بھی نہیں خرچ ہوا اور نہ واجب ہوا اور حج ادا ہو گیا تو حج اس معنی کر تو مالی نہ ہوا کہ بدون مال کے اس کا تحقق ہی نہ ہو البتہ اس معنی کر مالی ہے کہ غالباً تلبس مال کا ہوتا ہے چنانچہ حجاج میں اکثر باہر کے ہوتے ہیں اور ان میں بھی بکثرت سفر کر کے سوار ہو کر زادِ راہ لے کر حج کو آتے ہیں تو گویا اکثر تلبس اس کا عادۃً وغالباً ضرور مال کے ساتھ ہوتا ہے گو باہر کے آنیوالوں میں بہت سے باہمت مفلس لوگ پیادہ بھی آتے ہیں مگر بہ نسبت اہل تمول کے ایسے لوگ کم ہوتے ہیں

چنانچہ اس آیت میں بھی ان ہی دستوں کا ذکر ہے:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا (الآیۃ)

کہ اے ابراہیمؑ آپ لوگوں کو حج کے لئے ندا کر دیجئے لوگ آپ کے پاس حج کے لئے پیادہ بھی آئیں گے اور اونٹ پر بھی سوار ہو کر آئیں گے۔ گو پیادہ حج کرنے کا حکم تو نہیں مگر یہ خبر بلا نکیر ہے اس سے مرضی عند الحق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ) ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پیادہ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس کے پاس زادِ راہ ہے۔ دوسرے یہ کہ زادِ راہ نہیں احتمال ثانی تو باطل ہے کیونکہ شریعت اسے پسند نہیں کرتی کہ زادِ راہ ہو اور پھر پیادہ سفر کرے کہ یہ بخل ہے۔ کیونکہ ایسے کنجوس کی مدح کیا ہوگی جو خود بھی نفع نہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع سے باز رکھے کیونکہ سواری میں کچھ خرچ ہوتا تو دوسروں کو بھی کچھ نفع ہو جاتا تو اس سے اشارۃً یہ بھی نکل آیا کہ بلا زادِ راہ بھی حج کرنا جائز ہے جیسا کہ بلا راحلہ (سواری) جائز ہے جس پر علما

کُلِّ ضَامِرٍ (دُبلی اونٹنیوں پر) دالے ہے

پیدل حج

اب بعض لوگوں کا ان پر طعن کرنا جنہوں نے جانبازی کی اور غلبۂ شوق میں پیدل ہی چل کھڑے ہوئے کہ یہ ایسے بیہودہ لوگ ہیں جو خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشانی میں ڈالتے ہیں یہ طعن ناشی ہے جہل سے۔

صاحبو! معلوم ہوتا ہے تم نے عشاق کو دیکھا ہی نہیں، خود جیسے کم ہمت ہو دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے ہو۔ دو چار لنگاڑے فقیر تم نے دیکھے ہوں گے۔ بس اس سے حکم کلی لگا دیا کسی عطار ہی پر اُلٹ پلٹ کے نظر پڑتی رہی اس سے حکیم محمود خاں کے وجود کے منکر ہو گئے، یاد رکھو ہر زمانہ میں اللہ کے بندے ایسے ایسے رہے ہیں جو آپ کی نظر میں مسکین پریشان ہیں، مگر حقیقت میں وہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت کسی بزرگ کا الہام ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم سوائی۔

کہ میرے دوست میرے دامن قبا کے نیچے چھپے ہوئے ہیں، جنہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ تو آپ کو کیا خبر ہے

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست ؛ حال شیرانیکہ شمشیر بلا بر سر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

خاکسارانِ جہاں

تم پر جب وہ کیفیت ہی نہیں تو تم کو کیا معلوم ایسے ایسے لوگ ہیں کہ جن کی ذات کو پہچانتے ہو مگر صفات کو نہیں جانتے جیسے حق تعالیٰ اپنی نسبت فرماتے ہیں:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ

کہ ہم تو تم سے باعتبار علم کے نہایت قریب ہیں اور تم ہم سے باعتبار معرفت کے نہایت دور۔ اسی طرح اللہ کے بندے ایسے ایسے ہیں کہ ذات کے اعتبار سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(یعنی اگر ہم قلاش و دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ کی بات ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور ان کی محبت کے متوالے ہیں)

اور یوں بھی فرماتے ہیں ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ❊ مرعسس رادید و در خانہ نشد

(جو دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے)

اور یوں بھی فرمایا ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را ❊ بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنا لیا)

باز سودائی شدم من اے طبیب ❊ باز دیوانہ شدم من اے حبیب

(پھر اے طبیب ہم سودائی ہوئے اے حبیب پھر ہم دیوانہ بنے)

یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزاروں دانشمندیاں قربان ہیں ؎

رتبہ شہید عشق کا گر جان جائیے ❊ قربان ہونے والے کے قربان جائیے

(امیر مینائی مرحوم ۱۲ جامع)

تو میں نے انہیں دوڑتے ہوئے عمرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ مگر یہ پتہ نہ لگا کہ کون تھے کہاں کے تھے اور کیا نام تھا اور تھے نہایت حسین اور صرف حسن طبعی ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ وہ حسن وہ رونق وہ آب و تاب الٰہی بھی تھی۔ وہ وہی تھے جو حدیث میں ہے

رب اشعث راس مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لابرہ او کما قال

کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے بال پریشان ہیں۔ اگر کسی کے دروازہ پر جائیں تو دھکے دے دیئے جائیں۔ کسی کی سفارش کریں تو کبھی قبول نہ کرے۔ غرض بالکل لوگوں سے علیحدہ ہیں اور کوئی ان کی وقعت بھی نہیں کرتا مگر اللہ کے نزدیک ان کی اتنی قدر اور اس قدر وقعت ہے کہ اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو خدا انہیں ضرور سچا کر دے۔ اور جب خدا کے یہاں انکی بات مانی جاتی ہے تو مخلوق کیونکر نہ مانے گی۔ اسی کا

حاصل عارف شیرازیؒ بیان فرماتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ٭ کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں مستی کی حالت دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

فلک وستارہ پر حکم کیا بعید ہے جب خدا ان کا معروضہ سن لیتا ہے جب خدا ان کا کہنا کر دیتا ہے تو اور مخلوقات ان کا کہنا کیوں نہ کریں۔ اطاعت وفرمانبرداری کیوں نہ کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں زلزلہ آیا۔ آپ نے فرمایا اسکنی یا ارض۔ اے زمین ٹھہر جا۔ زلزلہ موقوف ہوگیا۔

ایک مرتبہ دریائے نیل خشک ہوگیا پہلے بھی خشک ہو جاتا تھا جب خشک ہوتا تھا ہزاروں روپے خرچ کر کے کسی کی نہایت حسین جمیل لڑکی لباس وزیور سے آراستہ کی جاتی تھی اور وہ دریا میں ڈال دی جاتی تھی بس پانی اُبلنے لگتا تھا وہ لڑکی ہلاک ہو جاتی تھی۔ یہ تصرف شیطانی تھا۔ خیر جب دریا خشک ہوگیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اس مقام پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ولایت کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اور یہی قدیمی تدبیر بھی بتلائی۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا بھی نہ کروں گا۔ ہاں امیرالمومنین سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھے دیتا ہوں۔ چنانچہ لکھا۔ آپؓ نے اس کے جواب میں ایک رقعہ دریائے نیل کے نام لکھ کر روانہ کیا کہ،

"اے دریائے نیل اگر تو خدا کے حکم سے جاری ہوتا ہے تو جاری رہ اور اگر تو خود جاری ہوتا ہے تو ہم کو تیری حاجت نہیں"

جس وقت رقعہ پہنچا ہے تو جاہل لوگ ہنستے تھے کہ عقل گئی ہے نیل کو رقعہ لکھ رہے ہیں۔ خیر وہ رقعہ دریا میں ڈالا گیا۔ رقعہ کا دریا میں پڑنا تھا کہ بس اُبلنا شروع ہوگیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب سے پھر کبھی نیل خشک نہیں ہوا۔

تو ع ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(یعنی فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتے ہیں) میں استبعاد (دوری چاہنا) ہی کیا ہے۔

غرض کپڑے میلے بال بکھرے صورت پریشان اللہ کے بندے ایسے ایسے عشاق

ہیں ان پر اعتراض کرنا اپنے کو غضب الہٰی کا مستحق بنانا ہے۔

تو حق تعالیٰ نے،

يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ

(آئیں گے وہ تمہارے پاس پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی) میں دونوں باتیں یعنی زاد سے بھی خالی ہونا اور راحلہ (سواری) سے بھی خالی ہونا منطوقاً و مفہوماً ذکر فرمائی ہے۔ تو ایسا بھی حج ہو سکتا ہے کہ ایک پیسہ بھی نہ خرچ ہو تو حج اس معنی کر عبادت مالی نہیں کہ لا یتحقق الا بالمال (اس کا تحقق مال ہی سے ہوتا ہے) مگر اس معنی کر مالی ہے کہ حج کرنیوالے دو قسم کے لوگ ہیں ایک مکہ والے دوسرے باہر والے۔ باہر والے مکہ والوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر باہر کے آنیوالوں میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں زیادہ وہ ہیں جو سوار ہو کر آتے ہیں اور کم وہ ہیں جو پیادہ آتے ہیں پھر سوار ہو کر آنے والوں میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کی نظر سواری سے مصلحت ظاہری پر ہوتی ہے ——————— دوسرے وہ جو مصلحت باطنی کا لحاظ رکھتے ہیں مصلحت ظاہری تو یہی ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ مصلحت باطنی وہ ہے جو حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو عاشق احسانی ہیں۔ صفات بحت (خالص) کے ساتھ ہمیں محبت کہاں۔ افسوس انسان کے ساتھ تو ہمیں یوں ہی عشق ہو جاتا ہے اور خدا کے ساتھ ہمیں محض اس کے انعام و احسان کی وجہ سے محبت ہو۔ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو صفات بحت کے عاشق ہیں۔ مگر بہت کم ہیں زیادہ احسان ہی کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں کہ منعم کے ساتھ طبعی محبت ہوتی ہے۔ تو اگر حج میں بدون زاد راہ کے گیا اور وہاں ہوئی کلفت تو وہ نام کی محبت بھی زائل ہو جائے گی۔ اس واسطے فرما دیا کہ تزودوا کہ زاد راہ لے کر چلو، تو زیادہ وہ لوگ ہیں جو زادِ راہ لے جاتے ہیں اور یہ مطلوب بھی ہے۔ اس معنی کر حج مرکب ہے بدنی اور مالی سے کہ غالب احوال میں مال بھی خرچ ہوتا ہے گو بدون مال کے بھی ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے اس کی ایک صورت فرض کر چکا ہوں۔ مگر غلبہ کی وجہ سے مرکب کہہ دیا۔

کیا قربانی مرکب عبادت ہے؟

پس فقہاء نے حج کے مرکب ہونے کی تو تصریح فرما دی۔ البتہ قربانی کا مرکب ہونا کسی قول میں نظر سے نہیں گزرا لیکن غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بھی مرکب ہے گو اس میں مالیت کی شان غالب ہو مگر جس طرح باوجود غالبیت بدنیت کے من وجہ تلبس بالمال کے سبب حج کو مرکب کہہ دیا اسی طرح یہاں باوجود غالبیت کے من وجہ تلبس بالبدن کے سبب اس کو بھی مرکب کہنا صحیح ہو سکتا ہے اور اس کا مالی ہونا تو ظاہر ہے مگر بدنی ہونے میں دو حیثیتیں ہیں ایک خفی دوسرے جلی، جلی تو یہ کہ قربانی محض انفاق مال (مال کے خرچ کرنے) سے ادا نہیں ہوتی کہ تین روپے یا کم و بیش اللہ واسطے کسی فقیر کو دے دیتے۔ البتہ اگر اتنی تاخیر کر دے کہ ایام قربانی نکل جائیں تو اس وقت تصدق (صدقہ کرنا) ہی متعین ہے لیکن اول تو اس صورت میں قربانی کی برابر فضیلت نہ ہوگی دوسرے گفتگو اس میں ہے کہ وظیفہ اصلی کیا ہے سو وظیفہ اصلی قربانی کا تو یہی ہے کہ جانور ذبح کرو اور جانور کے ذبح کرنے میں ظاہر ہے کہ اتعاب (تکلیف میں ڈالنا) بدنی ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ زکوٰۃ بھی مرکب ہے کیونکہ ہاتھ سے دینا پڑتا ہے اور اس میں بھی کسی قدر تعب ہے ہی جواب اس کا یہ ہے کہ اگر طبیعت سلیمہ ہے تو سمجھ میں آجاوے گا کہ مال کے خرچ کرنے میں معتد بہ (اعتبار کے قابل) اتعاب بدنی نہیں اور قربانی میں بین اتعاب ہے۔ اسی واسطے ہر شخص سے نہیں ہو سکتی اور دینا تو بچہ بھی کر سکتا ہے۔

دوسری حیثیت کے لئے جو کہ خفی ہے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے، مقدمہ یہ ہے کہ آیا اتعاب بدن من حیث ہو مقصود ہے یا اس وجہ سے کہ نفس پر محنت ہو کر شخص قواعد شرعیہ سے جانتا ہے کہ بدن کو ایذا نفس کی وجہ سے ہوتی ہے اگر نفس نہ ہو تو ایذا بھی نہ ہو۔ باقی یہ شبہ کہ اہل سنت کے نزدیک بعد مفارقت نفس بھی بدن میں حیات باقی رہتی ہے، چنانچہ اسی وجہ سے حدیث میں مردہ کی ہڈی توڑنے کی ممانعت آئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی کا توڑنا مردہ کو محسوس ہوتا ہے اور

اس سے اذیت ہوتی ہے تو بدون تعلق نفس کے بھی بدن کو اذیت ہوئی۔ سو اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی قائل ہو تو ہم کہیں گے کہ مفارقت نہیں پائی گئی تعلق نفس باقی ہے اگرچہ تھوڑا ہی سہی اور تحقیق یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں احساس ہے۔ بلکہ احترام میں مردہ زندہ کے مثل ہے۔ زندہ میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو ہڈی توڑنے سے اس کو ایذا رسانی دوسرے ترکِ احترام تو مردہ کی ہڈی توڑنا اس وجہ سے ناجائز ہے کہ ترک احترام ہے نہ اس وجہ سے کہ اس کو اذیت ہوتی ہے۔

اور فقہاء نے اسے ایسا سمجھا ہے کہ صوفیا نے بھی نہیں سمجھا۔ اور حق یہ ہے کہ صوفیہ نفس کے معالجات اور ان کے نکات خوب بیان کرتے ہیں اور فقہاء اعمال کے اسرار خوب سمجھاتے ہیں۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ زیارت اموات کے وقت قبر سے اتنی دور رہنا چاہیئے جس قدر دورِ حیات میں رہتے تھے۔ بعض لوگ ادب کی وجہ سے بہت دور رہتے ہیں۔ سو اتنا دور بھی نہ رہنا چاہیئے۔ بس فقہاء کے معیار سے کام لینا چاہیئے کہ حیات و موت دونوں میں یکساں معاملہ کیا جائے اور یہ دور رہنا فقط احترام کے سبب سے ہے گو وہ اب مرا ہوا ہے مگر واقع میں ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ؛ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(یعنی جس کو عشقِ حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہو گئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب اس کو کامل درجہ کی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیئے)

پس اسی طرح مردہ کی ہڈی توڑنا منع ہے کہ توڑنے سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی ہاں احترام کے خلاف ہے۔ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اسی قسم کا مسئلہ پوچھا کہ لاش جلانے سے مردہ کو کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ مولانا فقیہ بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔ فرمایا کہ مردہ کو اس سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے تمہیں تمہاری رزائی جلانے میں اور اگر کوئی پرانے گلے سڑے کپڑے کو چیرے پھاڑے تو کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسا ہی یہاں بھی ہے کہ جب بدن پرانا ہو جاتا ہے، گل سڑ جاتا ہے تو پھر اس کے خاک میں

ملنے اور کیڑوں کے کھانے سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔
بس اب یہ مسئلہ بالکل صاف اور اچھی طرح حل ہو گیا تو یہ وجہ تھی مُردہ کی ہڈی توڑنے اور اس کے بدن جلانے کی ممانعت کی۔

اور یہاں سے اسلام کی خوبی ظاہر ہوتی ہے کہ دفن کا حکم دیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام اور احراق (جلانے) میں ترک احترام ہے اور اس کے علاوہ دفن میں ارجاع الی الاصل (اصل کی طرف لوٹنا) بھی ہے۔ اور احراق میں اصل سے عدول ہے۔ بعض مدعین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہو جاتی ہے اور اس سے جو بخارات اُٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے۔ مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر ہمیں بدبو نہیں آتی مگر مرگھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی ایسے مہمل نکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامت فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے بلکہ عقل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا باقی خاک کا اصل ہونا سو اسکی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنے چیز کی طرف طبعی میلان ہے اگر کوئی انسان کوٹھے پر سے اُچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی اور اب تو خاک غالب ہے یا آب اور آب کا غالب نہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا۔ پس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ: کل شئی یرجع الی اصلہ (یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف عود کرتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق اور اس کے ماسوا سب فطرت سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔

باقی احراق کی رسم کیسے نکلی سو ایک بزرگ فرماتے تھے کہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے اور وہ جن تھے سو غالباً ان کے شرائع اور تھے اور انسان کے اور تو ان کے عنصر غالب یعنی نار کا مقتضائے عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے

چونکہ ان میں آگ غالب تھی اس لئے آگ میں ملا دیئے جاتے تھے۔ یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور رہیں گے۔ جہالت اور نادانی سے خدا بچائے۔ یہ اسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے ع چوں اند دیدند چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند (یعنی جب حقیقت کا پتہ نہ چلا قصے کہانیوں پر عمل کرنا شروع کر دیا)

گو یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں مگر قرائن اسی کے مؤید ہیں۔ یہ جملہ معترضہ میں نے اس پر بیان کیا تھا کہ ہڈی توڑنے اور بدن کے جلانے میں تکلیف ہوتی ہے یا نہیں اور اس سے وہ شبہ رفع ہو گیا کہ بعد مفارقت نفس کے بدن کو تکلیف ہوتی ہے اور ثابت ہو گیا کہ بعد مفارقت کے تکلیف نہیں ہوتی۔

رہا یہ کہ مردہ کو قبر میں بٹھلاتے ہیں اور اس سے پھر وہی شبہ عود کر آیا کہ بعد مفارقت روح کے بھی تألم (دکھ پانا) وتنعم (عیش پانا) قبر میں بدن کو ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ وہ روح ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ روح مجرد جلوس کے ساتھ کیسے متصف ہو سکتی ہے سو اول تو ابھی تک یہ امر طے نہیں ہوا کہ روح مجرد ہے یا مادی ہے بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ تجرد خواص واجب سے ہے لیکن یہ دعویٰ خود بے دلیل ہے بلکہ خواص واجب سے قدم اور وجوب ہے سو حکماء مجردات کے قائل ہوئے ہیں وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں یہ بیشک باطل ہے۔ باقی اگر روح کو مجرد کہا جائے اور حادث بالذات و بالزمان بھی مانا جائے تو کون سی دلیل عقلی کے خلاف ہے۔

غرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کے کسی چیز کے مجرد ہونے کے قائل نہیں۔ اور صوفیہ کرام کئی چیزوں کے تجرد کے قائل ہوئے ان کو لطائف کہتے ہیں جیسے روح، قلب، سر، خفی، اخفی اور کہتے ہیں کہ انسان جس طرح عناصر سے مرکب ہے۔ اسی طرح ان اجزائے مجردہ سے بھی ہے۔ اور اس پر دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے خلوات و مراقبات میں ان مجردات کا مشاہدہ کیا ہے۔ سو جب تک قرآن و

حدیث کے خلاف نہ ہو ہم کیونکر اس کا انکار کر سکتے ہیں۔ تو اگر روح مجرد ہے تو اس پر البتہ جیسا صادق نہیں آتا مگر صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ دوسرا بدن جو مشابہ اسی بدن عنصر کے ہوتا ہے عالم برزخ میں دیا جاتا ہے تو جس طرح یہ حسی تھا وہ بھی حسی ہے سب عذاب و ثواب اس پر ہوتا ہے اور اس بدن کی طرح اُسے بھی حس ہوتی ہے بلکہ اس سے زیادہ حس ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے تو بجلسانہ (یعنی منکر نکیر مُردہ کو بٹھاتے ہیں) اسی کے لئے ہے اور اگر روح مادی ہے تو بجلسانہ میں کوئی اشکال نہیں بہر حال بجلسانہ اس بدن عنصری کے لئے نہیں پس شبہ تاذی (تکلیف پانا) بدن عنصری کا بعد مفارقت روح کے ساقط ہو گیا۔

تو حاصل یہ کہ یہ امر ثابت رہا کہ جب بدن کو تعذیب ہو گا ملابست (ملنے) نفس کی وجہ سے ہو گا کیونکہ نفس جب مفارق (جدا) ہو جاتا ہے تو کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو ثابت ہو گیا کہ بدن کو تکلیف نفس کو تکلیف ہونے سے ہوتی ہے۔ پس اتعاب (تکلیف میں ڈالنا) بدن کی اصل اور حقیقت اتعاب نفس ہوا پس اگر ہم قربانی میں اتعاب نفس ثابت کر دیں تب تو اس میں عبادت بدنیہ کے معنی ثابت ہو جاویں گے۔ سو قربانی میں اتعاب نفس موجود ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رقت فطریہ مشارک فی الجنس (فطری رقت جنس میں شریک) پر بھی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات اس قدر ہوتی ہے کہ مشارک فی النوع پر بھی اتنی نہیں ہوتی۔ کیونکہ مشارک فی النوع (یعنی نوع میں شریک ہونے والے) سے کہ انسان ہے بسا اوقات اتنی کلفتیں پہنچ جاتی ہیں کہ رقت کیسی بالعکس اس کے گلے پر چھری پھیرنے سے اور مسرت ہوتی ہے مگر چونکہ مشارک فی الجنس سے اس قسم کی اذیتیں نہیں پہنچ سکتیں جس سے انتقام کی آگ اس قدر بھڑک اُٹھے کہ بغیر اس کے خون کے چھینٹوں کے نہ بجھے۔ اور اگر اس سے کوئی اذیت پہنچتی بھی ہے تو ہر شخص اسے ایک درجہ میں معذور بھی سمجھتا ہے اس لئے مشارک فی الجنس پر رقت زیادہ ہوتی ہے اور اگر زیادہ نہ سہی تو برابر تو ہوتی ہے۔ برابر بھی نہ سہی کم ہی سہی مگر وہ کم بھی فی نفسہ بہت ہے کسی کتے بلی کو سسکتے دیکھا نہیں جاتا بہت

ہی رحم آتا ہے۔

تو اب سمجھ لیجئے کہ جس وقت جانور کے گلے پر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کے چھری پھیرتے ہیں تو کیا دل نہیں دکھتا۔ بہت دل دکھتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اسی وجہ سے اپنے ہاتھ سے ذبح بھی نہیں کر سکتے۔

سنگدلی کا شبہ

اب دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں جانور کے گلے پر چھری پھیرتے ذرا بھی رحم نہیں آتا محض ناواقفی یا تعنت سے ناشی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے، جو ہے، بکری، مرغی، کبوتر کے متعلق نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ دال میں کالا ہے یعنی اس شبہ کا سبب ترحم نہیں ہے بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے متعلق یہی الزام دے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُسے کیا خبر کہ مسلمان نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل۔ پس ان کا اعتراض اگرچہ حمیت مذہب سے نہیں لیکن ناواقفی سے ضرور ہے، پس اس کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے۔

مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے ہمارے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں پہنچتے ہیں لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی محض الزام و اسکات اخاموش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا القاء ہوتا ہے۔ سو الحمدللہ حق تعالیٰ نے اسوقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انہیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمان ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ کڑھتا ہے یا نہیں۔ بعض موجود بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر یہ کیا بات ہے تو رحم اور کسے کہتے ہیں۔

قوۃ عدل

لیکن اس کے ساتھ بڑا کمال مسلمانوں کا قوت عدل ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔

(اور ہم نے تم کو ایسی ایک جماعت بنا دی ہے جو ہر پہلو سے نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم مخالف لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو اور تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں)

وسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہے قوت علمیہ وعملیہ دونوں میں کہ جز بزہ و بلاہت کے وسط میں حکمت جبن وتہور کے وسط میں شجاعت ۔ اسی طرح قوت شہویہ خمود وفجور میں توسط عفت ہے اور ان تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت، شجاعت، عفت کا نام عدل ہے ۔ تو یہ امت عادلہ ہے ۔ حق تعالیٰ نے احکام بھی ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے دُرست ہو جائے نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا بڑا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھُری بھی پھیرتے ہیں ۔ مگر یہ سمجھ کر کہ ؏

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

(جو جان دینے والے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اگر وہ مار ڈالیں تو جائز ہے) اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو نہیں مارا تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں ؏

نائب است او دست او دست خداست

(یعنی وہ خدا کا نائب ہے اس کا فعل مثل خدا کے فعل کے ہے)

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہو وہ لے سکتا ہے ہم اسی کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا اس لئے ہم نے چھُری پھیر دی باقی ہم نے جان نہیں نکالی ۔ ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا جان تو انہوں نے نکالی اب کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ بڑے سنگ دل ہوتے ہیں ۔ آپ بڑے رحمدل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلہ میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ ماریں ۔ جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے اگر گاؤ کشی میں ہمیں اپنا نائب بنا دیا تو کیا قباحت

ہو گئی ۔ اللہ کی نیابت میں یہ نفع بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ ۔ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینک دینا ہی ہے ، اور کچھ بھی نہیں ۔ سبحان اللہ یہ رحمدلی ہے کہ ہم سے نہیں مارے جاتے تم مار دو ۔ نیابت اور کسے کہتے ہیں یہ تو زبان سے کہنے سے بھی بڑھ کر ہے ، اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا ۔ کیونکہ یہ کس کو غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دکانوں پر چوہے مارنے جاتا ۔ مگر ان کے گھر لا کر چھوڑ دیئے کہ اچھی طرح ان کو مار سکیں ۔

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی کی ایک بے حیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے ۔ حیا کی وجہ سے منہ سے تو کہہ نہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھا کر اس کے سامنے موتا اور اس پر سے پھاند گئی ۔ مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے ۔

تو حضرت بعضا ترحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے ۔ کسی نے زنا کیا حمل رہ گیا رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا کہ کمبخت تو نے عزل کیوں نہ کر لیا (عزل انزال سے پہلے علیحدہ ہونے کو کہتے ہیں) تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزل مکروہ ہے ۔ کمبخت منحوس اور زنا کو کون سا فرض سنا تھا ۔

بعضوں کا تقدس بھی ایسا ہی ہوتا ہے ۔ تو یہ ترحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو حیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں حیا نہ تھی ۔ اور پھر مسلمانوں پر اعتراض ۔ حضرت میں بقسم کہتا ہوں کہ ترحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم کے اندر نہیں ہے ۔ مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے ۔ کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

دنیا کر تسم کہے کہ تو میر الہوئیے ۔ گر پی نہ جائیے جلدی سے پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو ۔ گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام ۔ قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ ترحم کے موقعوں پر ترحم

کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحمدل نہیں۔
میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ
جیو مارتے ہیں مثلاً گاؤ کشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیو گا نہیں مارتے (جیو گا آدمی
کے نفس کو کہتے ہیں) انگریز معترض قوم جیو گا مارتی ہے۔ یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے
مجھے اس شخص کا قول نقل کرنے سے فقط یہ مقصود ہے ع
الحق ما شھدت بہ الاعداء (حق وہ ہے جس کی دشمن بھی شہادت
دے دیں یعنی ع جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کے بولے۔
اب تو کئی شہادتیں ہوگئیں کہ مسلمان بڑے رحمدل ہوتے ہیں۔ بہرحال انکی
رحمدلی ثابت ہوگئی تو اب ذبح میں کتنا بڑا اتعاب نفس ہوا جو حقیقت ہے۔
اتعاب بدن کی تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ قربانی میں بدنیۃ بھی ہے مگر مغلوب اور
مالیت غالب جیسا کہ حج میں مالیۃ بھی ہے مگر مغلوب اور بدنیۃ غالب یہ بیان ہوگیا
قربانی کے عبادت بدنیہ ہونے کی دونوں وجہوں کا۔

بدلِ قربانی

اور ان کے علاوہ ایک تیسری وجہ اس سے بھی لطیف ہے وہ یہ
کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ قربانی بدل کاہے کی ہے۔ اعتبار اس اصل کا
ہوگا۔ جیسے میں نے ابھی بیان کیا تھا کہ اصل قربانی ہے اور بعد ایام نحر (قربانی کے
دنوں) کے اس کا بدل یعنی قیمت دینا اس کا قائم مقام ہے پھر بدل پر بھی وہی آثار مرتب
ہو جاتے ہیں جو اصل پر ہو جاتے ہیں یہ سو واقع میں قربانی بھی اصل نہیں یہ بھی کسی چیز
کا بدل ہے اور اس کی بھی کوئی اور ہی اصل ہے۔ سو وہ اصل وہی ہے جو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضؓ کے جواب میں ارشاد فرمائی۔
قالوا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ؟ قال سنۃ ابیکم ابراھیم؛
صحابہ رضؓ نے استفسار کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کیا چیز ہے؟ آپؐ نے
فرمایا تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔

فرزند کی قربانی

اب اس کی تحقیق سمجھو کہ ابراہیمؑ کا طریقہ کیا تھا انہوں
نے کون سا فعل کیا تھا سو اگر انہوں نے ایک دُنبہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس توجیہ سے میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے۔ کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے ؂

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است ؛ بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

(یعنی جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان ناتمام سے مستغنی ہے۔ جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خط و خال کی احتیاج نہیں)

ناتمام اس معنی کر کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی نور محمدی کے جدا ہو جانے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض خرافات تخمینی) اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا وہ نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے۔ آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا کہ اس کے منتقل ہونے کے بعد ابدالآباد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں جو ان خرافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔

اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسمٰعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سو شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ:

(اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے) اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں انشاء اللہ کہ اگر خدا کو منظور ہوا بس یہی تو کمال ہے ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں ؂

شاباش آں صدف گہر خیال پرور د گہر ؛ آباد از و کرم و ابناء یزتر

(یعنی اس صدف کو آفرین جس نے ایسے موتی کو پرورش کیا۔ اب اس سے مکرم اور

لڑکا عزیز ہے، تو یہ بھی اس کی اصل، چنانچہ اسمٰعیل علیہ السلام راضی ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کے لئے لٹایا۔ اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نہیں، بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خودکشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا ہوگا مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے بھلا باپ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے والنادر کالمعدوم (نادر معدوم کی مثال ہے) اب بتلائیے استقلال کس کا بڑھا ہوا ہے ایک محل عبارت فانظر ما ذا ترٰی (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) سے یہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا کتنی بڑی غلطی ہے اگر نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جُدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے تو اچھا پھر وہ چھری چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ مفارقت بدن ابراہیمی کے بعد ویسا ہی نور بخش دیا تھا جیسا کہ مفارقت ناسوت کے بعد بھی ناسوت کے لئے نور بخش ہو رہا ہے۔

جن انوار کا مشاہدہ آپ کر رہے ہیں اس پر ایک لطیفہ یاد آیا جس میں اس منوریت ناسوت سے ایک دوسرے مذہب کے شخص نے ایک لطیف استدلال کیا تھا وہ قصہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کی مجلس میں رات کو دفعۃً ساری شمعیں گل ہو گئیں اور مجلس میں بالکل اندھیرا ہو گیا گو یہ بادشاہ دہری سا تھا مگر اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ اس اندھیرے کو دیکھ کر قبر کا اندھیرا یاد آ گیا، طبیعت بہت پریشان ہوئی، حکم دیا کہ بیربل کو بلاؤ۔ بیربل حاضر ہوا اس سے اپنی پریشانی بیان کی اس نے تسلی کے لئے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ع الفضل ما شھدت بہ الاعداء

(فضیلت وہی ہے جس کی دشمن بھی شہادت دے دیں) کہتا ہے کہ حضور اس کا ہرگز غم نہ کریں، مسلمان کی قبر میں اندھیرا ہوتا ہی نہیں کیونکہ آپ امتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، جب تک آپ اس عالم میں رہے یہاں روشنی رہی تمام عالم منور رہا جس کا اثر اب تک باقی ہے، جب سے عالم قبر میں تشریف لے گئے

وہاں بھی آپ کا نور پھیل گیا جس سے مسلمانوں کی سب قبریں منور رہیں۔
تو مسلمانوں کے لئے نہ یہاں اندھیرا ہے نہ وہاں۔ اکبر بہت خوش ہوا فوراً حکم ہوا کہ بیربل کو انعام دیا جائے۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا قوی نور ہے اور ہم اس کے ثابت کرنے کے لئے اس نکتہ کے محتاج نہ تھے مگر لطیفے کے طور پر ذکر کر دیا۔
بہر حال یہ ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے تو اپنی طرف سے بیٹے کو ذبح کیا تھا، پھر خواہ ذبح کوئی چیز ہو گئی۔

روحِ حج و قربانی

تو اصل قربانی کی بیٹے کو ذبح کرنا ہے کہ جو اپنے ذبح سے بھی اشد ہے اور یہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ اشد اخف کو متضمن ہوتا ہے۔ تو روح قربانی کی اپنا فدا کرنا اور اپنی قربانی کرنا ٹھہرا جس کی نسبت دوسری جگہ ارشاد ہے کہ اگر ہم یہ فرض کر دیتے کہ:

اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ۔

خودکشی کیا کرو یا شہر بدر ہو جایا کرو تو بہت کم لوگ کرتے اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی ایسی چیز ہے کہ اس میں مشروعیت کی صلاحیت تھی چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت مشروع ہوئی اور انہوں نے اس کو کیا مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ فوراً ہی ایک عنایت کا ظہور ہوا، چنانچہ فرماتے ہیں: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا)۔
ذبح عظیم کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فوراً ایک دنبہ وہاں پر رکھ دیا گیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اسے ذبح کر دیا۔ تو ابراہیم علیہ السلام کے دین میں قربانی مشروع ہوئی تھی، انہیں کے موافقت میں اس دین میں بھی مشروع ہوئی۔ تو اصل قربانی کی اپنے نفس کو فدا کر دینا ہے اور اعتبار اصل کا ہوا کرتا ہے۔ اب تو اس اصل کے اعتبار سے قربانی نری عبادت بدنیہ ہوئی۔ اب مالیت کا پہلو مغلوب ہو گیا، اور بدنیہ کا پہلو غالب ہو گیا۔ بہر حال یہ بھی مرکب ہوئی تو حج و قربانی کے درمیان میں

ایک مابہ الاشتراک وہ چیز جس کی وجہ سے اشتراک ہے، یہ بھی نکل آیا اور اس وجہ سے تشارک کے بیان کے ضمن میں اتفاقاً" قربانی کی روح بھی مذکور ہو گئی جس کو بعد میں ذکر کرنے کا ارادہ تھا اور چونکہ ابھی متعدد وجوہ سے دونوں میں اشتراک ثابت ہو چکا ہے اسی مناسبت سے سمجھ لینا چاہیئے کہ یہی فدا و فنا روح حج کی بھی ہے۔ تو گویا یہ دونوں عمل ایک جان دو قالب ہوئے تو روح دونوں کی کیا ہوئی اپنے کو فدا کرنا حق تعالیٰ کی راہ میں اہلِ ظاہر اس کو فدا کہتے ہیں۔ اور اھلِ معرفت اپنی اصطلاح میں فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور انہوں نے اس پر ایک ثمرہ بھی مرتب کیا ہے جس کو وہ بقا کہتے ہیں اور یہی بقاء انفاق مالی کی روح ہے جو اتفاق سے روح حج و روح قربانی کے ساتھ ذکر میں آگئی۔

حج و قربانی میں فنائیت

اب یہ بات رہی کہ فنا کی حقیقت کیا ہے اور حج و قربانی میں فنا کیسے ہے سو صوفیہ کے نزدیک فنا کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے ارادات اپنی خواہشیں اور ہوائے نفسانی بالکل ترک کر دے اس واسطے کہ حیات کے آثار میں سے یہی چیزیں تو ہیں حی اور غیر حی میں صرف یہی فرق ہے کہ حی احساس متحرک بالارادہ ارادہ سے حرکت کرنیوالا ہے سو جب اپنا ارادہ دوسرے کے تابع کر دیا تو گو لغۃً" وہ صاحب ارادہ ہے مگر اس معنی کر یہ غیر متحرک بالارادہ ہے کہ اس کو حرکت جب ہو گی جب دوسرے کا ارادہ دیکھ لے گا تو اب وہ متحرک بالا ارادہ نہیں رہا۔ مثلاً" ہمارا ارادہ دوڑ کا ہوا۔ سوچا کہ حق تعالیٰ کا ارادہ تشریعیہ ہمارے دوڑنے کے متعلق ہے یا نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارادہ دو قسم کا ہے ایک تشریعیہ دوسرے تکوینیہ۔ تکوینیہ تو وہ ہے کہ اس سے کسی وقت اور کوئی شے خالی نہیں۔ خیر و شر سب اسی کی ایجاد سے ہوتا ہے۔ سو اس مرتبہ میں تو کوئی بھی صاحب ارادہ نہیں مگر اس سے یہاں اس لئے بحث نہیں کہ اس کا تابع ہونا امر اضطراری ہے اختیاری و مطلوب و کمال نہیں۔ اور ایک ارادہ تشریعیہ ہے کہ عبد سے اس کے

موافق بھی فعل ہو سکتا ہے اور خلاف بھی۔

اور یہاں سے ایک شبہ بھی حل ہو گیا کہ؟

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)

شبہ یہ ہے کہ بہت سے دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اگر یہ عسر بارادہ ادشواری حق ہے تو نص مذکور کے خلاف ہے کہ مثلاً

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ

(یعنی آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کر دوں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے)

جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یُرِیدُ سے مراد ارادہ تشریعیہ ہے یعنی حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ مشکل احکام مشروع کریں بلکہ آسان آسان احکام مشروع کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہیں کوئی حکم شریعت کا مشکل بتلا تو دو۔ کہیں نہیں۔ بہر حال یہ مراد ہے ارادہ سے۔ سو مادہ مذکور سے اس پر نقص لازم نہیں آیا اور اس ارادہ تشریعیہ کا اتباع کمال اور مطلوب ہے۔ مثلاً ہم نے جس وقت اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تو ہم نے شریعت سے پوچھا۔ اور معلوم ہوا کہ ارادہ تشریعیہ اس کے متعلق ہے تب اٹھیں گے اسی طرح کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا چاہا تو شریعت سے پوچھا هل یجوز ام لا (کیا جائز ہے یا نہیں) جواب ملا لا یجوز (نہیں جائز) فوراً آنکھ نیچی کر لی۔ تو جب اپنا ارادہ کیا تھا۔ مگر اس پر عمل بغیر اجازت کے نہیں ہوا تو وہ متحرک بالارادہ کیا ہوا تو ثابت ہو گیا کہ متحرک بالارادہ نہیں ہے۔

رہا حس سو غلبۂ اطاعت شریعت سے جس میں ارادہ کا فنا مذکور ہوا ہے جس میں بھی ایک انقلاب ہوتا ہے جس سے حس سابق کالباطل و کالزائل دمثل باطل کے اور مثل زائل کے) ہو جاتی ہے۔

اور صورت اسکی یہ ہے کہ ہر چند کہ اصل میں اعمال تابع علوم کے ہوتے ہیں لیکن

بعد رسوخ ملکہ کے علوم تابع اعمال کے ہو جاتے ہیں یعنی اعمال کے تمرن (عادی ہونے) سے ادراکات میں بھی ایک انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلے نماز پڑھنا مشکل معلوم ہوتا تھا آج آسان معلوم ہوتا ہے تو یہ تفاوت ادراک میں ہوا اور حس کے اندر تفاوت ہونے کا یہ مطلب ہے۔ یہ نہیں کہ سوئی چبھے اور معلوم نہ ہو۔ پس ارادہ اور حس دونوں اس طرح سے فنا ہو گئے اس واسطے حساس متحرک بالارادہ نہ رہا۔ پس یہ شخص گو حساً حی ہے مگر حکماً میت ہے۔ جس طرح عضو مفلوج (جو فالج میں مبتلا ہو) کو حکماً مردہ کہتے ہیں گو حقیقت میں وہ مردہ نہیں اس کے ساتھ تعلق حیات کا ہے ورنہ یہ عضو سڑ گل کیوں نہیں جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں حیات ہے مگر کان لم یکن (گویا کہ ہے نہیں) محاورہ میں بھی بولتے ہیں کہ کھال مر گئی۔ تو صوفیہ کا مطلب یہ نہیں کہ حیات کا تعلق بالکل نہیں رہا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس شخص پر بہت سے آثار میت کے مرتب ہوتے ہیں۔
پھر آگے اس کے مراتب ہیں فنائے علمی۔ فنائے حسی۔ سو ان سے اس وقت بحث نہیں۔ پس یہ حقیقت فنا کی ہے سو یہ بات حج و قربانی میں مختلف وجوہ سے پائی جاتی ہے۔ قربانی میں تو ظاہر ہے افناء (فنا کرنا) حس تو یہ اس طرح کہ یہ اصل میں افناء بدن تھا جس کے لوازم میں سے افناء حس بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے افناء بدن کے عوض بدنہ (مینڈھے کو ذبح کرنا) کو مشروع کر دیا اور افناء ارادہ (ارادہ کا فنا کرنا) اس طرح کہ باوجودیکہ نفس کے اندر مادہ ترحم کا تھا مگر اس کو حکم تشریعی سے مغلوب کر کے ذبح کرتا ہے اور اس طرف کے اس ارادہ تشریعیہ کو اتنا غالب کیا کہ ارادہ متعلقہ بالایجاب کو تو کیا ارادہ متعلقہ بالاستحباب کو بھی پورا کرتا ہے تو گویا افناء ہوا اپنے ارادہ کا اور احساس کا۔

اور حج میں یہ معنی بظاہر خفی ہیں مگر بغور جلی (ظاہر، بلکہ اجلی (زیادہ ظاہر) ہیں اس میں تو اول سے آخر تک افناء ہی افناء ہے اور شروع سے آخر تک مردہ ہی مردہ ہے کہ سر نہیں اٹھا سکتا اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ تمام جذبات فنا کر دیئے کہ خوشبو مت لگاؤ۔ سئے ہوئے کپڑے مت پہنو۔ بیوی سے دل مت بہلاؤ شکار مت کرو

نہاؤ مت رمیل کچیل مت صاف کرو خوشبودار کھانا مت کھاؤ۔ ایک بات ہو تو کہا جائے۔

اور اس میں فنا کے معنی ایک مقدمہ سے بہت سہولت سے سمجھ میں آجائیں گے ارادہ موقوف ہے تصور غایت پر، اور غایت کا تصور عقل سے ہوتا ہے تو اول ادراک بالعقل (عقل سے جاننا) ہوتا ہے اس کے بعد پھر قوت ارادیہ حرکت دیتی ہے اعصاب کو۔

جب یہ مقدمہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھیے کہ اگر کسی جگہ ایسی حرکت کا ارادہ ہو جو عقل کے موافق نہیں تو اس کو یوں کہیں گے کہ یہ کسی دوسرے ارادہ کے تابع ہے بشرطیکہ جنون نہ ہو کیونکہ اگر اپنا ارادہ ہوتا تو وہ تابع ہوتا اپنی عقل کے ادراک کے اور یہاں اپنی عقل نے اسکی موافقت نہیں کی پس ضرور وہ فعل دوسرے کے ارادہ سے ہوا۔ تو یہاں وہ معنی فنا کے زیادہ تام ہیں وہاں تو ایک ہی بات تھی کہ خلاف ترحم تھا لیکن پھر بھی عقل فتویٰ دیتی ہے کہ کھانے کھلانے کی ضرورت سے ذبح جائز ہے تو وہاں استحسان عقلی بھی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ذبح کو عقلاً مستحسن ثابت کرنا چاہا ہے انہوں نے اس طرح استدلال بھی کیا ہے کہ اگر ذبح نہ کریں تو جانور چند روز کے بعد بوڑھا ہو جائے گا اور پھر بالکل معذور ہو کر مرے گا۔ اس سے انسان کو بھی تکلیف ہوگی کہ وہ تھا تو مخدوم مگر اب جانور کے بڑھاپے اور معذوری میں اسکی خدمت کرنی پڑے گی اور یہ بالکل قلب موضوع ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ وہ وقت آنے سے پہلے ہی اس کو کام میں لے آؤ۔ تاکہ انسان خادمیت سے اور جانور بڑھاپے اور معذوری کی تکلیف سے محفوظ رہے تو انہوں نے اس طرح استحسان عقلی ثابت کیا جزاھم اللہ تعالیٰ[1] مگر جج میں عجیب پیچ ہے کہ کوئی اس پر آج تک قادر نہیں ہوا، کہ اس کو عقل کے موافق ثابت کر سکے۔ پس یہاں پورا پورا فنا ہے کہ باوجود مزاحمت عقل کے پھر اس کا ارادہ کیا اور اپنے کو بالکل دوسرے کے ارادے کے تابع کر دیا۔

---

[1] اللہ تعالیٰ انکو جزائے خیر دے

رشتہ در گردنم افگندہ دوست ٭ مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کردیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کردیتے ہیں۔

عاشقانہ افعال سنئے حج میں افعال کیا ہیں کہ سارے عقل کے خلاف ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اچھے خاصے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے اپنے اہل وعیال میں آرام سے بیٹھے ہوئے ایک کوٹھری اور جنگل کا قصد کرکے جاؤ اگر وہاں اللہ میاں ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ مگر وہ تو مکان سے منزّہ ہیں تو پھر کیوں ایسا کرتے ہو۔ سو آج تک عقل چکر میں ہے۔

میرے بھائی سے ایک آریہ نے کہا کہ ہمارے مذہب میں یہ خوبی ہے کہ اسکی ہر تعلیم عقل کے موافق ہے اور تمہارے یہاں یہ بات نہیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب صحیح ہے بھائی نے کہا یہی دلیل ہے اس کی کہ ہمارا مذہب سماوی ہے اور تمہارا ارضی۔ دیکھو بہت سی باتیں اپنے خانگی انتظام کے متعلق ایسی ہوتی ہیں کہ ہم تم تو سمجھتے ہیں مگر ہمارے نوکر نہیں سمجھتے اس واسطے کہ ہماری عقل انکی عقل سے بالاتر ہے۔ اسی طرح خدائی احکام کی یہی علامت ہے کہ کہیں ہماری سمجھ میں آویں اور کہیں نہ سمجھ میں آویں ——— اور جب تمہاری سب مذہبی تعلیمات عقل کے موافق ہیں تو معلوم ہوا تمہیں جیسوں نے اس کو اپنی عقل وذہانت سے گھڑ لیا ہے آسمانی نہیں ہے۔ واقعی خوب لطیفہ ہے۔

غرض حج میں سب سے اول تو عقل کو دُور کر دیا گیا ہے۔ پہلے ہماری سواری اس پر تھی مگر یہ رہبری کہاں تک کرسکتی تھی۔ آخر ایک حد پر پہنچ کر اس سواری کو چھوڑ دیا۔ عقل کی مثال بالکل گھوڑے کی سی ہے کہ ایک پہاڑ ہے۔ بالکل سیدھا چلا گیا ہے نہ ڈھلوان ہے کہ سواری پر جاسکیں نہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ ہے تو گھوڑے پر وہیں تک جاسکتے ہیں جہاں تک میدان ہے آگے جہاں سے پہاڑ شروع ہوتا ہے وہاں گھوڑا نہیں جاسکتا اب کاہے کی ضرورت ہے۔ یا تو غبارہ کام دے سکتا ہے یا کمند کام دے سکتی ہے۔ بس آپ کی عقل مرکب ہے جہاں پہاڑ آیا رک گئی۔

تو احکام حج مشابہ پہاڑ کے ہیں عقل بیچاری ان میں کہاں عبور کر سکتی ہے۔ چنانچہ عقل چکر میں ہے کہ اس کوٹھڑی تک اسطرح جانے کی کیا ضرورت ہے اس کے بعد عرفات ایک میدان ہے وہاں جانے سے کیا فائدہ۔ پھر سات کنکریاں لے کر تین پر مارنا یہ بھی خلاف عقل ہے، شیطان وہاں بیٹھا نہیں جسے مارتے ہو۔

ایک بزرگ سہارنپور کے رہنے والے کہتے تھے کہ ہم نے ایک شخص کو دیکھا کہ جمرہ پر دھوڑی کا ایک بڑا سا جوتا مار رہا تھا اور شیطان کو خطاب کر کے یہ کہتا جاتا تھا ارے کمبخت اے خبیث تو نے فلاں دن فلاں حرکت کرائی تھی۔ جب اسے ایک بات یاد آئی ادھر ایک جوتا دیا، حالانکہ یہ حرکت بھی شیطان ہی کی تھی، کسی نے کہا اسے یہ کیا جہالت ہے، تو کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تم اس کے طرف دار ہو، ادھر میری طرف آؤ تو تمہیں بھی بتا دوں، پھر بھلا کہنے کی کسی کو کیا غرض تھی۔ بعض بعض سپاہیوں کو میں نے سنا ہے کہ گولی مارتے ہیں، اب وہاں شیطان کہاں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے اس سے تکلیف ہوتی ہے تو جب ان کاموں کے ارادے سے چلے تو۔ اوّل تو یہ چلنا ہی خلافِ عقل تھا، مگر اس شخص نے عقل کو گردن پکڑ کے گھر پر باندھ دیا۔ اور چل کھڑا ہوا۔ اب عقلاء نے ملامت شروع کی کہ کہاں جاتے ہو بیچ میں اتنا بڑا سمندر حائل ہے۔

ایک شخص بنارس کے رہنے والے حج کے ارادے سے بمبئی آئے سمندر کو دیکھا تو کہنے لگے ارے بھائی اس میں سے سفر ہوگا۔ اس میں سے جانا تو بہت دشوار ہے۔ بس لوٹ گئے۔ واقعی ہے بھی بحرِ ناپیدا کنار۔ تاجروں کا کیا ہے اگر یہ ہمت کریں تو کیا کمال وہاں تو نقد ملتا ہے۔ کمال حجاج کا ہے کہ ادھار ہے مگر پھر بھی ہمت کرتے ہیں۔ ہر طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اتنا بڑا سمندر پھر بڑے بڑے پہاڑ، لق و دق میدان عبور کر کے وہاں پہنچنا پڑتا ہے۔

زبان کا مسئلہ پھر وہاں کی زبان اجنبی، نہ کسی کی سمجھیں نہ کوئی ان کی سمجھے ہمارے ایک عزیز تھے ان سے بدوی نے روٹی مانگی۔

اُنہوں نے انکار کر دیا۔ جب آگے پہاڑ آیا تو اس نے وزن برابر کرنے کے لئے اُن سے کہا گدّام گدّام اُقدام قدّام یعنی آگے بڑھ کے بیٹھو۔ یہ سمجھے کہ روٹی نہ دینے سے ناخوش ہو گیا ہے اس لئے مجھے گالیاں دے رہا ہے اور گدّام گدّام کہہ رہا ہے یہ سمجھ کر اس سے لڑنے لگے جب اس نے اشارے سے کہا تو سمجھ گئے پھر آگے بڑھ کر بیٹھے۔

اور لیجئے ایک حاجی کو پیشاب لگا انہوں نے کہا موتوں۔ تو بدوی سمجھا مجھے کوستا ہے کہ مُوتُوْا یعنی مرجاؤ اس نے کہا لَا اَمُوْتُ یعنی میں نہیں مروں گا۔ یہ سمجھے کہ کہتا ہے مت موتو۔ یہ کہتے ہیں موتوں وہ کہتا ہے لَا اَمُوْتُ۔ بڑی دیر یہی گفتگو رہی ایک مصیبت پڑ گئی۔

ایک دیگچی کسی بڑھیا نے پائی تھی۔ پوچھتی پھرتی تھی کہ کس کی ہے، ایک بدوی کی تھی اس نے کہا ہگی ہگی (حقی حقی) یعنی میری ہے۔ بڑھیا یہ سمجھی کہ کہتا ہے تو نے اس میں ہگا ہے، تو کیا کہتی ہے اللہ کی قسم میں نے اس میں کبھی نہیں ہگا۔ تو غرض یہ لطف اور یہ تماشے ہوتے ہیں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ لوگ صرف عربی ہی بولیں اُردو بھی بولتے ہیں مگر وہ بھی عجیب، سنئے، جب شغدف اونٹ پر رکھتے ہیں تو اونٹ پر رکھنے کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک اونٹ والا ہوتا ہے دوسرا وہ حاجی جس نے کرایہ کیا ہے، شغدف کے اُٹھانے کے واسطے کہنا تو یہ چاہیے آگے سے اٹھا مگر کہتے ہیں کہ آگے بیٹو آگے بیٹو۔ بعضے لوگ بیٹھنے لگتے ہیں، اس پر خوب لڑائی ہوتی ہے۔

اور لیجئے مردوں کو بی بی کہہ کر پکارتے ہیں۔ بازار والے کہتے ہیں۔ بی بی رُتی دردتی (بی بی روٹی) اور بی بی کی سمجھ میں نہ روتی آتی ہے نہ ہنستی۔ جیسی یہ اردو بولتے ہیں ہمارے ہندوستانی عربی بھی بولتے ہیں۔

ہمارے ایک رفیق ساری بات تو اُردو میں کہہ دیتے — اور سب کے اخیر میں ہذا بڑھا دیتے، ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پوتے مقصود نام تھا وہاں

ان کو عربی سکھلائی گئی۔ بتایا گیا کہ جب کسی سودے کا نرخ دریافت کرتے ہیں تو کہتے ہیں یا عم ھذا بکم (اے چچا اسکی کیا قیمت ہے) اب وہ بیچارے رٹ رہے ہیں یاد کر رہے ہیں۔ اب بازار گئے وہاں اس سے پوچھتے ہیں یا عَمُّ اَنْتَ بِکَمْ (اے چچا تمہاری کیا قیمت ہے) اب لوگ ہنستے ہیں سمجھ گئے کہ ھذا کی جگہ اَنْتَ کہہ رہے ہیں غرض بڑی دل لگیاں رہتی ہیں۔ گھومنے چلتے ہیں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے عقلاء کہتے ہیں ایسی جگہ کہاں چلے۔

کیفیت آغاز سفر جب میں والد صاحب مرحوم کے ساتھ حج کو چلا تو چھوٹی عمر تھی ایک خط میرے پاس آیا کہ اخبار کی خبر ہے کہ سمندر میں تلاطم و طوفان ہے اس حالت میں کہاں جاتے ہو میں نے جواب میں لکھا کہ ؎

چہ غم دیوار امت را کہ دارد چو تو پشتیبان ٭ چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیبان

(امتیوں کو کیا غم ہے جب کہ آپ جیسا اُن کا معاون و مددگار ہے سمندر کے طوفان سے اس کو کیا خوف جس کا کشتیباں نوحؑ ہے)

اور اس قدر دل بے فکر تھا کہ نہ مرنے کا غم نہ تکلیف کا اندیشہ۔ دل کو عجیب اطمینان تھا۔ غازی آباد کے اسٹیشن پر ایک تحصیلدار والد صاحب کو ملے کہنے لگے کہاں چلے بڑا طوفان ہے۔ والد صاحب نے فرمایا معاف کیجئے اور بلسان حال یہ کہا ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ ٭ وھوا الاحبۃ منہ فی سودائہ

(ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے اور دوستوں کی محبت سودائے قلب ہے)

تجربہ کی بات ہے کہ جب ارادہ کر لیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے ؎

نسازد عشق را کنج سلامت ٭ خوشا رسوائی کوئے ملامت

(یعنی عشق کو گوشۂ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب کوچۂ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

کچھ بھی پرواہ نہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہیں سمجھتے آجکل مثال کو دلیل سمجھتے ہیں۔ بہر حال اس کے ساتھ تبعاً بڑوں کے ساتھ تشبہ کرنے کی خرابی بھی بیان ہوگئی۔

بیان یہ کر رہا تھا کہ عشاق کی شکل ہی بنانے سے عشاق کی فہرست میں نامزد ہو جاتے ہیں مگر عقل کا کب فتوٰے ہے کہ یہ وضع اختیار کرو۔ اچھی خاصی شکل کو بگاڑو۔ آگے ہم نہایت متین تھے۔ احرام باندھتے ہی ساری متانت رخصت پہلے آہستہ بولتے تھے اب پکار کر کہو۔

لبیک اللھم لبیک لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک۔

(اے اللہ میں حاضر ہوں حاضر ہوں آپ کا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں تمام حمد اور نعمت اور ملک آپ ہی کے لئے ہے آپ کا کوئی شریک نہیں) نمازوں کے بعد کہو اوپر چڑھو تب کہو نیچے اترو تب کہو۔ غرض ہر تغیر حالت کے وقت کہو۔

عورت کا احرام و تلبیہ

سوائے عورت کے کہ اس کے لئے تلبیہ کا جہر نہیں کیونکہ اسکی آواز میں فتنہ ہے لباس بھی وہ نہیں اس واسطے کہ اس میں کشف عورت ہے۔ لیکن اس میں ایک جزء عقل کی رسائی سے آگے ہے کہ سر پر کپڑا ڈالنا تو فرض مگر منہ پر ڈالنا ناجائز۔ عورتیں یہ کرتی ہیں کہ خاص وضع کے پنکھے جو اسی لئے بنائے جاتے ہیں اور ان میں جالی بھی ہوتی ہے۔ ماتھے پر لگا لیتی ہیں تاکہ منہ پر بھی نہ لگے اور چہرہ بھی نہ کھلے۔

احکام حرم

یہ تو احرام ہوگیا آگے حرم میں پہنچے وہاں یہ حکم ہے کہ شکار مت کرو اگرچہ طواف وسعی کے بعد احرام کھل گیا۔ مگر اب بھی وحشی جانوروں کو مت مارو چاہے اس کو پال ہی لیا ہو مگر اس کا ذبح جائز نہیں فرمایئے یہ کون سے قانون عقل کے مطابق ہے۔

حج کی طرف کشش

خلاصہ یہ کہ اول سے آخر تک ایک فعل بھی قانون عقلی کے مطابق نہیں مگر باوجود اس کے عجیب بات

ہے کہ انسان کو حج کی طرف کشش اس قدر ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا حالانکہ اس کی غایت مدرک بالعقل بھی نہیں بلکہ جن طاعات کی غایات مدرک بالعقل ہیں انکی طرف اتنی کشش نہیں ہوتی، مثلاً نماز کہ اس کے باب میں ارشاد ہے اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ (وہ گراں ہے) پس اس کے پڑھنے میں اتنی کشش تو کیا ہوتی۔ بلکہ بہتوں کو گرانی ہوتی ہے، مگر حج میں خدا جانے کیا جاذبہ غیبی ہے جو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے بعد طواف کرو سب پھیرے گھومو۔ اول کے تین پھیروں میں ذرا مٹک کر شانے ہلا ہلا کر پھدک کر چلو بعضے شرما بھی جاتے ہیں۔ اب چاہے متین ہوں مگر سب کرتے ہیں اور اس قدر شوق سے کرتے ہیں کہ بے اختیار رونا آتا ہے۔ وہاں جس وقت یہ کرتے ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ ہنسی آئے مگر اُلٹا رونا آتا ہے اور وہ حالت ہوتی ہے کہ

یارب چہ چشمہ الیست محبت کہ من ازاں ۞ یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمہ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا ایک دریا بن گیا۔

عجیب چیز ہے محبت کہ ایک قطرہ اس کا دریا سے بھی بڑھ گیا۔ تو یہ بات کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

علیٰ ہذا القیاس سعی کرو دو پہاڑیوں پر چڑھو اترو اور میلین اخضرین کے درمیان میں دوڑو بچے دوڑا کرتے ہیں، خیر جنگل میں تو سب ایک طرح کے ہیں مرگ انبوہ جشنی دارد (مرگ انبوہ ایک جشن رکھتی ہے)۔

مگر سعی کے موقع پر تو بہت بڑا بازار ہے۔ تجار تجارت میں مصروف ہیں اور یہ بچوں کی سی حرکتیں کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان علی الاعلان ملامت لے رہے ہیں۔

غرض یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں صفا سے مروہ پر اور مروہ سے صفا پر جاؤ آؤ۔ ابھی تک آہستہ چل رہے تھے میلین اخضرین ڈنڈستان ہیں ان کے درمیان میں دوڑنے لگے ہیں یہ کیا ہوا کیا کسی نے مارا؟ بھاگتے کیوں ہو؟ بھاگتے بھاگتے میلین اخضرین سے گزر کر پھر آہستہ چلنے لگے ابھی اگر دوڑے تھے تو

دوڑتے ہی لپے رہو گے، جب اس پہاڑ پہ پہنچے پھر وہاں جاؤ جب اس پہاڑی پر پہنچے پھر یہاں آؤ۔ آخر یہ کیوں؟ ہمیں کیا معلوم کیوں؟

ایک بڑھیا کا قصہ یاد آیا سعی کرتی کرتی بیچاری جب تھک گئی تو مطوف سے کہنے لگی اجی مولوی جی چھوڑ دو معاف کر دو۔ اب تو میں بہت تھک گئی۔ مولوی جی بیچارے کیا معاف کر دیں وہ خود اسی میں مبتلا ہیں۔

غرض عجیب لطف ہے۔ اور لیجئے اچھے خاصے بال بنے ہوئے ہیں انہیں منڈواؤ سر کو خربوزہ بنا دیا۔ سر منڈا ہوا ہے۔ عجیب لطف ہے ان کے دل سے پوچھو کر اسی میں باغ باغ ہیں پہلے جو اس پر ہنستا تھا آج وہ بھی ایسا ہی بنا ہوا ہے۔

وہی حالت ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر ہنس کر حضرت مولانا جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ہو گئی تھی۔ ایک جولاہہ شیخ کا مرید تھا۔ مولانا جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ تھانیسر تشریف لے گئے وہ جولاہہ مولانا کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا تمہارے پیر آئے ہیں جو ناچا کرتے ہیں اُسے یہ فقرہ بہت ناگوار ہوا شیخ سے جا کر کہا کہ فلاں شخص ایسا کہتے تھے شیخ کو جلال آگیا۔ فرمایا کہ اب جانا تو کہہ دینا کہ وہ ناچا بھی کرتے ہیں اور نچایا بھی کرتے ہیں۔ یہ سن کر بڑا خوش ہوا اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور قصداً چھیڑا حضرت کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے پھر فرما دیا۔ اس نے عرض کیا:

"حضرت! وہ ناچا بھی کرتے ہیں اور نچایا بھی کرتے ہیں۔"

اس فقرہ کا سُننا تھا کہ بس کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ اب کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ خادم کو بھی بیعت کر لیجئے۔ چنانچہ مرید ہوئے اور اس مرتبہ کو پہنچے کہ شیخ کے ارشد الخلفاء میں سے ہوئے، ہمارے سلسلہ کے بزرگوں میں ہیں۔ تو شیخ نے تو ذرا سی دیر کے لئے انکی یہ حالت بنائی تھی اور یہاں پر مدتوں کے لئے یہ حالت بنائی گئی ہے۔ یہ تو مکہ تک تھا۔

منیٰ کی حاضری اس کے بعد پھر آٹھویں ذی الحجہ کو فجر کی نماز پڑھ کر منیٰ میں آیئے اس دن کو یوم الترویہ کہتے ہیں۔ یہاں ظہر، عصر مغرب عشا اور فجر کی نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھیے۔

وقوف عرفہ اسکے بعد منیٰ سے نویں تاریخ کو (یوم عرفہ) کو عرفات میں آیئے، خدا کی قدرت ہے۔ عرفات ایک میدان ہے، مزدلفہ اسی کے متصل ہے ایک بالشت اُدھر تک تو کچھ نہیں جہاں ایک بالشت اُدھر قدم رکھا بس اسی وقت سے حاجی کہلانے لگے۔ الحج عرفۃ یعنی وقوف عرفہ ہی حج ہے۔ اس معنی کر کہ یہ سارے فرائض میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور فرائض کا تو بدل بھی ہے، مگر وقوف عرفہ کا کوئی بدل نہیں جس سے یہ ترک ہوا اس کا حج ہی نہیں اور سوائے اس کے کوئی تدارک نہیں کہ آئندہ سال قضا کرے، اللہ اکبر حیرت ہے یہ ایک قدم ایسا ہے جس کے لئے لاکھوں جانیں، لاکھوں راحتیں لاکھوں روپے لاکھوں قدم فدا کرے تو وہ ہے یہ قدم۔

اسی طرح بزرگوں نے فرمایا ہے کہ وصول تو دفعۃً ہوتا ہے سیر میں البتہ زمانہ خرچ ہوتا ہے اور وصول میں تو کچھ دیر نہیں لگتی وہ تو آنی ہے اس میں زمانہ بھی نہیں خرچ ہوتا۔ اب وہاں پہنچ کر خوش ہیں، بس رہو یہاں شام تک۔ ایک روزمرہ کا کام تھا نماز اس کی یوں کایا پلٹ دی کہ پہلے تو وقت پر پڑھا کرتے تھے، آج ظہر ہی کے وقت عصر کی بھی نماز پڑھ لو۔ حضرت ابھی تو وقت نہیں آیا ہے کہاں کا وقت اور کیسا وقت آج عصر کا وقت یہی ہے۔ وجہ، وجہ یہی کہ ہمارا حکم ہے، حیرت میں ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

مزدلفہ روانگی اب دن چھپا مغرب کی نماز کے لئے تیار ہو گئے۔ خبردار یہاں مت پڑھنا، یہاں پڑھو گے تو ہو گی نہیں۔ آج مغرب و عشاء کا وقت ساتھ ساتھ آئے گا، یہ کیا قصہ ہے۔ عقل حیران ہے کہ عصر کی نماز کو ظہر کے ساتھ کر دیا بعد مغرب کو عشاء کے ساتھ۔ خیر جب غروب ہو گیا تو مزدلفہ

میں آئیے۔ یہاں عشاء و مغرب کی نماز ساتھ ساتھ پڑھئے۔ پہلے مغرب پڑھئے پھر عشاء۔ اگر اس کا برعکس کر دیا تو عشاء پھر سے پڑھئے۔ حالانکہ اور ایام میں غیر صاحب ترتیب کو جائز تھا کہ وہ عشاء پہلے پڑھ لے اور پھر مغرب مگر یہاں جائز نہیں کیونکہ آج مغرب ادا ہے گو وقت نکلنے سے قضا معلوم ہوتی ہے۔

منیٰ واپسی اس کے بعد اب صبح ہوئی، فجر کی نماز اول وقت پڑھئے اور آفتاب نکلنے سے پہلے جب روشنی ہو جائے تو مزدلفہ سے چل کر منیٰ میں آئیے یہ دسویں تاریخ کا دن ہے یہاں کیا کیجئے کہ سب سے پہلے جمار ثلث پر سات سات کنکریاں مارو اور اس کے بعد قربانی کرو پھر سر منڈاؤ اس کا حد عقل سے آگے ہونا ابھی بیان ہی کر چکا ہوں یہاں تین دن ٹھہرو۔ تیرھویں کو اختیار ہے کہ ٹھہرو یا جاؤ۔

طوافِ زیارة آگے پھر طوافِ زیارت کرو۔ پھر جو جی چاہے کر دراے لیجئے حج ختم ہو گیا۔ اب بتائیے اس میں کون سی بات عقل کے موافق ہے۔

فنائے اتم لوگ خلافِ عقل ہونے سے ان افعال کو بے وقعت ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک یہی خلاف عقل ہونا وقعت کو بڑھاتا ہے۔ ع

معشوق من است آنکہ بنزدیک تو زشت است (جو تمہارے نزدیک ناپسند ہے وہی ہم کو محبوب ہے) جتنا تم مخالفات عقل کی فہرست بڑھاؤ گے ہمارے دعوے کی دلیل کو قوت ہوتی جائے گی کیونکہ دعوےٰ تو یہ تھا کہ حج میں فنائے اتم ہے بالکل مُردہ کر دیا ہے۔ ع

پا بدست دگرے دست بدست دگرے
(دست و پا دوسروں کے قبضے میں ہے)

کیونکہ حج کا خاصہ ہے کہ متحرک بالارادہ ہو انہوں نے اپنے ارادہ کو بالکل مٹا دیا ہے۔ کوئی حرکت ان کی اپنے ارادہ سے نہیں ہوتی۔ ان کی وہ حالت ہے کہ ہر جا

بزبان حال کہتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ؛ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(یعنی زندہ کریں آپ کی عطا ہے، اگر قتل کریں آپ پر قربان ہیں۔ دل آپ پر فریفتہ ہو کچھ تصرف کریں ہم راضی ہیں)

دوسرا شعر جو حج پر صادق آتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن ؛ دل بدست دیگرے دادن وحیراں بودن

(عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا غلام بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضے میں دے دینا اور حیران رہنا)

اپنے کو دوسرے کے قبضہ میں دے دیا اور حیران ہیں ؎

سوئے زلفش نظرے کردن ودرویش دیدن ؛ گاہ کافر شدن گاہ مسلماں بودن

(محبوب کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرۂ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی)

کفر کے معنی ہیں ستر چونکہ اپنا ارادہ اپنی ہستی مستور ہو جاتی ہے۔ اس لئے فنا کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام بقا کو کہتے ہیں۔ تو اب معنی یہ ہوگئے کہ گاہ فانی شدن وگاہ باقی (کبھی فانی ہونا کبھی باقی ہونا) اور فنا کی تجلی کو زلف سے تعبیر کرتے ہیں اور بقا کی تجلی کو رُخ سے ؎

سوئے زلفش نظرے کردن ودرویش دیدن ؛ گاہ کافر شدن وگاہ مسلماں بودن

یہ حالت گویا حج کی ہے کہ فنائے اتم کی شکل تو بنا ہی دی۔

مقام عبرت اب ہمیں عبرت پکڑنی چاہیئے کہ معنی فنا کا بھی کوئی حصہ میسّر اگر ہو اتو مبارک ہو ورنہ نرا مرور تو ایسا ہی ہے کہ ؎

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود ؛ چوں بیاید ہنوز خر باشد

(خر عیسیٰ اگر مکہ میں چلا جاوے تو مکہ کی واپسی کے بعد بھی خر ہی رہتا ہے)

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حصہ کیسے نصیب ہو سو وہ بہت سہل ہے، تم اس کا قصد

کر لو جو قصد کر لیتا ہے اس کا حج حج بیت نہیں رہتا بلکہ حج رب البیت ہو جاتا ہے جس کی نسبت ارشاد ہے ؎

حج زیارت کردن خانہ بود ✤ حج رب البیت مردانہ بود

(خانہ کعبہ کی زیارت کرنا حج ہے۔ اس میں خانہ کعبہ کی مالک کی بیت کرنا حج مردانہ ہے ۱۲)

حج و قربانی مراتب فنائیت

یہ روح ہوئی حج کی اور قربانی کی کہ فنائے اتم حج کی روح ہے اور فنائے تام قربانی کی۔ نفس فنا میں دونوں شریک ہیں مگر چونکہ قربانی میں عقل کے خلاف کم ہے۔ فقط اتعاب نفس ہے۔ اس لئے فنا تو وہ بھی ہے مگر حج کے برابر نہیں ہے اور دونوں میں تام اور اتم کا تفاوت ہے۔ تو یہ ان دونوں کی روح ہوئی یہی وعدہ تھا میرا کہ میں ان دونوں کی روح کا بیان کروں گا۔ چنانچہ الحمدللہ وعدہ پورا ہو گیا۔

زیارۃ مدینہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام)

اس کے بعد ایک اور طاعت ہے جس میں خشک مزاج والوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ زیارت مدینہ ہے۔ اس کی روح کیا ہے، اس کی روح یہ ہے کہ فنا کے مرتبے تک بھی جو کہ روح ہے حج کی مع قربانی کے پہنچ کر یوں سمجھ لے کہ سلوک و وصول میں تفرد کافی نہیں۔ اب بھی شیخ کی حاجت ہے کیونکہ بغیر اس کے فنا مثمر نتیجہ خیر نہیں تو شیخ الشیوخ کی زیارت سے اس وابستگی کو تازہ کر لو جو شیخ کی ساتھ حاصل ہے تاکہ فنا کا ثمرہ ظاہر ہو۔ واقعی زیارت مدینہ بڑی برکت کا عمل ہے۔ جو اہل قلب ہیں ان کو بڑے بڑے ثمرات عطا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی حج سے پہلے زیارت کر لے تو استعداد ان ثمرات کے حصول کی پیدا ہوتی ہے جو حج پا بعنوان دیگر فنا پر مرتب ہوتے ہیں اور اگر بعد میں زیارت کرے تو ان ثمرات کی تکمیل ہو جاتی ہے عجیب جگہ ہے وہاں اللہ کے بندے بڑی بڑی دولتوں سے مشرف ہوتے ہیں۔

سید احمد رفاعی رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ منورہ حاضر ہوتے تو آپ نے روضۂ مقدسہ پر جاکر با آواز بلند عرض کیا السلام علیک یا جدی (دادا صاحب السلام علیک) جواب آیا وعلیک السلام یا ولدی (بیٹا! وعلیک السلام) خلاف توقع جواب ملا تو وجد کرنے لگے اور عرض کرنے لگے ؎

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلہا

تقبل الارض عنی وھی نائبتی

(یعنی دوری میں تو روح کو قدمبوسی کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا)

فھٰذہٖ دولۃ الاشباح قد حضرت

فامدد یمینک کی تحظٰی بھا شفتی

(یعنی اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تاکہ میں اس کو بوسہ دوں) دیکھا کہ ایک ہاتھ نکلا جیسے کالشمس فی نصف النہار (دوپہر میں سورج) جس کی نورانیت نے آفتاب کو بھی ماند کر دیا تھا۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا ہے تو نوے ہزار (۹۰۰۰۰) آدمی مشاہدہ کر رہے تھے۔ ایک ہل چل پڑ گئی پھر نہایت شوق وادب سے ہاتھ چوما۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کو احمد رفاعی پر رشک بھی ہوا تو فرماتے ہیں ہم تو ہم اس وقت تو حاملانِ عرش رشک کر رہے تھے۔ اللہ اللہ یہ دولت۔ جب آپکو افاقہ ہوا تو دیکھا کہ لوگوں میں بڑی عزت ہو رہی ہے۔ آپ نے نفس کا معالجہ کیا۔ صاحبو! جب ایسے ایسوں کو علاج کی ضرورت ہے۔ تو ہم کیسے مخدوم ہو سکتے ہیں ہمیں تو بدرجۂ اولیٰ علاج کی حاجت ہے۔ آپ نے معالجہ یہ کیا کہ مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دہلیز پر لیٹ گئے اور فرمایا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں

؎ ان ہی بزرگ ہستی حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ کی کتاب بنیان المشید حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے روزانہ بطور ورد کے اس کے پڑھنے کا مشورہ دیا ہے ضرور منگائیں۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ تھانوی۔ بندر روڈ۔ کراچی

کہ میرے اوپر سے گزرو تاکہ ذلت ہو۔ لوگوں نے پھاندنا شروع کیا۔
ایک بزرگ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نہیں پھاندے۔ فرمایا اگر میں ایسا کرتا تو مجھے آتش قہر جلا ڈالتی۔ وہ اندھے تھے جو پھاندے۔ تو اللہ کے بندوں کو وہاں یہ دولتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اتنی بڑی دولت کو بعض خشک مزاج بلا دلیل کہتے ہیں کہ ناجائز ہے۔

روح انفاق مالی بہرحال اسوقت میرا اصل مقصود بیان کرنا تھا روح حج قربانی کو سو بیان کرچکا کہ ان کی روح فنا ہے۔ اب انفاق مالی کی روح کا بیان باقی رہا سو وہ انفاق سے بقا ہے جو فنا کا ثمرہ بھی ہے اور اس مناسبت سے بھی دونوں کا بیان کرنا جمع کرنا مستحسن ہوا اور حقیقت بقاء کی یہ ہے کہ اپنے ارادوں کے اندر پھر ایک حالت فاعلیت کی پیدا ہوگئی۔ علوم و اعمال کا پھر عود ہوگیا وہ پھر تازہ ہوگئے وہ حرکت ارادیہ پھر کام دینے لگی۔ مگر جیسا قبل فنا دیتی تھی ویسا نہیں۔ مثلاً پہلے جو حرکت ہوتی تھی وہ اپنے ارادہ اور اپنے نفس کے اتباع سے ہوتی تھی۔ اس کے بعد مرتبۂ فنا میں وہ منقطع ہوگئی تھی۔ اب مرتبۂ بقاء میں پھر ہونے لگی۔ لیکن اب ارادۂ عبد بالکل ارادۂ حق کے تابع ہے یعنی ارادات تشریعیہ اب اس کے لئے امور طبعیہ بن گئے ہیں اور اس کے ساتھ افاقہ بھی ہے۔ کسی سے راضی ہے کسی پر غصہ بھی ہو رہا ہے۔ انتظام بھی کرتا ہے روپیہ پیسہ بھی لیتا ہے غرض سلطنت تک کرتا ہے۔ اور اس وقت یہ حالت تھی ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار ⁂ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(یعنی احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام؟ دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

اور اب وہ حالت ہے ؏ خاص کند بندۂ مصلحت عام را

خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ عام کی مصلحت کے لئے کسی شخص کو خاص کر لیتے ہیں تو اب یہ حالت ہے کہ ایک لاکھ روپیہ لیتا ہے اور اس کا انتظام کرتا ہے مگر اس طور پر کہ نفس کا کہیں شائبہ نہیں ہوتا تو اس مرتبہ میں پہنچ کر اسکی وہ حالت

ہوتی ہے جو انبیاء کی ہے کہ صاحب مال صاحب جاہ سب ہی کچھ ہوئے۔ اور اب وہ کام کرتا ہے جو کرنا چاہیئے پورا تخلق باخلاق اللہ (عادت بنانا اللہ کے اخلاق کے ساتھ) کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے پہلے فنا کے مرتبے میں تو وہ افعال اس کے نہ رہے تھے اور اب بقاء کے مرتبے میں تخلق باخلاق الالٰہیہ باختیار العبد (اخلاق الٰہیہ کا تخلق بندہ کے اختیار سے) حاصل ہے۔ حق تعالیٰ کے اخلاق تصرف انتظام غصہ کی جگہ غصہ رحم کی جگہ رحم جو صحابہ کی شان تھی کہ،

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

(یعنی ع وہ کافروں پر سخت تھے آپس میں تھے سب رحمدل۔ جامع) اس سے اس کے افعال اسی کے اختیار سے صادر ہوتے ہیں فنا میں یہ بات نہ تھی وہاں مجبوری اور حیرانی غالب تھی اور بقا میں تمام افعال منضبط ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کے مرتبہ کا پتہ بھی نہیں چلتا مگر مرتبہ اس کا ایسا عظیم ہے کہ

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ؛ ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

(یعنی ادھر شریعت کا خیال اُدھر عشق کا خیال شریعت اور عشق دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

خلق جود اور یہ حالت انبیاء و اولیاء کاملین کی ہوتی ہے کہ وہ اخلاق الٰہیہ کے ساتھ متصف ہو جاتے ہیں اور اخلاق الٰہیہ میں سے ایک خلق یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچانا اور نفع عام ہے ظاہری بھی باطنی بھی اسی واسطے بیضاوی نے وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ (اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ومن انوار المعرفة يفيضون (انوار معرفت میں سے فیض پہنچاتے ہیں)، چنانچہ اگر ان کو مال ملا تو وہ اس میں سے بھی دیتے ہیں اگر انکو علم ملا تو وہ اس میں سے بھی دیتے ہیں اگر ان کو انوار ملے تو وہ ان میں سے بھی دیتے ہیں۔

اور اس خلق خاص کو جود کہتے ہیں اور یہ سب افراد نفع کو عام ہے اس

میں زکوٰۃ بھی آگئی پس وہ بھی جود کی ایک قسم ہے، سو اس میں زکوٰۃ کی روح بھی مذکور ہوگئی کہ بقاء ہے بلکہ تمام انفاقات مالیہ کی روح آگئی صدقہ فطر کی بھی زکوٰۃ کی بھی، اور آیت میں جو ہے فَکُلُوْا مِنْهَا (اس میں سے تم بھی کھاؤ) اس میں یہ سب داخل ہوگیا۔

باقی اگر کوئی کہے کہ آیت میں تو صرف قربانی کے گوشت کے متعلق انفاق (خرچ کرنا) کا حکم ہے اس میں دوسرے انفاقات کیسے آگئے تو بات یہ ہے کہ خصوصیت اس کی مقصود مقام نہیں بلکہ محض اغنائے (غنی کرنا) مساکین مقصود ہے اس لئے سب اسی کے حکم میں آگئے بلکہ یہ دلالت ایک اعتبار سے صریح دلالت سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ یہ مستحب ہے اور زکوٰۃ فرض اور صدقہ فطر واجب جب یہ مستحب مہتم بالشان ہے تو وہ فرض و واجب تو بدرجہ اولیٰ مہتم بالشان ہوگا۔ تو مستحب کے ذکر میں واجب و فرض کا ذکر بھی آگیا پس حاصل ان سب کا جود ہے اور اس کی روح بقاء ہے اور اس سے قبل فنا تھا جو روح تھی حج و قربانی کی اور فنا کے قبل مشاہدہ تھا جس کے اثر سے فنا ہوا اور یہ روح تھی اعمال عید کی اور مشاہدہ سے قبل مجاہدہ تھا جو روح تھی اعمال صوم کی سبحان اللہ جس ترتیب سے ان اعمال کا بیان ہوا یہی ترتیب سلوک کی بھی ہے کہ سب سے پہلے مجاہدہ اور اس کے بعد مشاہدہ پھر اس کے غلبہ سے فنا اور اس کے بعد بقاء بحمد للہ وہی ترتیب یہاں بھی رہی،

اگر کوئی کہے کہ جب سلوک کی یہ ترتیب ہے تو سب احکام اسی ترتیب سے واجب ہونا چاہئیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ بعضوں پر حج فرض نہیں اور زکوٰۃ فرض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سب کو "مختلطا" اس لئے مشروع کیا ہے کہ ان سب میں باہم ارتباط و مناسبت بھی ہے۔ پس سب کو شروع کر دینے سے جس وقت ختم پر پہنچیں گے دفعۃً" کمال حاصل ہو جائے گا۔ جیسا کہ کتب درسیہ میں کہ مختلف فنون کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا جس وقت ہر فن کی کتاب کا اخیر ورق ختم ہوا بس دفعۃً" محدث بھی ہو گئے اور مفسر بھی بن گئے، سو یہی طرز یہاں رکھا ہے، اب

وہ شبہ بھی رفع ہو گیا۔ الحمد للہ حسب توفیق حق سبحانہ و تعالیٰ سب کا بیان ہو گیا۔

ترجمہ آیات اب ترجمہ ان آیات کا کئے دیتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ جن طاعات کی نسبت میں نے دعوےٰ کیا تھا کہ وہ ان آیات کی مدلول ہیں وہ تینوں اس میں مذکور ہیں یا نہیں۔

پس فرماتے ہیں:

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا)

اس وقت کو یاد کیجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی۔ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ سے پہلے وَاَمَرْنَا مقدر ہے۔ یعنی ہم نے یہ بھی حکم دیا کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔ سبحان اللہ! پہلے ہی سے انسداد کر دیا کہ کہیں کوئی اس کی تعظیم سے شبہ معبودیت کا نہ کر لے۔ آخر آریوں کو شبہ ہوا ہی جس پر اعتراض چلا دیا۔ ابھی جگہ ہی بتلائی تھی کہ فرما دیا کہ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا" سبحان اللہ کیا انتظام ہے۔ اس فرمانے سے معلوم ہو گیا کہ یہ بیت خود مقصود نہیں بلکہ اس وجہ سے اس کا قصد کیا جاتا ہے کہ یہ مقام ہے اس کی تعظیم کا:

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ

اور میرے بیت کو پاک رکھنا اقذار (گندگی) ظاہری سے کہ خس و خاشاک و نجاسات ہیں اور اقذار باطنی سے بھی کہ اصنام ہیں جس سے قریش نے ملوث کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو بتوں سے بھر دیا تھا سو اس کی وہیں سے جڑ کاٹ دی۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ:

اور ہم نے حکم دیا ابراہیم علیہ السلام کو کہ اعلان کر دیجیے لوگوں میں حج کا آئیں گے لوگ پیادہ ہو کر اور دبلی اونٹنیوں پر کہ آئی ہوں گی وہ بڑی دُور دراز

سے۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ میری آواز اتنی کہاں جو میں تمام دنیا کے لوگوں میں ندا دے سکوں۔

ارشاد ہوا تم پکار دو آواز کا پہنچا دینا ہمارا کام ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکار دیا کہ اے لوگو چلو اللہ کے گھر کا حج تم پر فرض ہے تو جس جس کی تقدیر میں حج لکھا جا چکا تھا سب ارحام امہات اور اصلاب آباء (ماؤں کے رحموں باپ کے اصلاب) میں سے لبیک لبیک (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) بول اُٹھے اور اپنے اپنے زمانہ میں حج ادا کیا اور کریں گے اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سالکو! ذکر و شغل سے ثمرات کے منتظر نہ رہو یہ تو ہمارا کام ہے تم اپنے کام میں لگے رہو۔

دیکھو ابراہیم علیہ السلام کے پاس کوئی ایسی تدبیر نہ تھی کہ وہ اپنی آواز کو اتنی دُور پہنچاتے مگر ہم نے پہنچا دیا۔ اسی طرح تمہیں ثمرات کی کیا فکر تم اپنے کام میں لگے رہو۔ ع

کار خود کن کار بیگانہ مکن

(یعنی اپنے کام میں لگے رہو۔ ثمرات کی فکر میں نہ پڑو)

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے پکارا۔

آگے بتلاتے ہیں کہ کیا غایت ہے اس پکارنے کی:

حج میں تجارت کا درجہ

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ:

تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے پاس یہ عام ہے خواہ منافع دینی ہوں یا دنیوی اور دینی منافع میں تو بہت بڑا نفع یہ ہے کہ وہاں طاعت کرنے کی کتنی بڑی فضیلت ہے اور دنیوی نفع یہ کہ بہت سی آبادی ہوگی اس میں تجارت کریں گے زراعت کریں گے اور بہت سے فائدے اُٹھائیں گے۔ مگر فرق اور مقام

کی تجارت میں اور یہاں کی تجارت میں یہ ہے کہ یہ للاعانۃ علی الدین (دین کی اعانت کی وجہ سے) ہونا چاہیے یعنی حج میں تجارت کا مال ساتھ لے جانے میں نیت یہ ہو کہ اگر مال ہوگا اطمینان رہے گا۔ ورنہ پریشانی ہوگی۔

اور بھلا حج تو عبادت ہے۔ اس میں دنیا کا کیا مقصود ہوتی جہاں کسب دنیا کا بھی ذکر ہے وہاں بھی اس کو مقصود نہیں ہونے دیا اس کے ساتھ ہی دین کے مقصود بنانے کا حکم دیا چنانچہ جمعہ کے باب میں جہاں فرما دیا:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ۔

(پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اسی کے ساتھ یہ بھی فرما دیا:

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا

خوب کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔

غرض دنیائے محض کی کہیں بھی اجازت نہیں اور جب اسلام کا یہ حاصل ہے کہ اس میں دنیا محض ہے ہی نہیں تو مسلمان کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ ہم دنیا دار ہیں اصل دنیا دار تو صرف کافر ہی ہیں تم شرائع کا التزام کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو؟ جب تم شرائع کا التزام کرتے ہو تو پھر دیندار دنیا دار کہاں سے آئے۔ اب اس شعر کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند ؛ روز و شب در زق زق و در بق بق اند

(یعنی صرف کفار اہل دنیا ہیں رات دن زق زق بق بق میں گرفتار ہیں)

اہل دنیا چہ کہیں وچہ مہین ؛ لعنت اللہ علیہم اجمعین

(یعنی دنیا دار خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو) ظاہر میں سارے دنیا داروں کو کافر مطلق کہہ دیا جس سے شبہ تکفیر مسلم کا کا بھی ہوتا ہے جو مشغول بالدنیا ہے۔ سو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اس کی

توجیہ فرمائی تھی کہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر۔ مطلب یہ کہ کفار صرف اہل دنیا ہی ہوتے ہیں، مسلمان دنیادار ہی نہیں ہوتے۔ سو یہ توجیہ نہایت لطیف ہے۔ یعنی دنیائے محض کے طلب کرنے والے جن کو دین کی بالکل پرواہ نہیں وہ کافر ہی لوگ ہیں اور جو شرائع کا التزام کرتے ہیں وہ اگرچہ دنیا بھی حاصل کریں، مگر دنیا دار نہیں بلکہ دیندار ہیں۔ اگرچہ ضعیف درجہ کے سہی تو کسی مسلمان کو اپنے کو دنیا دار نہ کہنا چاہیئے یوں کہیئے ہم مسلمان ہیں، خطاوار ہیں۔ انکسار و تواضع کے لئے یہی کافی ہے۔ دنیادار کیوں کہو۔

یہ تو ایسی تواضع ہوئی کہ ایک مرتبہ ریل میں ایک صاحب سوار تھے جو جنٹ تھے ان کے ساتھ اور بھی دو چار مسخرے وکیل وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب مل کے ایک اجنبی مسافر کو بنا رہے تھے۔ اتفاق سے جسے بنا رہے تھے وہ بھی کہیں منصف تھا مگر ہندو تھا۔ جب کھانا کھانے بیٹھے تو جنٹ صاحب کہنے لگے کہ آپ بھی گوہ موت کھا لیجئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ ہائیں کھانے کو گوہ موت کہتے ہو، کہنے لگے اپنے کھانے کو کھانا کہنا یہ تو تکبر ہے۔

اور ایک صاحب کا نام نتھو تھا کسی شخص نے پوچھا، آپ کا نام؟ تو آپ تواضع سے کہتے ہیں، اخ تھو کتے کا گوہ۔ میاں نتھو، تو یہ تواضع تو ایسی ہی ہوئی آج تواضع سے دنیادار کہا ہے۔ کل اور تواضع بڑھے گی تو کافر کہو گے۔ اچھی تواضع ہوئی۔ غرض تم سب دیندار ہو۔ کوئی دنیادار نہیں، مسلمان تو دنیا میں اگرچہ کتنا ہی توغل ہو مگر اس پر غلبہ دنیا کا نہیں ہو سکتا۔ غرض جب جمعہ میں وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا (ترجمہ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو) فرما دیا تو حج میں کیسے نہ ہو گا۔

اور اس تجارت فی الحج کا درجہ مقصود بالعرض ہونے میں ایسا ہے جیسے حالت روزہ میں غسل کرنے کا۔ کیا اچھا فیصلہ ہے کہ اگر غسل جزع فزع کی وجہ سے ہے تو مکروہ ہے اور اگر ازالہ جزع فزع کے لئے ہے کہ اعانت

علی الصوم ہے تو جائز ہے۔ چنانچہ ابوداؤد میں روایت ہے کہ آپ نے روزہ میں غسل کیا تو جیسے غسل روزہ میں ہے ویسے تجارت حج میں ہے کہ اگر حج اس لئے ہے کہ تجارت کریں گے تو مکروہ و ناجائز ہے اور اگر تجارت اس لئے ہے کہ حج اچھی طرح اطمینان سے کر سکیں گے تو جائز ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

بقیہ ترجمہ آیات وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ:

اور ان چند متعین دنوں میں اللہ کا ذکر کریں یعنی ذبح کریں اور اللہ کا نام لیں۔ اور یہ ذبح خواہ استحباباً ہو یا وجوباً۔ پھر فرماتے ہیں:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ، پھر کھاؤ ان میں سے یہاں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ اب تک ابراہیمؑ کو خطاب تھا۔ مگر چونکہ وہ بھی بلا انکار تھا۔ اس لئے ہمیں بھی تھا یعنی ان میں سے تم بھی کھاؤ۔ وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

یہ مطلب نہیں کہ اغنیاء کو مت کھلاؤ۔ نہیں اغنیاء کو بھی کھلاؤ۔ چنانچہ کُلُوا سے یہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی غنی نے قربانی کی تو وہ بھی کُلُوا میں داخل ہے تو غنی کو بھی کھانا جائز ہوا تو اس کو کھلانا بھی جائز ہوا بلکہ چاہے سب کھالو کسی کو بھی مت کھلاؤ نہ فقیر کو نہ غنی کو مگر مستحب وہی ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ پھر اپنا میل کچیل دور کریں یعنی بال منڈائیں۔ ناخن کٹائیں نہائیں دھوئیں، بدن کو صاف کریں۔ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ اور چاہیئے کہ اپنی منتوں کو پورا کریں۔ نذور سے مراد مطلق واجبات کہ وجوب میں مثل منذور کے ہیں۔ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ اس کو عتیق اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ معتق و محفوظ ہے جبابرہ سے۔ حق تعالیٰ نے اسے آزاد رکھا ہے۔ یعنی اور چاہیئے کہ بیتِ عتیق کا طواف کریں۔ یہ ترجمہ ہوا ان

آیات کا اس سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس میں تینوں عمل مذکور ہیں۔ حج بھی قربانی بھی انفاق مالی بھی مگر یہ آیت ملی ہے ذرا ڈھونڈنے سے۔ الحمد للہ جو کچھ میرا مقصود تھا وہ بیان ہو چکا

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم نکتوں ہی میں نہ رہیں عمل بھی کریں اور جن پر حج فرض ہے وہ حج بھی کریں اور خرچ ہو تو مدینے بھی جائیں۔

نہایت اہم مسئلہ اور ایک مسئلہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جو لوگ مکہ اور مدینہ دونوں کے خرچ کو ملا کر اتنے خرچ ہونے پر حج فرض سمجھتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں جس کے مکہ تک کا خرچ ہے اس پر حج فرض ہے وہ حج کو جائیں البتہ جن پر حج فرض نہیں ہے وہ آجکل نہ جائیں کیونکہ جب فرض نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ خدشہ میں پڑو اگرچہ یہ خدشہ ضعیف ہی ہے۔ اس کے علاوہ آجکل کرایہ بھی گراں ہے اور گنجائش ہو تو مدینہ کو بھی جائیں کہ بڑی فضیلت ہے ؎

زہے سعادت کہ آں بندہ کہ کرد نزول ۞ گہے بہ بیت خدا گہے بہ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

(بڑی خوش نصیبی اس بندہ کی کہ اس نے کبھی خانہ کعبہ کی زیارت کی اور کبھی مدینہ کی)

فضیلت خاص ہر چند کہ قربانی کی فضیلت کا بیان ظاہراً قبل از وقت ہے یعنی وقت سے پہلے ہے مگر ایک معنی کر قبل از وقت نہیں۔ اس لئے کہ جس کو زیادہ فضیلت حاصل کرنا ہو وہ پہلے سے قربانی کے جانور کو خرید لے اور انہیں کھلا پلا کر خوب موٹا تازہ کر لے۔ سو اگر کسی نے یہ بیان سن کر اسوقت جانور قربانی کا خرید لیا تو اس اعتبار سے خاص یہ بیان قبل از وقت نہ ہوا وقت پر ہی ہوا۔

اور پہلے سے خریدنے میں اس لئے بھی فضیلت ہے کہ پہلے سے خرید کر اس کو جتنا کھلائے پلائے گا اس جانور سے انس ہو گا اور ارشاد ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

(یعنی تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے) تو جب محبوب کو ذبح کرے گا تو یہ فضیلت خاص بھی اس کو حاصل ہوگی۔

اہتمام عبادت اور دعاء: باقی رہی زکوٰۃ و صدقہ واجبہ سو گو اس کا کوئی مہینہ مقرر نہیں مثلاً زکوٰۃ ہے کہ جب حولان حول (سال کا گزرنا) ہو جائے، جب دیدینا چاہیئے، تو اس شخص کے لئے یہ بیان شاید قبل از وقت سمجھا جاوے لیکن محتمل اور ممکن تو ہے کہ کسی کا سال شوال یا ذیقعدہ ہی میں پورا ہوتا ہو تو اس کے اعتبار سے بھی یہ مضمون احتمالاً مناسب ہے اور جن عبادات کی ارواح رمضان میں مذکور ہوئی تھیں ان کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے اور اہتمام کے ساتھ سب سے بڑی ضرورت حق تعالیٰ سے دُعا کرنے کی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ ہمیں فہم اور عمل کی توفیق عطا فرماوے۔

تمّت

عِلمُ الصِّیغہ اُردُو

علم الصیغہ اردو ◇ حضرت مولانا رفیع عثمانی مہتمم دار العلوم کراچی کی گراں قدر کتاب ہے۔

علم الصیغہ اردو ◇ حضرت مولانا رفیع عثمانی صاحب نے جو مسوّدہ تیار کیا تھا وہ مختلف اساتذہ کے زیرِ مطالعہ رہا۔

علم الصیغہ اردو ◇ مختلف اساتذہ نے اس کتاب کے مسودہ کا بغور مطالعہ کیا اور حضرت سے اس پر حاشیہ لکھنے کی درخواست کی۔

علم الصیغہ اردو ◇ ان تمام باتوں کا لحاظ کر کے لکھا گیا جس کی طلباء اور اساتذہ کو ضرورت تھی۔

علم الصیغہ اردو ◇ علم الصیغہ کی وہ بے نظیر شرح ہے جو تمام دوسری شروحات سے بے نیاز کردیگی۔

علم الصیغہ اردو ◇ فارسی نہ جاننے والوں اور فارسی کم جاننے والوں کیلئے بیمثال ہر ہے۔

علم الصیغہ اردو ◇ برّصغیر کے علمی حلقوں سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔

علم الصیغہ اردو ◇ علم الصیغہ کا سلیس بامحاورہ ترجمہ ہے۔

علم الصیغہ اردو ◇ اس کتاب کے حاشیہ پر بہترین تشریح اور تعلیلات اس انداز میں لکھی گئی ہیں کہ ہر طالب علم آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

علم الصیغہ اردو ◇ زمزم بکڈپو کی مایہ ناز پیشکش ہے جسکی طباعت معیاری، کاغذ اعلیٰ درجہ کا ٹائٹل خوبصورت دیدہ زیب ہے۔

قیمت =/۴۰ روپے

روح الارواح

عبادات کا اصل مقصود

۸ شوال ۱۳۳۳ھ کو جمعہ کے روز، تین گھنٹے ۸ منٹ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔
مولانا عبدالحلیم صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔
سامعین کی تعداد دو سو ۲۰۰ تھی۔

واقعی ذبح ترحم کے خلاف ہے ـــــــ

لیکن اے صاحب! یہی تو بڑی عبدیت ہے کہ گو ترحم کے خلاف ہے لیکن خلافِ طبع وخلافِ نفس مالک کے امتثال امر کے لئے دل پہ پتھر رکھ کر کرتے ہیں۔

(از حضرت حکیم الامتہ رحمۃ اللہ علیہ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الوعظ المسمّی بہ

رُوح الارواح

*

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمداً عبدہ ورسولہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم ــــــ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمۡ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمۡ وَبَشِّرِ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝

(ترجمہ) یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا تاکہ تم اللہ کی راہ میں قربان کر کے) اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو

کہ اس نے تم کو اس طرح قربانی کرنے کی توفیق دی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

احوال واقعی

یہ ایک آیت ہے سورۂ حج کی حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے اس میں مسئلہ اضحیہ یعنی قربانی کے متعلق جو دو مختلف گروہ دو مختلف غلطیاں کرتے ہیں ان کا فیصلہ فرمایا ہے اور فیصلہ بھی نہایت عجیب و غریب کہ جس سے عوام تو عوام خواص بھی غافل ہیں خواہ وہ خواص اہل ظاہر میں سے ہوں یا اہل باطن سے حق تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں جماعتوں کی اصلاح اور ترمیم فرما کر ایک نہایت تحقیقی فیصلہ فرمایا ہے۔ اس مضمون کو یعنی قربانی کی روح کو شوال کے شروع میں کے وعظ روح الحج والثج[1] میں بضمن احکام حج کے بیان کر چکا ہوں گو اس عنوان خاص سے نہیں اور میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ جمعہ قریبہ ذی الحجہ میں اس کا بیان نہیں کیا جاوے گا بلکہ قربانی کے احکام فرعیہ بیان کئے جاویں گے لیکن اتفاق سے قلب میں پھر حرکت ہوئی کہ ویسا ہی مضمون پھر بیان کیا جاوے گو اس کا عنوان اس بیان سابق کے عنوان سے بدلا ہوا ہوگا لیکن حقیقتاً اور مضمون اس بیان کا ایک ہی ہوگا۔

مدعیان علم

اب اس فیصلے کے سننے کے قبل ان غلطیوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کون کون سی ہیں۔ سو وہ غلطیاں ایک مسئلہ میں واقع ہوئی ہیں دو قسم کے علماء کے درمیان میں یعنی بعض علماء ظاہر و بعض علماء باطن۔ اور افسوس ہے کہ علماء ظاہر کے گروہ میں آج کل بعض ایسے لوگ بھی اپنے کو شامل کرنے لگے ہیں، جن کو علم سے کچھ بھی مس نہیں مگر نہ معلوم وہ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں ایسے لوگ اپنے حوصلہ سے زیادہ دعویٰ کرنے لگے ہیں اور بہت دور تک ان کی دست درازی کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ اس لئے ہم کو مجبوراً دست اندازی کی ضرورت پڑی اور ایسے لوگوں نے صرف دنیوی امور ہی میں نہیں بلکہ دینی امور میں بھی اپنی رائیوں کو دخل دینا شروع کر دیا

---

[1] یہ وعظ سات وعظوں میں کا ایک وعظ ہے جن کا مجموعہ ملقب بہ ہفت اختر مستقلاً شائع ہوا ہے جن میں اعمال رمضان و نظر حج کی خصوصیت کیساتھ مفصل اسرار بیان کئے گئے ہیں ۱۲ منہ

ہے۔ وہ اپنے زعم باطل میں یہ سمجھتے کہ جب ہماری رائے دنیوی امور میں قابل تسلیم ہے تو دینی امور میں بھی کیوں نہ صائب سمجھی جاوے۔ ان کی دست اندازی دنیوی امور میں تو خیر کوئی ایسی قابل لحاظ نہیں ہے مگر ہاں دینی امور میں ضرور قابل لحاظ ہے اس زمانہ میں طبیعتیں کچھ ایسی شوخ ہوگئی ہیں کہ جس چیز میں چاہا بے باکانہ دخل دے بیٹھے وہ سادگی جو پہلے تھی اب نہیں رہی پرانے لوگ جس چیز کو نہیں جانتے تھے صاف کہہ دیتے تھے۔

دیکھئے دنیوی فنون میں سے جس فن کو جو نہ جانتا ہو اُس کے متعلق کسی سے یہ کہلا لینا کہ میں نہیں جانتا نہایت آسان ہے۔ مثلاً ہم نہایت آزادی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم محکمہ زراعت کے کام نہیں جانتے ایک بہت بڑا فلاسفر بھی نہایت خوشی بلکہ فخر کیساتھ کہنے کے لئے تیار ہو جائے گا کہ ہم نہیں جانتے۔ کھاد کس طرح ڈالی جاتی ہے اس کو اس اقرار جہل سے ذرا عار نہیں آئے گی مگر آجکل کے مدعیان تحقیق سے یہ منوا لینا کہ تم دینی دقائق نہیں جانتے بالکل ناممکن ہے بھلا کس طرح مان لیں حضرت کی شان تحقیق میں فرق نہ آجائے گا۔

دین سے مناسبت کچھ اس قدر کم ہوگئی ہے کہ اس عدم مناسبت کو بھی انہیں نہیں سمجھا سکتے بڑے سے بڑا عالم بھی ایک جگہ پہنچ کر یہ کہہ دے گا کہ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا آگے میں ناواقف ہوں۔ لیکن جاہل نے اگر شروع ہی میں کہہ دیا تو کہہ دیا کہ میں ناواقف ہوں لیکن اگر کہیں اول دہلہ میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ میں جانتا ہوں تو بس پھر قیامت تک اسی کو نباہے جائے گا۔ کسی اونچے سے اونچے درجے کے مسئلہ پر بھی وہ نہیں کہے گا کہ میں نہیں جانتا۔ مگر اس کے اصرار سے کہیں حقیقت بدل سکتی ہے

جیسے کہ کسی سیاح نے امریکہ کا راستہ نہ دیکھا ہو اور تمام روئے زمین کی سیاحت کر کے لوٹا ہو اور امریکہ کا پتہ اس کے بعد دوسرے سیاحوں نے لگا لیا ہو اور اس کے سامنے امریکہ کا ذکر کیا جاوے تو وہ فوراً انکار کر دے گا کہ امریکہ کوئی خطہ روئے زمین پر موجود نہیں کیونکہ ہم سارے روئے زمین کی سیاحت کر آئے ہیں ہمیں کہیں نہیں ملا۔ مگر کیا اس کے اس نفی کرنے سے امریکہ کی نفی ہو سکتی ہے۔ اس سے یہی کہا جاوے گا کہ تمہارا علم محیط نہیں

ہے اور تمہارا احاطہ نہ کرنے سے حقیقت کی نفی نہیں ہوسکتی۔ پس تعجب ہے کہ اس امر کا انکار نہ کیا جاوے گا لیکن حقیقت واقعیہ کا انکار کر بیٹھیں۔ غرض خواص کے طبقہ سے نکل کر مدعیین کے طبقہ تک وہ مسئلہ پہنچ گیا۔

تحقیق مصالح

اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پر نہایت زور شور سے گفتگو ہے کہ احکام شرعیہ کے اندر حقیقت میں کوئی مصلحت ہے یا نہیں یہ بحث معرکۃ الآراء ہے کہ احکام شرعیہ کے اندر مصلحتیں بھی ہیں یا کیفما اتفق جو چاہا حکم مقرر کر دیا۔ مثلاً روزے کا حکم کیا ہے، قربانی کا حکم کیا ہے آیا ان میں کوئی مصلحت ہے یا یوں ہی جو چاہا حکم کر دیا، نماز کو فرض کیا ہے آیا اس میں کوئی مصلحت بھی ہے یا ویسے ہی فرض کر دی سو اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ احکام میں مصلحتیں ہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ مصلحتیں کیا ہیں سو اس کا ایک نہایت عمدہ جواب عرض کرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہوگا وہ یہ کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں اور مغلوب العشق تو یہی جواب دے گا کہ ہم نہیں جانتے مصلحت کیا ہے۔

لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں مصلحت سے بحث نہیں نہ یہ کہ ہمکو بالکل ہی معلوم نہیں وہ تو جاننے پر بھی یہی کہے گا جو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار ؛ بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

یعنی بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کو لے لو۔ حضرت نظامیؒ کا ارشاد ہے ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ؛ نینگیختن علت از کار تو

(بس زبان سے اقرار کرنا چاہیئے کوئی علت نہ ڈھونڈھنا چاہیئے) کیسی مصلحت کیسی علت۔ ایک اور بزرگ فرماتے ہیں ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ؛ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں میں ہر حالت میں آپ سے راضی ہوں)

اور ان حضرات عشاق میں جو محقق ہیں ان سے اگر کوئی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ تو ناشکری بھی نہیں کرتے کہ باوجود معلوم ہونے کے یوں کہیں کہ مصلحت معلوم نہیں کیونکہ یہ حضرات صورت کفر ان سے بھی بچنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں مصلحت سے بحث نہیں، ہمیں حکم محبوب کی تعمیل سے غرض ہے لہٰذا وہ دونوں جمع کر کے یہ کہتے ہیں؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ؎ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(یعنی کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو ہمیں معلوم نہ ہو لیکن مصلحت نہیں الخ کہ اس کو کھلم کھلا ظاہر کریں)

حکیمانہ محبت

اور مصلحت کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس کسی نے عشق کا مزہ چکھا ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ کسی نوکر کا محبوب آقا جب اس کو حکم کرتا ہے کہ جاؤ دوڑ کر اچکن لے آؤ۔ اصطبل سے گھوڑا تیار کر کے فوراً حاضر کرو ہم فلاں حاکم سے ملنے جائیں گے، وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے دوڑ کر جائے گا اب ایسی حالت ہے کہ وہ دوڑا ہوا جا رہا ہے، اگر راستہ میں اس سے کوئی پوچھے کہ کیوں دوڑے ہوئے جاتے ہو تو وہ صرف یہی کہہ دے گا کہ مالک نے گھوڑا منگایا ہے، اچکن منگائی ہے۔ اس پر اگر وہ شخص یہ پوچھنے لگے کہ اس حکم میں کیا مصلحت ہے تو کیا وہ اس حکم کی وجہ پر لیکچر دینے لگے گا، اور گو اس حکم کی وجہ بھی ضرور ہے اور وہ اس کو جانتا بھی ہے کہ ملاقات حاکم ہے لیکن وہ صرف یہی کہہ دے گا کہ ہمیں وجہ معلوم نہیں یا ہمیں وجہ سے کیا بحث بڑی وجہ ہمارے لئے یہی ہے کہ ہمارے آقا نے حکم دیا ہے وجہ خود آقا سے جا کر پوچھو وہ اس سے زیادہ ایک حرف نہ کہے گا انہوں نے حکم دیا ہے ہم تعمیل کے لئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ تو تعمیل کی دھن میں لگا ہے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ کھڑا ہو کر مصلحت اور وجہ پر لیکچر دینا شروع کر دیا تو معلوم ہوا کہ وہ عاشق نہیں ہے صرف ایک حکیم دانشمند شخص ہے جو خالی ہے عشق سے، غرض اس کے اس کہنے سے کہ ہمیں وجہ معلوم نہیں یہ معنی ہرگز نہیں کہ مصلحت نہیں ہے یا اسے معلوم نہیں ہے بلکہ مصلحت بھی ہے اور اسے معلوم بھی ہے لیکن فرصت کس کو ہے کہ محبوب کے مشاہدہ (دیکھنا) جمال اور اس کے امر کے امتثال (حکم ماننا)

سے قطع نظر کرے اور توقف کرے اور تقریر بسیط (مفصل) بیان کرے فرصت ہی کس کو ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب نے قطع منازعت کے لئے عجیب دستور العمل تعلیم فرمایا ہے۔ فرماتے تھے کہ بھائی اگر کوئی شخص تم سے مباحثہ کرے تو تم اس مثل پر عمل کرنا کہ ایک حجام سے ایک شخص نے کہا کہ میری داڑھی کے سفید بال چن لو منکوحہ جوان عورت ہے اس کو سفید بال ناپسند ہیں کہیں بوڑھا سمجھ کر نفرت نہ کرے، جب میاں حجام کو لے کر بیٹھے تو اس نے ایک طرف سے شروع کر کے دوسرے کنارے تک پہنچا کر پوری داڑھی صاف کر کے آگے رکھ دی اور کہا مجھے کام بہت ہے آپ خود چھانٹ لیجئے مجھے اتنی فرصت نہیں کہ ایک ایک بال چنوں، بس اسی طرح جب تم سے کوئی کسی مضمون میں اُلجھے تم سب رطب و یابس اس کے حوالے کر کے اپنے کام میں لگ جاؤ اور ایسا نہ کرنا علامت اسکی ہے کہ اسکو کوئی کام نہیں، بالخصوص عشق و معرفت سے خالی ہونے کی تو یہ صاف علامت ہے حضرت شیرازی خوب فرماتے ہیں ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوے ⁂ چو بگذشت بر عارف جنگ جوی

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ ایک عارف جنگ جو پر گذرے)

گر ایں مدعی دوست بشناختی ⁂ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا) منازعت (جھگڑا کرنے) کی فرصت کس کو ہے اگر کسی معشوقہ خواہش کرے کہ فلاں وقت آؤ ہم ملنا چاہتے ہیں، مگر نہا دھو کر کپڑے بدل کر آراستہ پیراستہ ہو کر آنا تاکہ بدن اور کپڑوں میں بو نہ آئے سو وہ جان بھی گیا کہ اس واسطے کپڑے بدلنے کا حکم دیا ہے اور تمام احکام کا امتثال بھی کیا، حکمتیں بھی معلوم، مصلحت سے بھی واقف مگر جانے کے وقت کسی نے ہاتھ پکڑ کر دریافت کیا کہ آپ شوریدہ (پریشان) حال پھرا کرتے تھے آخر اس تغیر کی کیا وجہ حالانکہ وہ وجہ اور وجہ کی وجہ سے بھی واقف ہے لیکن اگر وہ مشاہدہ محبوبہ کا مشتاق ہے تو کیا وہ وقت کو کھوٹا کرے گا اور وجہ پر لیکچر دینا شروع

کرے گا۔ یا ہاتھ چھڑا کر کہے گا کہ میں نہیں جانتا یا میں نہیں بتاتا اور جا کر محبوب کے سامنے جا کر بیٹھ جائے گا۔ اگر اس نے لکچر دینا شروع کیا تو معلوم ہوگا کہ اس کو محض حکیمانہ محبت ہے عاشقانہ محبت نہیں ہے۔

حقیقی محبت اسی طرح اگر کوئی اہل اللہ سے اُلجھتا ہے اگر وہ واقعی طالب حق ہو اور اس کا منصب بھی تحقیق کا ہو اور بات بھی قابل تحقیق ہو تو افادہ سے دریغ بھی نہیں کرتے ورنہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم نا اہل ہیں ہم کچھ نہیں جانتے اپنے محبوب کی طرف۔ مسافت قطع کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں یعنی ذکر اللہ وطاعت میں لگ جاتے ہیں اس کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ کچھ نہیں جانتے اُنہیں اس کی پرواہ ہی کیا ہے اور واقعی جو ضروریات میں مشغول ہوگا اس کو فضولیات کی کب فرصت ہوگی۔

چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے جب بلخ کی سلطنت کو ترک کر دیا تو ان کے وزیر نے ایک روز حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور سلطنت تباہ ہو رہی ہے۔

رعایا سخت پریشان ہے درویشی کے ساتھ بھی تو سلطنت ہو سکتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ جب تک کوئی فکر دماغ میں ہوتی ہے تو دوسرا کام خوش اسلوبی کے ساتھ ہو نہیں سکتا۔ اگر تم اس فکر کو رفع کر دو تو البتہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں پھر لے لوں گا۔ وزیر نے سمجھا کہ کوئی ایسی فکر ہوگی۔

عرض کیا حضور ارشاد فرمائیں۔ دل و جان سے ہم لوگ اس فکر کے زائل کرنے کی کوشش کریں گے۔

حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ

یعنی ایک فریق جنت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں، مجھے یہ فکر پریشان کئے ہوئے ہے کہ میں کون سے فریق میں ہوں گا۔ تم اس سے بے فکر کر دو۔ وزیر یہ سُن کر دنگ رہ گیا وہ ان کی فکر کی زوال کی تو کیا کوشش کرتا اُسے اپنی وزارت سے وحشت ہوگئی اور خود اسی کو فکر دامن گیر ہوگئی۔ یہ فکر تو باعتبار محبت و معرفت کے ہے جو تفتیش مصالح کو بیکار بتاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی عظمت و حکومت کے حقوق پر نظر کی جائے اس کا مقتضا

بھی یہی تفتیش مصالح کا ممنوع ہوتا ہے چنانچہ ظاہری سلطنت کے قوانین یقیناً متضمن (شامل) مصالح ہیں اور ان احکام کی لم (علت، سبب) کو مجلس واضعان قوانین (قوانین بنانیوالی مجلس) ضرور جانتی ہے اور انھوں نے اس کو سمجھا بھی ہے اور انہیں کو سمجھنا ضروری بھی ہے لیکن عام رعایا پر صرف عمل کرنا واجب ہے اور عمل کے لئے لم (علت، سبب) کے معلوم کرنے کی انکو کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو صرف یہی کافی ہے کہ سلطنت وقت کا حکم ہے اور سلطنتِ وقت کا حکم واجب العمل ہوتا ہے لہذا ہم کو عمل کرنا چاہیئے۔

اے اللہ یہ عجیب بات ہے کہ سلاطین کے احکام پر عمل کرنے کے لئے تو ہمیں صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہو کہ یہ سلطنت وقت کے احکام ہیں اور خدائے تعالیٰ کے احکام میں حکمتیں تلاش کی جائیں اور جب تک حکمت نہ معلوم ہو ان پر عمل نہ ہو۔

مقام تحقیق مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالب علمی کہ چوں وچرا نہ کند و ہر درویشی کہ چوں وچرا کند ہر دو را بچرا گاہ باید فرستاد (جو طالب علم چون وچرا نہ کرے اور جو درویش چون وچرا کرے دونوں کو چراگاہ میں بھیجنا چاہیئے) طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو تحصیل علم میں مشغول ہو مثلاً ایک شخص طب پڑھتا ہے اس کو تو تحصیل کے وقت چون چرا واجب لیکن اگر مریض چون چرا کرے تو وہ کان پکڑ کر مطب سے نکال دینے کے قابل ہے۔ درویش سے مراد عامل ہے اس کو عمل چاہیئے، تحقیق اس کی دلیل یا علت کی اس کو ہرگز مناسب نہیں اور طالب علم سے مراد جو فن سیکھ رہا ہے مثلاً فقہ پڑھنے کے وقت لِمَ وکَیفَ (کیوں اور کس طرح) ضروری ہے اور وہ بھی اسی قدر جو فقہ کے مناسب ہے لیکن جو شخص قربانی کرنا چاہتا ہے اس کو خود دلیل ہی پوچھنا ایک لایعنی (بے فائدہ) بات ہے اور یہ پوچھنا کہ اسمیں کیا حکمت ہے یہ تو بڑی بے عظمتی حق تعالیٰ کے حکم کی ہے اور بڑی بے وقعتی اور گستاخی ہے۔

تو اگر کوئی رعایا حدود ہندوستان میں احکام گورنمنٹ کے مصالح میں گفتگو کرے تو بے تو گستاخی لیکن جرأت کی گنجائش اس لئے ہو سکتی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس گستاخی کی خبر شاہ جارج پنجم کو نہ ہو لیکن اللہ میاں تو یورپ میں نہیں ہیں وہ ہماری ذات سے بھی

زیادہ ہم سے نزدیک ہیں جیسا کہ منصوص ہے۔ خود فرماتے ہیں۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ الخ

یعنی میں تمہاری جان سے بھی زیادہ تم سے نزدیک ہوں۔

اقربیت کا مفہوم

یہاں میں اس کے متعلق ایک موٹی بات بتلائے دیتا ہوں جس سے یہ ایک مسئلہ کشفی بالکل بدیہی اور محسوس ہو جاوے ایک موٹی تقریر سے سمجھائے دیتا ہوں یعنی تم جو اپنی ذات سے نزدیک ہو، تو اپنے وجود اور ہستی کے سبب نزدیک ہو لیکن خود تم میں اور ہستی میں جو علاقہ ہوا ہے وہ کیسے ہوا آیا بلا واسطہ یا بواسطہ سو ہستی بلا واسطہ تو صرف خدا کی ذات کے لئے ثابت ہے کہ واجب الوجود ہے آپ کی ہستی تو واسطہ کی محتاج ہے اور واسطہ کو بہ نسبت ذی واسطہ زیادہ قرب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جو دو کاغذ گوند سے چپکا دیئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں بلکہ گوند جو کہ واسطہ ہے وہ زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ مثال سے پاک ہیں لیکن آخر میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں بھی پس جب اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہاری ہستی کے درمیان واسطہ ہیں تو وہ ہستی سے زیادہ قریب ہوئے۔

اور یہی حاصل تھا تمہارے ساتھ بہ نسبت تمہاری جان ہونے کا۔ پس تم سے اتنے قریب ہوئے جتنے کہ خود تم بھی اپنے قریب نہیں جیسا کہ گوند کی مثال میں سمجھایا گیا۔ یہ بہت موٹی بات ہے کہ کوئی قیل وقال کی گنجائش نہیں۔

حاصل یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم میں اور تمہاری ہستی میں علاقہ پیدا نہ کریں تو تم کچھ بھی نہیں۔ انہی کے واسطے سے تم تم ہوئے۔

مفید مراقبہ

جب وہ اتنا نزدیک ہے تو اب ایک کام کی بات بتلاتا ہوں سمجھ لیجئے اور میں استدلالی گفتگو نہیں کرنا چاہتا کیونکہ استدلالی گفتگو سے اطمینان نہیں ہوتا، ساکت کر دینا دوسری بات ہے عمل اور سمجھنے کے قابل بات بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب آپ کوئی سوال شریعت مقدسہ کی بات کریں جس میں سوال عن الحکمت (حکمت سے سوال کرنا) بھی داخل ہے تو پیشتر یہ تصور کر لیا کریں کہ ہم ایک مجلس میں حاضر ہیں جس کے صدر مجلس حق تعالیٰ ہیں اور ہم جو سوال کرتے ہیں اس کو وہ دیکھتے سنتے ہیں اور

یہ بھی تصور کریں کہ جس کی بابت ہمارا سوال ہے وہ خدا ہی کا قانون ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا چاہیے کہ آیا اس صورت مفروضہ میں ہم خدا تعالیٰ سے بھی یہ سوال کر سکتے۔ اگر ان سب مقدمات کے استحضار کے بعد بھی وجدان شہادت دے کہ ہاں پوچھ سکتے تو بس وہ سوال جائز ہے۔ ورنہ نہیں۔

اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آوے تو یہ دیکھئے کہ اگر آپ شاہ جارج کے دربار میں پہنچ گئے اور آپ کی ایسی جگہ نشست ہوئی کہ جہاں وہ آپ کو دیکھ بھی رہے ہیں اور آپ کی باتیں بھی سن رہے ہیں تو جو سوال آپ نے قوانین کی لم کی بابت ہندوستان میں بیرسٹر سے کیا تھا وہ خود بادشاہ سے بھی اس دربار میں کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہاں نہیں کر سکتے تو حق عظمت یہی ہے کہ ہندوستان میں بھی نہ کرو۔ جب یہ بات اس مثال میں طے ہو گئی کہ نہیں پوچھ سکتے تو کیا خدا تعالیٰ کی عظمت دنیوی سلاطین سے بھی کم ہے اور کیا اس کا حاضر و ناظر ہونا ان کے حاضر و ناظر ہونے سے بھی کم ہے نعوذ باللہ حالانکہ سلاطین کے دربار میں اگر کوئی سرگوشی کرنے لگے تو بعض اوقات سلاطین کو خبر بھی نہیں ہوتی تو گستاخی کا سوال چنداں بعید نہیں اور خدا تعالیٰ سے چھپا کر تو ایسی سرگوشی بھی نہیں ہو سکتی تو ایسی حالت میں گستاخی سخت حیرت ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں اور واقعی عاقل وہی ہے جس کی آنکھیں حق تعالیٰ نے کھول دیں وہ کہتے ہیں جب کوئی شخص مجھ سے مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر تصور کر کے سوچتا ہوں کہ آیا اس جواب پر اتنا اطمینان ہے یا نہیں کہ خدا کے سامنے دے سکوں اگر اتنا اطمینان ہوتا ہے تو جواب دیتا ہوں ورنہ نہیں۔ ہم لوگ حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر کیا سمجھتے ہیں۔ صرف الفاظ ہیں۔ اگر حاضر و ناظر سمجھتے تو ہماری اتنی جرأتیں نہ بڑھتیں۔

ایک شخص کہتے تھے وہ ایک اسلامی بادشاہ سے ملنے گئے لے گئے سخت پہرے کے بعد تو کہیں ایوان کے احاطے کے اندر رسائی ہوئی جہاں سے آرام گاہ شاہی بہت فاصلہ پر تھا۔ لیکن وہاں ایک بلند عمارت رفیع الشان تھیں جہاں کھڑکی میں بادشاہ سلامت بیٹھے تھے اور چاروں طرف دوربینیں لگی ہوئی تھیں۔ کبھی ادھر دیکھ لیتے کبھی ادھر

دیکھ لیتے جوں ہی انہوں نے دروازہ میں قدم رکھا بس ایک ہیبت طاری ہو گئی ہر وقت یہی احتمال کہ شاید اسوقت ادھر دیکھتے ہوں، سو باوجودیکہ دیکھنا بالکل مشکوک تھا لیکن صرف اسی خیال سے کہ شاید دیکھ رہے ہوں قدم نہیں اٹھتا تھا، اور باوجودیکہ ادھر ادھر عجیب و غریب ساز و سامان مجتمع تھے کہیں روشنی کہیں سبزہ کہیں پھلواری لیکن گردن پھیر کر نہیں دیکھ سکتے تھے اس واسطے کہ شاید نگاہ کند۔ ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ تعجب ہے اللہ تعالیٰ کے حاضر ناظر ہونے کے یقین کا تو اثر نہ ہوا اور بادشاہ کے دیکھنے کے احتمال کا اثر ہوا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو یہ معاملہ ہونا چاہیے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ٭ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

ہر وقت انہیں کو تکتے رہو جو شخص اس طرح سمجھے گا اس کو ساری شکلیں اصلاح کے متعلق آسان ہو جائیں گی۔ اسی کو یہ بزرگ فرماتے ہیں، یک چشم زدن الخ جو حاصل ہے مراقبہ "اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (کیا اس کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں) کا محض اہل قال ایسی اصلاح نہیں کر سکتے۔

اہل قال کا علاج

ہم لفظ پرستوں کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب غیر واقف اصول کوئی مریض آیا اور اپنا حال کہنا شروع کیا کہا کہ مجھے زکام ہے اس نے گل بنفشہ لکھ دیا پھر کہا کہ کھانسی بھی ہے اس نے ملٹھی بھی لکھ دی، غرض جو جو مرض وہ بیان کرتا گیا وہ طبیب صاحب ایک ایک جز بڑھاتے رہے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ نسخہ کیا ہو گا، مطبع مجتبائی کی فہرست ہو گی اور اتنے بڑے نسخے کو پیے گا کون۔

سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ سکندرہ راؤ میں پہنچے وہاں ایک بیچارے نام کے طبیب کس مپرسی کی حالت میں تھے شاہ صاحب کو بخار ہو گیا ان طبیب کو بلوایا وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اگر شاہ صاحب کی نظروں میں چڑھ گیا تو پھر خوب شہرت ہو جاوے گی اور مطب چل جائے گا، بہت اہتمام کے ساتھ عمامہ باندھ کر عبا

قبا پہن کر پہنچے۔ نبض دیکھ کر حالات پوچھ کر ہر شکایت کے لئے بہت سے اجزاء تجویز کرتے گئے اور ایک کھرے کا کھرا نسخہ لکھ دیا۔ شاہ صاحب نے نذرانہ بھی دیا۔ بڑے خوش ہوئے اور اگرچہ شیخی بگھارنے لگے کہ شاہ صاحب نے ایسی قدر کی۔ شاہ صاحب کے شاگردوں میں بڑے بڑے قابل لوگ موجود تھے نسخہ پڑھا گیا سب نے ہنسنا شروع کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اہل فن کی بیقدری نہ کرنی چاہیئے۔ مولوی حیدر علی صاحب جو مشہور مناظر ہیں اور طب بھی پڑھی تھی وہ سب سے زیادہ ہنسے لیکن شاہ صاحب نے اس نسخہ کے تیار کرائے جانے کا حکم دیا۔ نسخہ پتیلی میں پکایا گیا۔ سیر دو سیر اجزاء تھے۔ شاہ صاحب نے کئی دن تک پیالے بھر بھر کر پیئے۔ شاہ صاحب کے اخلاق ایسے وسیع تھے اس طبیب کی بڑی شہرت ہو گئی، اب تو گویا شاہ صاحب نے فتوے پر الجواب صحیح (جواب ٹھیک ہے) لکھ دیا۔

بعضے طبیب تو ایسے ہوتے ہیں جیسا ذکر ہوا۔ اور بعضے وہ ہیں کہ وہ اصل جڑ مرض کی دیکھ لیتے ہیں کہ بلغم یا صفرا بڑھ گیا ہے اور ایک مختصر اور جامع نسخہ لکھ دیتے ہیں اگر پچاس شکایتیں بھی پیش کی جائیں تو وہ یہی کہہ دیتا ہے کہ ہاں ہم نے سب کی اصلاح کر لی ہے۔ جاہل ناواقف مریض اس کے نسخہ کی ناقدری کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ذرا سے نسخہ میں اتنے امراض کی کیسے رعایت ہو گئی۔ حالانکہ وہ ان سب امراض کی جڑ کو سمجھ گیا ہے مگر ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی شکایتوں کا سبب کوئی ایسی ایک چیز ہے جس کا علاج کر لیا گیا ہے۔

ایک بوڑھے شخص کا قصہ ہے کہ اس نے ایک طبیب سے اپنا حال کہا کہ آنکھوں میں تیرگی ہے طبیب نے کہا بڑھاپے سے اس نے کہا سانس پھول جاتا ہے کہا یہ بھی بڑھاپے سے ہے پھر کہا بھوک نہیں لگتی کہا یہ بھی بڑھاپے سے غرض جو شکایت کی اس نے یہی جواب دیا کہ یہ بھی بڑھاپے سے ہے آخر وہ بڈھا بگڑ گیا اور طیش میں آکر اس طبیب کے ایک دھول رسید کی کہ تو نے ساری طب میں بس یہی پڑھا ہے کہ بڑھاپے سے طبیب نے کہا بڑے میاں یہ بے جا غصہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے تمہارے اس مارنے کا بھی برا نہیں مانتا۔

بس اصل طبیب وہ ہے جو جڑ سمجھ جاوے سو اہل قال کا علاج تو اس حکیم کا سا ہے

کہ جو ہر ہر مرض کے لئے ایک ایک جز و بڑھاتا گیا۔ کسی نے شکایت کی وسوسے بہت آتے ہیں ایک وظیفہ بتلا دیا پھر اس نے کہا کہ وظیفے میں بھی وسوسے آتے ہیں۔ ایک دوسرا وظیفہ بتلا دیا، جب کہا اس میں بھی وسوسہ ستاتا ہے تو ایک تیسرا بتلا دیا، مگر وہاں وہی وسوسے موجود جتنا علاج کیا شکایتیں بڑھتی گئیں۔ علاجوں کی کثرت سے وہ سراپا دوا اور وظیفوں کی کثرت سے مجموعِ وظائف ہو گیا۔ یہ دیکھ کر دین سے وحشت ہونے لگی کہ خدا کی پناہ کیسی مصیبت ہے۔

اہل اللہ کا علاج

برخلاف اس کے ایک شخص ایسا ہے جو جڑ سمجھتا ہے وہ بس یہ کہہ دے گا کہ وسوسوں کی طرف التفات مت کرو اگر آتے ہیں آنے دو تمہارا کوئی نقصان نہیں یہی حاصل ہے دارد فی الحدیث کا ناواقف سمجھا کہ انہوں نے نہ لیا چوڑا وظیفہ بتلایا نہ توجہ کے لئے سامنے بٹھلایا نہ کچھ کیا یہ کیا علاج ہو گیا کہتے ہیں کہ وسوسہ کا خیال مت کرو، بھلا کیسے خیال نہ کریں معلوم ہوا کہ وہ معتقد ہی نہیں اگر کوئی معتقد ہوگا تو وہ یہی کہے گا کہ ؎

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے)

اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید ٭ کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

(امر مباح جو بظاہر طریقت کے خلاف ہونے سے منکر معلوم ہوتا ہے اگر مرشد بتلا دے تو اس پر عمل کرے اس کو مضر نہ سمجھے بلکہ مفید سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ الخ جاہل عالم برابر نہیں۔

ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ قبض شدید میں مبتلا ہوں جی نہیں لگتا وظیفے بھی بڑھائے نفلیں بھی بڑھائیں لیکن کچھ نفع نہیں ہوا۔ انہوں نے مرض کا مرض سے علاج کیا جیسے کسی کو شربت نیلوفر پینے سے تو زکام ہوا اس نے اس کے علاج میں پھر شربت نیلوفر ہی پی لیا۔ میں بفضلہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا وظیفے نفلیں سب یک لخت چھوڑ دو خلوت بھی چھوڑ دو۔

خلوت بھی چھوڑ دو دوستوں سے ملو جلو، ہنسو بولو۔ لکھنؤ کے قریب رہتے تھے میں نے کہا لکھنؤ آؤ عیش باغ کی سیر کرو، چوک میں پھرو خوب میوے کھاؤ۔ گناہ تو مجبوری مت اور سب طرح کی تفریح کرو۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ جس نے یہ باتیں بتلائی ہیں وہ بڑا اناڑی ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے کے ساتھ ہی ان کا سب قبض رفع ہو گیا اور پھر خوب جوش و خروش اور ذوق و شوق پیدا ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ بس اب حجرے میں بیٹھئے۔ شگفتہ ہو گئے کھل گئے۔ باغ و بہار لے کر اندر بیٹھ گئے۔ اہل ظاہر نے ہر چیز کا الگ علاج کیا۔ توحید میں کسی نے وسوسہ کیا اسکی دلیل بیان کر دی۔ قربانی میں وسوسہ کیا اسکی بھی دلیل بیان کر دی۔ ڈاڑھی میں وسوسہ، پانچ وقت کی نماز کے تعین میں وسوسہ، ہر ہر حکم میں وسوسہ سب کی دلیل بیان کر دی۔ مولانا سمجھے شفا ہو گئی۔ لیکن جب وہ پھر یاران طریقت کے جلسے میں پہنچا۔ وہاں پھر ایک شبہ پیدا ہو گیا۔ مولانا کا ذخیرہ سب ایک دم سے ختم ہو گیا سب مقدمات میں شبہ پڑ گیا۔

حضرت محی الدین بن عربی نے امام رازیؒ کو ایک خط لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ایک روز بیٹھے رو رہے تھے کسی نے سبب پوچھا تو تم نے کہا کہ ایک مسئلہ فلسفہ کا میں تیس برس سے محقق سمجھے ہوئے تھا۔ آج اس کے ایک مقدمہ میں شبہ پڑ گیا میں اس لئے رو رہا ہوں کہ تیس برس تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی جو کچھ علم ہے اس کی بابت یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے سو تم نے دیکھا اپنے علم کو ہمارے علم میں قیامت تک بھی کوئی شبہ نہیں پڑ سکتا۔ اس کو حاصل کرو امام نے پھر تصوف کی طرف توجہ کی حضرت نجم الدینؒ سے بیعت ہوتے شغل شروع کیا۔ اس میں کوئی چیز اپنے اندر سے انہیں سُر سُر نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ شیخ سے عرض کیا انہوں نے کہا فلسفہ نکل رہا ہے۔ انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ اتنے دن کی حاصل کی ہوئی چیز ہاتھ سے جاتی رہے۔ بولے نا صاحب میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا فلسفہ نکل جاوے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے آئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کی صحبت نے یہ اثر کیا کہ وہ حقیقت کو اجمالاً سمجھ کر کہتے ہیں ؎

نہایۃ اقدام العقول عقال ؛ وغایۃ سعی العالمین ضلال

(تمام عقلوں کے قدموں کی انتہا عقال کی طرف ہوئی تمام دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا)

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا ÷ سوی ان جمعنا فیہ قیل بقال

(ساری عمر بجز بک بک اور قیل وقال کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ عمر یونہی ضائع کی۔

حضرت مرتے وقت آپ کو علوم حقیقہ اور لفظیہ کی حقیقت معلوم ہوئی ہو گی۔ مرتے وقت تو یہ معلوم ہی ہو گی یہیں معلوم ہو جاتی ہے۔ اہل اللہ کو کوئی شبہ ہی نہیں ہوتا یا نہیں رہتا بخلاف اہل قال کے۔

وجہ فرق یہ ہے کہ وہ ہر شبہ کا الگ الگ جواب نہیں دیتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص سو بیگہ زمین کو جس پر جھاڑ جھنکاڑ کھڑے ہوتے صاف کرنا چاہتا ہے تو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ درانتی لے کر ایک طرف سے جھاڑوں کو کاٹنا شروع کیا سو درانتی منگائی گئیں اور سو آدمیوں کے حوالہ کی گئیں۔ ایک درانتی کند ہو گئی وہ بدلی پھر دوسری کند ہو گئی اسے بدلنا پڑا، پھر تیسری کند ہو گئی ایک شخص آیا اس کے پاس دیا سلائی کا بکس ہے اس نے مٹی کا تیل چھڑکا اور دیا سلائی لگا دی "آناً فاناً" سب بھڑ بھڑ جل گیا درانتیوں سے ایک ماہ میں جا کر کہیں صفائی ہوتی اور پھر بھی ویسی نہیں۔ یہاں ایک گھنٹہ میں سب زمین صاف ہو گئی۔ اب اس میں ہل چلاؤ کھیتی لو دو۔

اسی طرح اہل اللہ سے کوئی شکایت کرتا ہے کہ وسوسے آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں محبت پیدا کرو۔ اگر کہتا ہے کہ نماز میں ادھر ادھر کے خیالات آنے لگتے ہیں وہ پھر یہی کہہ دیتے ہیں کہ محبت پیدا کرو (عشق پیدا کرو۔ واقعی کہاں درانتی اور کہاں آگ وہاں درانتی بھی کافی نہیں یہاں سب جھاڑوں کا ایک علاج یعنی (عشق ومحبت) اسی کو حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

ہر کرا جامہ ز عشق چاک شد ÷ او ز حرص وعیب کلی پاک شد

(جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے)

شاد باش ای عشق سودای ما ⁂ اے طبیب جملہ علتہائے ما

اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

عشق آں شعلہ است کوچوں برفروخت ⁂ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے۔

ہر چیز میں سب شامل ہے خواہ نماز میں شبہ ہو یا روزہ میں شبہ ہو ؎

تیغ لا در قتل غیر حق براند ⁂ در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

لا الٰہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الٰہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا۔

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ⁂ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

یعنی الا اللہ باقی رہ گیا تمام فنا ہو گئے اے عشق عزت شرکت سوز تجھ پر آفرت کے سوائے محبوب حقیقی کے سب کو فنا کر دیا۔

شرکت سوز ہے کسی کو شریک نہیں رکھتا کیونکہ ؎

چو سلطان عزت علم برکشد ⁂ جہاں سر بجیب عدم درکشد

جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔ آفتاب کے سامنے سب ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اسی طرح جب تجلی حق قلب پر ہوتی ہے واللہ سب چیزیں رخصت ہو جاتی ہیں۔ جیسا آفتاب کے سامنے سب ماند ہو جاتے ہیں چاہے وہ چاند ہی ہو۔

ایک عارف کا قول ہے کہ اندھیری کوٹھڑی میں چوہے چھچھوندر سانپ بچھو سب نے آ کر گھیر لیا ساری رات لکڑیاں بجاتا پھرا لیکن نہ بھاگے بلکہ کہیں چوہیا نے پیر میں کاٹ لیا۔ کہیں اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑے غرض ساری رات یہ مصیبت رہی لیکن موذیوں سے نجات نہ ہوتی۔ دلائل کی حالت ان لکڑیوں کی سی ہے۔ محبت حق کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شمع روشن کر دی اس کے روشن ہوتے ہی سب سانپ بچھو چوہے چھچھوندر بھاگ گئے

چلے جا رہے ہیں اسی وقت میدان صاف ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں روشنی میں نہیں ٹھہر سکتیں۔ جہاں ظلمت ہوتی ہے وہیں رہتی ہیں۔ ان کے دفع کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ چراغ روشن کر دو۔ گنڈا سہ لکڑ نہیں کام دے سکتا ہے۔ سو اہل اللہ کا علاج ایسا ہی ہے یعنی محبت حق۔ جس وقت عظمت اور محبت حق تعالیٰ کی قلب میں سما جاتی ہے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا۔ محققین نے یہی علاج تجویز کیا ہے کہ ہر حکم کو محبت سے قبول کرتے ہیں، چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے تعجب ہے اُن احمقوں پر جو پوچھتے ہیں کہ قبر کا عذاب کیونکر ہوگا۔ اس تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ فکر تو اس کی چاہیئے کہ اس سے نجات کا کیا طریقہ ہے۔ اگر کسی پر مقدمہ فوجداری کا قائم ہو کر سزائے موت کا حکم ہوگیا ہو اور لوگ کہتے ہوں کہ اپیل کی بھی گنجائش ہے تو اس کو تو یہ مناسب ہے کہ براءت کی کوشش کرے نہ یہ کہ اس فکر میں پڑ جائے کہ کس طرح موت ہوگی آیا پھانسی پر لٹکایا تلوار سے گردن ماری جاوے گی اور یہ کہ پھانسی سے آدمی مر کیوں جاتا ہے۔ گلا گھونٹنے کو موت میں کیا دخل ہے۔ اس احمق سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر ایسی تحقیقات میں پھانسی کا وقت آگیا تو تجھے تیری سائنس کیا کام دے گی۔ جو بات خود معلوم ہونے والی ہے اسکی تحقیق کیا۔

حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ بس اس تحقیقات کو چھوڑ کر قبر کا عذاب کیونکر ہوگا اسکی تلاش کر کہ اس سے نجات کی سبیل کیا ہے۔ اگر نجات ہوگئی اور کیفیت عذاب قبر کی نہیں معلوم ہوئی تو ہمارا ضرر ہی کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ نقصان ہی کیا ہوگا۔ پھانسی سے رہائی ہوگئی اور یہ تحقیق نہ ہوا کہ کیونکر جان نکلتی ہے تو اس کا ضرر کیا بخلاف اس کے اگر یہ تحقیق بھی ہوگیا، مگر جان نہ بچی تو نفع کیا ہوا۔

ترک مالا یعنی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان جائیے۔ ہم کو کیسی اچھی تعلیم فرمائی ہے کہ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ جس کام سے کوئی غرض متعلق نہ ہو اس کو چھوڑ دو۔ اگر حکمت کسی حکم کی نہ معلوم ہوئی تو اس پر ہمارا کون سا کام اٹکا ہے۔ اگر بے حکمت سمجھے کر لیا تو حرج کیا ہوا۔

حکمت سے بحث کرنیوالوں کا ایک عذر اور اس کا جواب

لوگ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم مخالفین کا بھی تو کچھ جواب دیں تو کیا بس ان کے لئے یہی جواب ہے کہ ہر حکم کی حکمت بتلائی جاوے۔ کہ یہ جواب دے دیا کرو کہ ہم عالم نہیں علماء سے پوچھو۔ پھر عالم لوگ آپ نمٹ لیں گے تم کس فکر میں پڑے؟

مولانا نعیم صاحب لکھنوی سے کسی شخص نے پوچھا کہ حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی بابت کیا تحقیق ہے۔ کون حق پر تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہارا سوال ہے یا کسی اور کا۔ انہوں نے کہا کہ فلاں حافظ جی نے پوچھا ہے۔ دریافت فرمایا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔ کہا جوتے سیتے ہیں۔ اور تم کیا کرتے ہو۔ عرض کیا میں کپڑا رنگتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اطمینان رکھو تمہارے پاس یا حافظ جی کے پاس ان کا مقدمہ نہیں آوے گا تم جا کر اپنا کپڑا رنگو اور حافظ جی اپنے جوتے سیئیں۔ تمہارے پاس مقدمہ آوے تو کہہ دینا کہ ہمارے حدِ اختیار سے خارج ہے۔ ان کے مقدمہ کا فیصلہ اللہ میاں کے یہاں ہو رہے گا تمہیں اسکی تحقیقات کی ضرورت ہی نہیں تم اپنے کام میں لگو کس جھگڑے میں پڑے۔ اگر کوئی ادنیٰ درجے کی رعایا سے پوچھے کہ وزیر کوئی جرم کرے تو اسکی کیا سزا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ میرے پاس اس کا مقدمہ ہی نہ آوے گا میں کیا جانوں۔ اسی طرح جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا مقدمہ جاوے گا وہ خود جانتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ عوام کو کیا بحث؟

علماء سے شکایت

مگر علماء کے اخلاق نے عوام کے دماغ کو خراب کر دیا ہے میں تو ایسے علماء ہی پر الزام لگاتا ہوں ؎

ہر کس از دست غیر نالہ کند ٭ سعدی از دست خویشتن فریاد

یعنی ہر شخص دستِ غیر سے نالاں ہے اور سعدی اپنے ہاتھ سے۔ یعنی ہر شخص عوام کی شکایت کرتا ہے مگر مجھے علماء کی شکایت ہے۔

اگر کسی نے حکمتیں پوچھیں بس انہوں نے حکمتیں بیان کرنا شروع کر دیں اس کے بعد کہیں اس میں شبہ کہیں اس میں شبہ۔ البتہ اگر کسی قانونی مولوی سے کوئی حکمتیں پوچھے وہاں صاف

جواب ملے گا کہ حکم پوچھو حکمت مت پوچھو۔

ایک شخص نے مجھے لکھا کہ فلاں حکم شرعی میں کیا حکمت ہے میں نے پوچھا کہ آپ کے سوال عن الحکمت (حکمت کے دریافت کرنے) میں کیا حکمت ہے۔ تم خدا تعالیٰ کے فعل کی ہم سے حکمت پوچھتے ہو۔ ہم تمہارے ہی فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں اور ہم نہیں بتلاتے کہ کیا حکمت ہے جاؤ۔

کئی دن ہوئے ایک صاحب نے پوچھا کہ فلاں فتویٰ پر آپ کی مہر ہے میں نے کہا کہ آپ کیوں تفتیش کرتے ہیں۔ کیا آپ میرے انسپکٹر ہیں یہ کیوں پوچھتے ہو اس پر تمہارا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ سے تعلق ہے اور لوگ پوچھتے ہیں میں نے کہا آج سے تعلق قطع کر دو، دل سے محبت نکال دو اور اگر محبت رکھتے ہو تو ہمارا یہ کہنا مانو کہ یہ سوال مت کرو۔ علماء نے عوام کے اخلاق خراب کر دیئے۔

ایک صاحب کا جو کہ سب انسپکٹر تھے میرے پاس خط آیا انہوں نے یہ لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ کافر عورت سے زنا کیوں حرام ہے۔ اس پر شکایت کا خط آیا کہ علماء کو ایسا خشک جواب نہ دینا چاہیے۔ میں نے اس خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔

اتفاق سے ایک مقام پر وہ مجھ سے ملے تو میں نے انہیں پہچانا نہیں وہ مجھے پہچانتے تھے انہوں نے مجھ سے اس خط کا ذکر کر کے کہا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے وہ خط بھیجا تھا میں نے کہا آہا آپ سے تو بڑی پرانی بے تکلفی نکلی۔ کہنے لگے آپ نے ایسا خشک جواب کیوں دیا تھا؟ میں نے کہا کہ آپ سب انسپکٹر ہیں مجھے یہ بتلایئے کہ آیا آپ کا برتاؤ سب کے ساتھ خصوصیت کا ہے یا بعضوں کے ساتھ ضابطہ کا بھی ہے انہوں نے کہا کہ سب کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ نہیں ہو سکتا جو خاص ملنے والے ہیں ان سے خصوصیت کا معاملہ ہے باقی سب سے محض ضابطہ کا۔

میں نے کہا تو بس آپ بھی یہی سمجھ لیجئے کہ ہم لوگ بھی یوں ہی کرتے ہیں بجز بے تکلفوں سے ہمارا خصوصیت کا برتاؤ ہے۔ باقی اوروں سے ضابطہ کا۔ چونکہ آپ سے پہلے ملاقات نہیں تھی اس لئے آپ کے حالات و خیالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہم نے ضابطہ کا جواب دیا۔ لیکن اب آپ کے پاس ایسا جواب نہ پہنچے گا۔

مگر جیسا کہ اس ملاقات کا اثر میرے اوپر ہوا ہے آپ پر یہ اثر ہوگا کہ اب آپ بھی ایسا

یہ وہ سوال کبھی نہ کریں گے۔ میں نے سوچا کہ جب میں اپنے کو مقید کر رہا ہوں تو انہیں بھی کیوں نہ مقید کر دوں۔ انہیں کیسے یوں ہی چھوڑ دوں لوگ اب ایسے ہی فضول سوالات کرنے لگے ہیں۔

کیرانہ کا قصہ ہے کہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ نماز پانچ وقت کیوں مقرر ہوئی اس میں کیا مصلحت ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری ناک آگے کیوں لگی ہے پیچھے کیوں نہ لگی یہ سن کر بڑے دنگ ہوئے اور کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ایسی ہی بنادی۔ میں نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ نماز بھی میرے ابا جان کی بنائی ہوئی نہیں ہے یہ بھی اللہ میاں ہی کی بنائی ہوئی ہے کیا لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ احکام مولویوں کے تصنیف ہیں۔

ایک بڑھیا کی حکایت یاد آئی جب حج میں صفا مروہ کے دو تین چکر لگا چکی تو ہاتھ جوڑ کر مطوف سے کہتی ہے کہ مولوی صاحب اب چلا نہیں جاتا اللہ کے واسطے معاف کر دو۔ اس نے جواب دیا کہ میرے گھر کی تو بات نہیں مت چل تجھے اختیار ہے غرض احکام شرعیہ سب اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں انہیں سے حکمتیں پوچھ لینا وہ یا تو زبان سے جواب دیں گے یا ہاتھ سے اور زبان سے کیوں دینے لگے ہاتھ سے ہی جواب دیں گے فقط اتنی بات کہ خدا کا حکم ہے یا نہیں یہ تو تحقیق کر لو۔ پھر یہ مت دیکھو کہ اس میں کیا حکمتیں ہیں، حکمتیں مقرر کرنیوالا جانے ہمیں امتثال سے مطلب۔ اس طرز کی برکت سے انشاء اللہ ایک دن وہ بھی آجاوے گا کہ حکمتیں اور اسرار بھی معلوم ہو جاویں گے۔

ثمرہ اطاعت

شاید کسی کو بہت ہی شوق ہو۔ میری تقریر سن کر وہ کہتا ہو گا کہ انہوں نے تو بالکل ہی بند کر دیا جی میں ارمان ہی رہ گیا۔ سو میں بشارت دیتا ہوں کہ اگر اسرار جاننے کا شوق ہے تو یہ طرز یعنی اطاعت اختیار کیجئے۔ میں وعدہ بلکہ دعویٰ بجربہ کی بنا پر کرتا ہوں کہ اطاعت سے ایک نور اس کے قلب میں ایسا پیدا ہو گا جس سے یہ حالت ہو گی کہ

بینی اندر خود علوم انبیاء ٭ بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب و بے مددگار و استاذ انبیاء کے جیسے علوم دیکھو گے)

خود بخود اُس کے قلب میں اسرار جھلکیں گے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص بغاوت کرتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ میں شاہی اسرار پر مطلع ہو جاؤں خزانہ شاہی کے حالات معلوم ہو جائیں بلکہ شاہی بیبیوں کے خط و خال اور حسن و جمال تک کا مشاہدہ کر لوں۔ تو بادشاہ اس کے اتنے لگاوے گا کہ یہ بھی یاد رکھے گا، گمر اسرار معلوم کرنا چاہتے ہو تو فدا ہو جاؤ بادشاہ پر۔ فدوی جو آجکل لکھا جاتا ہے یہ شاہی زمانہ میں بڑا رتبہ تھا جس سے بہت ہی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی اس کو فدوی کا منصب دیا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ بادشاہ کے فدائیوں اور جاں نثاروں میں ہیں۔ پرانے زمانہ کی مہریں میں نے دیکھی ان میں بعضے ناموں کے ساتھ فدوی لکھا ہے۔ یہ بڑی خصوصیت کا رتبہ تھا عاشق کا ہم معنیٰ ہے تو بس تم بھی حق کے فدوی ہو جاؤ۔ کامل اطاعت اور جان نثاری کی شان پیدا کر دو عجب نہیں کہ وہ دن آوے کہ بادشاہ خوش ہو کر خود ہی کہے کہ آؤ میں تمہیں اپنا خزانہ دکھلا دوں اور خزانہ شاہی پر لے جا کر کھڑا کر دے کہ یہ جواہرات ہیں اور یہ محلات ہیں اور عجب نہیں جو زیادہ مہربان ہو اور زیادہ اعتماد ہو جاوے تو محل سرائے میں بھی لے جا کر دکھلا دے کہ یہ ہماری بیبیاں یہ ہماری باندیاں ہیں وہاں تمام اسرار اُسے نظر آجاویں گے۔ بس اطاعت ہی اس کا طریقہ ہے۔ خدا جانتا ہے۔ ترکِ استدلال سے اطلاعیں ہوئی ہیں جس کو ہوئی ہیں اسرار منکشف ہوئے ہیں۔ خود رائی کے چھوڑنے سے حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست ٭ کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(یعنی عالم عاشقی میں اپنی فکر و رائے بالکل بیکار ہے اس مذہب میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

دیکھئے خود رائی کو کفر کہتے ہیں، جنہوں نے اپنے کو فدا کر دیا اور بلا تفتیش اور بلا چون و چرا کامل اطاعت اختیار کی ان کو حق تعالیٰ اپنے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں، حسب استعداد یہ میں نہیں کہتا کہ تمام اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں لیکن اتنا ضرور کر دیتے ہیں کہ ایسا اطمینان ہو جاتا ہے کوئی شبہ و شک نہیں رہتا۔

حقیقت صدیقیت اور اس مرتبہ کا نام صدیق ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کا یہی مرتبہ تھا۔ ایسا شخص نہ معجزہ کا طالب ہوتا ہے نہ کرامت کا اس کا قلب گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ حق ہے اس کو کبھی وسوسہ نہیں ہوتا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نبی ہوں آپ نے فوراً تصدیق کی اور پڑھا،

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)

حضرت عبداللہ بن سلام کہتے ہیں:

فلما تبینت وجهه عرفت انه لیس بوجه کذاب

(یعنی جبکہ آپ کا چہرہ مبارک ظاہر ہوا تو میں پہچان گیا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا)

طلب سے بھی صدیقیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسا عبداللہ بن سلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہے سچ ہے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی ؛ نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(دلی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے)

اس کا ترجمہ مولوی ابوالحسن صاحب نے کیا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور ؛ کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اہلِ کمال کی پہچان اور یہاں میں ایک بات قابل یاد رکھنے کی بتلاتا ہوں کہ ایسی شہادت ہر شخص کے قلب کی معتبر نہیں ہے بلکہ اہل دل کی معتبر ہے یعنی جس کی طرف علماء صلحاء اتقیاء متوجہ ہوں وہ درویش کامل ہے اور جس کی طرف عوام زناکار شرابی اہل مال و جاہ رجوع ہوں وہ درویش نہیں۔ اہل تقویٰ کی آنکھ میں جو سما گیا وہ کامل ہے بہت شعبدہ باز مکار اس زمانہ میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف عوام ہجوم کرتے ہیں ایسے ایسے سائل گداگر آتے ہیں کہ ڈیوڑھی پر کھڑے بتلا دیتے ہیں کہ دیکھو فلانی انگنی پہ یہ کپڑا پڑا ہے ہم وہی لیں گے لوگ ہیبت کے مارے لا کر دے دیتے ہیں کہ شاہ صاحب بڑے غیب داں ہیں حالانکہ وہ غیب داں نہیں بلکہ عیب داں ہیں عوام ایسے

کو سمجھتے ہیں کہ بڑا بزرگ ہے گھر کی بات بتلادی اگر بزرگ ہوتے تو بھیک کیوں مانگتے۔

ایک ایسے ہی شاہ صاحب ہمارے دروازے پر پہنچے اور صدا لگائی۔ اندر سے کچھ آٹا بھیجا گیا لیکن آٹا بھلا وہاں کیا قبول ہوتا لمبی چوڑی فرمائشیں شروع کیں۔ میں اوپر تفسیر لکھ رہا تھا۔ دیر تک جھک جھک چخ چخ ہوتی رہی۔ میرا جی گھبرایا بالآخر خود مجھے نیچے آنا پڑا دیکھا تو ایک نہایت وجیہ شخص ہیں۔ بڑا جوغہ زیب تن کئے ہوئے لنگی باندھے ہوئے۔ بڑا سا عمامہ باندھے تسبیحیں بہت سی گلے میں ڈالے ہوئے عصا ہاتھ میں لئے جیسے کوئی شیخ المشائخ۔ میں نے کہا شاہ صاحب کیا تکرار ہے کہا ہم نقد لیں گے۔ ہم آٹا نہیں لیتے۔ میں نے کہا شاہ صاحب جس کو جو توفیق ہو۔ وہی لے لینا چاہیئے۔ ہمیں آٹے کی توفیق ہوئی اسی کو قبول فرمالیا جاوے۔ میرے پاس کوئی جبا نہیں ہوتی۔ قبا نہیں ہوتی۔ سادہ کرتہ پاجامہ پہنتا ہوں۔ مجھے انہوں نے دھمکانا شروع کیا اور بڑے زور میں آکر پڑھا ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست ؎ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر شخص کو خالی تصور نہ کرو شاید کہ کشف، وکرامت اور محبت الہٰی سے لبریز خدارسیدہ اور قطب وابدال ہو)

میں نے کہا کہ جناب آپ کو بھی تو یہی خیال کرنا چاہیئے کہ ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست ؎ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر شخص کو خالی گمان نہ کرو شاید کشف وکرامت اور محبت الہٰی سے لبریز خدا رسیدہ اور قطب وابدال ہو)

پھر تو شاہ صاحب بڑے چکرائے اور سمجھے کہ یہ تو طالب علم نکلا۔ اس سے بے ڈھب پالا پڑا پھر میں نے سختی کے ساتھ کہا کہ آپ کی عقل ماری گئی ہے آپ نے میری نرمی کی قدر نہ کی اب یا تو سیدھی طرح سے اپنا راستہ لیجئے ورنہ میں کان پکڑ کر باہر کردوں گا بس پھر دم بھی نہیں مارا چپکے چلے گئے، ایسوں کا یہی علاج ہے۔

شاہجہاں پور میں ایک بنا ہوا فقیر آپہنچا پٹھانوں کے پاس آکر کہا کہ میں یہاں قطب ہو کر آیا ہوں۔ مجھ پر ایمان لاؤ پٹھان بیچارے سیدھے سادھے ہوتے ہیں، انہوں

نے کہا اچھا بھائی تم قطب سہی ایک پٹھان بڑے چلتے ہوئے تھے ان کے پاس بھی جاکر یہی کہا کہ میں یہاں قطب ہوکر آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ قطب ہوں گے لیکن میں تصدیق نہیں کر سکتا کیونکہ آپ سے پہلے میں یہاں کا قطب تھا۔ میرے پاس آپ کے قطب ہونے کی اطلاع نہیں پہنچی بلا اطلاع میں آپکو چارج نہیں دے سکتا۔ یا تو آپ اپنی تقرری کی چٹھی میرے پاس بھجوا دیجئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ باغی ہیں اور شہر سے پٹوا کر نکلوا دوں گا۔

غرض انہوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اس کو پیچھا چھڑانا مشکل پڑ گیا۔ اور سوچا کہ بھائی یہاں دال نہیں گلے گی اور دوسرے ہی دن غائب ہو گئے۔ اس خوف سے کہ کہیں پٹ نہ جاؤں ساری قطبیت ختم ہو گئی۔

اعتقاد عوام

مگر عوام الناس کے اعتقاد کی یہ کیفیت ہے کہ میں ایک دفعہ مسجد سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ننگ دھڑنگ لنگی زمین پر بچھائے ہوئے اس پر بیٹھا ہے اور مجمع کا مجمع مسلمان ہندو چاروں طرف حلقہ باندھے کھڑے ہیں جیسے شمع کے گرد پروانے۔ غور کیا تو یہ وہی شخص تھا جس نے ہماری مسجد میں تھوڑی دیر پہلے آکر چھڑکاؤ کیا تھا اس وقت تو لنگی باندھے ہوئے تھا اور باہر لنگی اتار کر ننگا جا بیٹھا خدا کی مار پھر عصر کے وقت مع لنگی کے مسجد میں موجود میں نے پوچھا کہ تم بلا لنگی کے باہر کیوں بیٹھے تھے۔ بس اس پوچھنے پر خفا ہو کر چلے گئے بعض کا گمان تھا کہ قطب ہے۔ اگر ایسے ایسے لوگ بھی قطب ہونے لگے تو پھر دنیا میں کوئی اہل باطل ہی نہیں آج کل یہ حالت ہے کہ جو جتنا شریعت سے دُور اتنا ہی وہ خدا رسیدہ اور مقبول اور جو شخص جتنا شریعت سے قریب بس ملا ہے۔

یاد رکھئے جس کو آنکھوں والے کہہ دیں کہ یہ کامل ہے وہی کامل ہے ورنہ ایسا ہی ہے جیسا اندھوں نے ہاتھی کا حلیہ بیان کیا تھا۔ اندھوں کی آنکھیں تو ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی کہیں سے پہنچ گیا جلسہ ہوا کہ تحقیقات ہو گی، ہاتھی کیسا ہوتا ہے ایک ایک کر کے سب پہنچے اور ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر حلیہ دریافت کیا ایک نے آکر کہا کہ سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس نے سونڈ ٹٹولی تھی۔ دوسرا بولا نہیں مورچھل کی طرح ہوتا ہے اس کا پونچھ پر ہاتھ پڑا ہو گا تیسرا آیا کہ پنکھے کی مانند ہوتا ہے اس نے کان دیکھا تھا۔ ایک نے کہا

نہیں تخت کے مشابہ ہوتا ہے اس نے کمر دیکھی تھی پھر آپس میں خوب لڑائی ہوئی۔ اگر کوئی سوانکھا وہاں ہوتا تو وہ کہتا کہ سب جھوٹے ہو اور سب سچے ہو سب نے ایک ایک جز دیکھا ہے پورا ہاتھی کسی نے نہیں دیکھا، اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ÷ چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(سوائے طریق سنت کے تمام طرق ڈھکو سلے اور باطل ہیں)

سو آنکھیں اطاعت کی برکت سے کھلتی ہیں ایسا ہی شخص خدا کو بھی اور خدا والوں کو بھی پہچانتا ہے۔ حکموں کو بھی جانتا ہے اور ان کی حکمتوں کو بھی گو اجمال ہی کے درجہ میں سہی لیکن اس قدر علم ضرور دیدیا جاتا ہے کہ اسکی تسلی ہو جاوے ؎ تسلی داد ہر یک را بہ نگے

(ہر ایک کو اسکی ضرورت کے موافق علم دے کر تسلی عطا کی ہے)

ہمیں ضرورت صرف اتنے ہی علم کی ہے کہ شبہات رفع ہو جاویں۔ البتہ انبیاء کو زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ سو اطاعت کی برکت سے اتنا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ پھر شبہ نہیں ہوتا اھل اللہ کو دیکھا انہیں وساوس کبھی نہیں آتے۔ وساوس کا علاج سوائے اطاعت و فنا کے کچھ نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

روحِ ارواح

اور اس کے متعلق ایک اور ضروری بات سمجھائے دیتا ہوں کہ یہ برکت اطاعت میں جب ہوگی کہ اس کو بقصد اطلاع اسرار نہ اختیار کیا جاوے ورنہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ تو غرض کے واسطے اطاعت ہوئی۔

جیسے کوئی بادشاہ کے یہاں صبح و شام ہر روز دو بار حاضری دے آیا کرتا ہے اور لوگوں کے پوچھنے پر کہہ دیتا ہے کہ میں اس خیال سے جایا کرتا ہوں کہ ہمیں خزانہ شاہی کا حال معلوم کرنا ہے۔ شاید مہربان ہو جاوے اور خزانہ میں آنے جانے کی ممانعت مجھ سے اٹھا دی جاوے خفیہ پولیس نے خبر لگا کر بادشاہ کو اس کے مقصود سے مطلع کیا۔ کہ حضور یہ آپکا طالب نہیں ہے آپ کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہے اس کو بھید لینا ہے آپ کے خزانوں کا غیب نہیں بادشاہ اسکی اس حرکت پر اسی دن حکم دے دے کہ دربار کی حاضری بند ایسے شخص کو ہرگز نہ آنے دیا جاوے مگر بادشاہ کو تو اس کی نیت کی اطلاع خفیہ پولیس کے ذریعے سے ہوئی

اور اللہ تعالیٰ کو تو بلا واسطہ اطلاع ہے۔ اگر اس غرض سے اطاعت کسی نے شروع کی کہ اس کو اسرار کی اطلاع ہو جائے تو یہ غرض کی اطلاع ہوئی پھر نہیں ہوگی اطلاع۔

اطاعت اطاعت کی غرض سے کرنا چاہیئے۔ اسرار کا قصد ہی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ بقدر آپکی تسلی کے اسرار کی بھی اطلاع کر دیں گے۔ بس طریق یہ ہے جس کو اہل اللہ نے تجویز کیا ہے۔ اس لئے وہ اسرار قصداً نہیں بیان کرتے سب جوابوں کا جواب یہی دیتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے یا ہم نہیں بتلاتے بجز اس کے کہ مالک اور محبوب کا حکم ہے کرنا چاہیئے اور یہی وہ مبنی ہے جو اعمال کے سب ارواح کی روح ہے۔ اور جو منشا ہے اس وعظ کے روح الارواح کے ساتھ مسمیٰ ہونے کا۔ پس اصل جواب مشترک تو اس سوال کا جو کہ شروع وعظ میں مذکور ہے کہ احکام میں کیا مصلحتیں ہیں۔ یہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر عمل اور حکم میں جُدا جُدا اسرار اور مصالح بھی ہیں جو محققین کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ سو اس پر تو سب کا اتفاق ہوا کہ احکام میں مصالح ہیں۔

غیر محققین کی غلطی

لیکن ان مصالح کے متعلق دو جماعتوں میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں ایک ان میں جو محض اہلِ ظاہر ہیں ایک ان میں جو محض اہلِ باطن ہیں۔ ان ہی دو جماعتوں کو میں نے شروع وعظ میں بلفظ بعض علماء تعبیر کیا ہے اور ان کے مقابل ایک تیسری جماعت جو محققین ہیں وہ ان سے محفوظ ہیں اور ان کا مسلک وہی فیصلہ ہے ان اہلِ اختلاف کی اغلاط کا سو وقت ان ہی دونوں غلطیوں کی اصلاح مقصود ہے اور وہ ایک معرکہ[لے] کی بات ہے۔

اور اس وقت اسی غرض سے اس آیت کی تلاوت کی گئی ہے۔

بیان اس کا یہ ہے کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ شرائع میں حکمتیں ہیں جن کے دوسرے نام روح اور مغز اور جوہر اور حقیقت اور اسرار ہیں۔ مگر باوجود اس اتفاق کے ان کے ساتھ معاملہ غیر محققین کا مختلف ہوا البتہ محققین جو کہ جامع ہوتے ہیں ظاہر و باطن اور

لے اور اتفاق سے اسی میں جواب شافی بھی ہے۔ اس سوال کا جواب رسالہ انکاشف الاسرار میں دیا گیا ہے جس سے غلطیوں کا زیادہ اندیشہ ہے۔

صورت وحقیقت کے وہ حکمت باطنی اور صورت ظاہری دونوں پر عمل کرتے ہیں مثلاً صورت بھی بناتے ہیں نماز کی اور اسکی حکمت کہ توجہ الی اللہ ہے جو اس کا مغز ہے اس کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ پس وہ دونوں کو جمع کرتے ہیں۔

باقی غیر محققین میں سے جو محض اہل قال ہیں وہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ عمر بھر صورت ہی پر اکتفا کرتے ہیں روح یعنی توجہ الی اللہ کی طرف التفات نہیں کرتے۔ نہایت نادان ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں۔ سب کچھ ہے سمت قبلہ بھی وضو بھی رکوع بھی سجدہ بھی مگر مقصود اعظم کی فکر نہیں نہ توجہ اور نہ اسکی تحصیل کی کوشش، بس ہم سوالوں کی نماز یہ ہے پھر سمجھتے ہیں کہ کامل نماز ہے۔ مگر یہ غلطی محض عملی ہے اور اس کے ساتھ ہی باطن کے وہ منکر نہیں۔

اب رہ گئے وہ غیر محققین جو محض اہل باطن سمجھے جاتے ہیں وہ صوفیہ منکرین ہیں ظاہر شریعت کے ان کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے صرف باطن کو دیکھا۔ انہوں نے سمجھا کہ مقصود اصلی ہے۔ انہوں نے صورت کو بالکل ہی اڑا دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ نماز رکوع سجدہ پوست ہے مغز نہیں مقصود محض مغز ہوتا ہے۔ پوست حذف کر دیا جاوے انہوں نے توجہ کو کافی سمجھا لہذا صورت ارکان کو انہوں نے بے وقعت قرار دیا حتی کہ بعضوں نے صاف کہہ دیا کہ نماز بہیئت کذائیہ فرض نہیں۔

اسی طرح ستر عورت کی روح لباس تقویٰ عن الحرام (حرام سے پرہیز کرنا) قرار دے کر اور اس کو اپنے نزدیک حاصل کر کے سمجھے کہ ظاہر بدن کا ڈھکنا فرض نہیں برہنہ رہنا جائز ہے۔ روزہ کی حقیقت قوت بہیمیہ کا توڑنا سمجھے اس کو اپنے زعم میں توڑ ڈالا اب ضرورت روزہ کی نہیں۔ حج کی روح معیت مع اللہ اور کیفیت محبت وعشق کی نکالی اور بزعم خود کیفیت عشق ومحبت کی حاصل کر کے اپنے زعم میں جو حج کا مقصود تھا وہ حاصل کر لیا اور اپنے مشرب کے لئے بزرگوں کے کلام زود جود سے استدلال کیا اور اپنے مذاق پر ڈھال کر تمام احکام پر ایسا ہی تصرف کیا اور شریعت ظاہرہ کو اڑا دیا۔

اور اہل ظاہر پر طعن کیا کہ زکوٰۃ پر خوش ہیں حالانکہ جب تک حب مال نہ زائل کریں تو سب بیکار ہے۔ غرض اہل صلوٰۃ اہل زکوٰۃ پر طعن کئے اور ان پر ہنسے۔ جس کا انجام ان

کے لئے کفر اور دوسروں کے لئے مطلق العنانی ہوا۔ پھر انہوں نے تو ریاضت مجاہدہ کے بعد یہ کیا۔ دوسروں نے بلا ریاضت نماز روزہ چھوڑ کر فسق وفجور اختیار کیا طوائفوں میں ڈیرے منہ کالا کیا۔ اور کسی نے اعتراض کیا تو کہہ دیا کہ میاں ہمہ اوست کون کرتا ہے کون کراتا ہے۔ ایسے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش کو مٹانا چاہا لیکن اسلام کے حافظ حضرت حق ہیں۔ ان کا وار چلا نہیں۔ انہوں نے کوتاہی نہیں کی شریعت بزبان حال ان سے خطاب کر رہی ہے

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود ❊ ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود

تم نے تو کسر نہ چھوڑی میرا مٹنا مقدر نہ تھا نہ مٹا سکے خدا کا ہاتھ میرے سر پر تھا خدائی چراغ کو کوئی نہیں بجھا سکتا۔ پس ایک جماعت نے روح کی طرف التفات نہیں کیا۔ اور ایک نے صورت کی طرف۔

درجات روح اعمال

لیکن پھر بھی ان دونوں میں تفاوت عظیم ہے۔ جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا، انہوں نے روح کا انکار نہیں کیا۔ اور جنہوں نے صرف روح کو لیا انہوں نے صورت کا انکار کیا نیز جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا وہ روح کو بالکل چھوڑے ہوئے نہیں ہیں یہ ایک باریک بات سمجھنے کے قابل ہے۔ یعنی روح کے درجات متفاوت ہیں صوفیہ نے روح کے بعض درجات کو ذکر کیا ہے۔ رمضان کے وعظوں میں میں نے انہیں ارواح کو بیان کیا ہے۔ لیکن ارواح میں ان کے علاوہ اور مراتب بھی ہیں گو ان سے ضعیف ہوں جیسے انسان زندہ ہوتا ہے روح حیوانی سے اور اس کے مراتب مختلف ہیں۔ ایک پہلوان قوی الجثہ کے اندر روح ہے۔ اس کی روح ایسی قوی ہے کہ چلتا پھرتا ہے شہ زوروں کو اٹھا کر پٹک دیتا ہے۔ سیر سیر بھر کھا جاتا ہے پسیوں کو تول دیتا ہے۔ ایک ایسے بیمار کی روح ہے جو چار برس سے مدقوق ہے اور اس کی دق درجۂ ثالث کو پہنچ گئی ہے۔ کھانا بھی نہیں جاتا۔ آنکھ کھولنے میں بھی تکلیف۔ اس کی روح بہت ضعیف ہے لیکن ایسی باقدر ہے کہ اس کی خاص طور سے حفاظت کی جاتی ہے۔ اس کو صدمات سے بچایا جاتا ہے۔ اس کی ایسی قدر ہے کہ وہ خود ہی چار دن بعد مرنے

والا ہو۔ لیکن اگر کوئی اس کو مار ڈالے تو پھانسی ہوگی۔ قوی الجثہ پہلوان اور مریض مدقوق دونوں کے مار ڈالنے میں ویسے ہی پھانسی ہوگی۔ بلکہ جو ایسے مریض کو مار ڈالے تو اس کو علاوہ پھانسی کے یہ بھی ملامت کی جاوے گی کہ شرم نہیں آئی مرتے کو مارا قانون کے مرتبے میں پھانسی اور رنج کے طور پر ملامت۔ پس ایسا مریض گو کمزور ہے لیکن روح سے خالی نہیں گو روح ضعیف بھی۔

اسی طرح اعمال کی روح کو سمجھو۔ پس منکرین ظاہر کہتے ہیں کہ صورت کو لے کر بیٹھے ہیں یہ معترض نادان یہ نہیں جانتا کہ یہ صورت محضہ نہیں ہے۔ اس میں بھی روح ہے گو ادنیٰ درجہ کی سہی۔ پس جس وقت نیت نماز کی باندھی وہی نیت روح ہے نماز کی چنانچہ اگر نیت نہ ہو روزہ صحیح نہ ہو خواہ دن بھر کچھ نہ کھائے نہ پیئے روزہ کی شرط نیت ہے اور نیت فعل القلب ہے۔ جب نیت کی بس روح متحقق ہو گئی۔ جنیدؒ و شبلیؒ کے اعمال میں بڑی بڑی قوی روح ہے کہ نیت بھی زیادہ خالص اور توجہ الی اللہ بھی مستمر ہمارے اعمال میں ضعیف ہے لیکن ہے ضرور مگر اس ضعیف روح کا بھی جو شخص حق ضائع کرے گا وہ بھی سرکاری مجرم ہوگا۔

چنانچہ ان مدعیان تصوف نے اس روح کا حق ضائع کیا۔ اور عجب نہیں جنیدؒ کی نماز سے زیادہ سرکار عالی میں ہماری نماز کی حفاظت کی جاوے کیونکہ اس میں بہت ہی ضعیف روح ہے کہیں نکل نہ جاوے۔ خیر یہ تو لطیفہ ہے ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہماری نماز زکوٰۃ بے روح نہیں۔ اس مدعی نے ہماری زکوٰۃ پر اعتراض کیا کہ زکوٰۃ دینے سے کیا ہوا جبکہ صفت بخل زائل نہ ہوئی لیکن اس نے یہ نہ دیکھا کہ اتنی تو بخل کی صفت ہو گئی کہ پچاس روپے دے دیئے۔ غرض ہماری زکوٰۃ بالکل بے جان تو نہیں معترض نے ہماری زکوٰۃ کو پوست بے مغز سے تشبیہ دی لیکن وہ تشبیہ غلط ہے البتہ اس کی تشبیہ ہے پوست بامغز کم روغن کیسا ہی مغز ہے۔ لیکن کم روغن ہے سوکھا روکھا مگر ہے ضرور ایسا ہے کہ جتنا روغن اچھے مغز سے ایک سیر میں نکلتا یہاں چار میں سے نکلے گا حضرت جنیدؒ کی دو رکعتیں ہماری ہنٹل رکعتوں کے برابر ہوں گی جمع ہو کر انشاء اللہ تعالیٰ بامغز کے برابر ہو رہے گا۔ الحمد للہ یہ علم عظیم آج ہی عطا ہوا ہے۔ گو یہ مضمون ذہن میں مدت سے تھا لیکن مبہم تھا۔ اس کی تفسیر کبھی بیان نہیں کر سکا۔ میں سوچتا تھا کہ کیا چیز اٹکی ہوئی ہے جو زبان پر نہیں آتی سو آج وہ مضمون

زبان پر بھی آگیا۔ الحمد للہ غرض نیت بھی روح ہے گو ادنیٰ درجہ کی روح ہے۔ تو ہماری نماز بے روح نہیں۔ پس ان کے یہاں روح بلا صورت ہے اور ہمارے یہاں صورت مع الروح الضعیف (یعنی کمزور روح کے ساتھ)

مدعیان باطن کی محرومی

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن کو دعویٰ نری روح کا ہے ان کے یہاں روح بھی نہیں اگر میں اول سے یہ دعویٰ کرتا تو تسلیم بھی نہ کیا جاتا اس لئے اول روح بلا صورت کا دعویٰ کیا۔ اب انشاء اللہ اس کو بھی ثابت کئے دیتا ہوں کہ روح بھی نہیں اور اس میں جواب ہو جاوے گا بعض ایسی کتابوں کا بھی جن کی نسبت میرا خیال تھا کہ ان کا جواب ہونا چاہئے سو بحمد للہ بالقصد اس کا جواب ہوگیا۔ گو مختصر ہے لیکن الحمد للہ پورا جواب ہے۔ رنجک (وہ بارود جو بندوق کی پیالی میں رکھی جاتی ہے جس سے پہاڑ اُڑائے جاتے ہیں) تھوڑی سی ہوتی ہے لیکن پہاڑ اڑانے کے واسطے کافی ہے۔ پس میں کہتا ہوں کہ جس کو وہ لوگ بلا نماز کے روح نماز کی سمجھتے ہیں وہ روح نماز ہی نہیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔

تحقیق اسکی یہ ہے کہ بعض ارواح کے تحقق کے لئے بعض شرائط ہوتے ہیں۔ قاعدہ عقلیہ ہے کہ بلا شرط کے مشروط نہیں پایا جاتا۔ پس نماز کی جو روح ہے یعنی توجہ الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا) نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ بدون نماز کی صورت کے نماز کی اس روح کا تحقق ہی نہیں ہوتا یعنی جب نماز مع توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ) فرض کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ مطلق توجہ الی اللہ نماز کی روح نہیں ہے بلکہ خاص وہی توجہ الی اللہ جو نماز کے ضمن میں پائی جاوے اور ظاہر ہے کہ بدون نماز کے نہ پائی جاوے گی۔ پس ان کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم نے نماز کی روح بدون نماز کے حاصل کر لی ہے مثلاً روح انسانی کے فیضان کے لئے بدن انسانی کا شرط ہونا معلوم ہے تو اگر گائے سامنے آوے اور یہ کہا جاوے کہ اس کے اندر روح انسانی ہے تو اسکی کبھی کوئی تصدیق نہ کرے گا کیونکہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ روح انسانی کا جب تحقق ہوگا اسی قالب انسانی میں ہوگا۔ پس کہیں گے کہ گائے کے اندر روح حیوانی ہے، روح انسانی

نہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ کے نقل سے یہ بات معلوم ہوئی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے قول سے کہ اَرْكَعُوْا اُسْجُدُوْا (رکوع اور سجدہ کرو) سے مع وعید ترک نماز یہ معلوم ہوا کہ نماز کی روح نماز سے مجرد ہو کر کبھی پائی نہیں جا سکتی جب قالب نہیں ہے تو روح جس کا دعویٰ ہے وہ نماز کی روح ہی نہیں کسی اور چیز کی روح ہوگی چاہے روح نماز کی ہو۔

روح بلا تشخص

اب ایک اور ترقی کرتا ہوں کہ جس طرح وہ نماز کی روح نہیں اسی طرح کسی دوسری چیز کی بھی روح نہیں۔

پس کسی قسم کی بھی روح نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ نماز کی روح اللہ کی یاد ذکر اللہ یا خلوص یا مثلاً عبادت کی روح محبت وعشق یہ سب جب پایا جاوے گا کسی نہ کسی تشخص کے ساتھ پایا جاوے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق اس اعتبار سے کہ وہ مطلق ہے نہیں پایا جا سکتا جب پایا جاوے گا کسی تشخص کے ساتھ ہوگا۔ کلی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی جس طرح کہ انسان جب کبھی پایا جاوے گا کسی نہ کسی تشخص کے ضمن میں پایا جاوے گا یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ زید بھی نہ ہو بکر بھی نہ ہو اللہ بخش بھی نہ ہو کوئی نہ ہو اور انسان ہو۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ روح یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس تشخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عمل ظاہری کے ہو کیونکہ ان میں کوئی مشقت وکلفت و مجاہدہ ہی نہیں بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عمل ظاہری کے ہوں پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ تشخص نہیں اور کلی من حیث ہو کلی کا وجود ہوتا نہیں پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کوئی روح ہی نہ پائی گئی نہ نماز کی نہ غیر نماز کی اور اگر کوئی عمل غیر نماز کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوتی تو لے مدعی پھر وہی صورت کیوں نہیں قبول کرتا جو محبوب نے تجویز کی۔ ہم تو تیری نفی صورت کو جب جانتے جب نری روح کو لا کھڑا کر دیتے۔ جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزہ محبوب سے کون سی اچھی صورت ہوگی۔

ایک سیاح نے ایک جوگی کو دیکھا جو قشقہ لگائے ہوئے مندر میں بیٹھا تھا مگر اس کے چہرہ سے نور ایمان نمایاں تھا۔ کیونکہ ایمان کا نور چھپا نہیں رہ سکتا چاہے لاکھ پردوں

ہیں ہو، اس سیاح نے اس جوگی سے خلوت میں پوچھا تو اس نے اقرار کیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں وجہ اس ظاہری وضع کی دریافت کی تو کہا اسلام میں قیود بہت ہیں میں آزاد ہوں۔ قیود سے وحشت ہوتی تھی سیاح نے کہا کہ شرم نہیں آتی اطلاق کا دعوٰی ہے تو یہاں بھی قید کفر کی ہے وہاں قید اسلام کی تھی۔ وہاں زمزم کی قید تھی تو یہاں گنگا کی قید ہے۔ وہاں میمانہ پے سجدہ تھا تو یہاں قشقہ ہے۔ وہاں قمیص و قبا تھا تو یہاں زنار و لنگوٹ ہے غرض اطلاق کا محض دعوٰی ہی ہے آزادی یہاں بھی نہیں۔

ہاں البتہ اتنا فرق ہے کہ ایک قید محبوب کو پسند ہے اور ایک ناپسند بس تنبہ ہوا، جوگی کا فوراً توبہ کر کے مسلمان ہوا اور بزبان حال پڑھا ے

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ؛ مرا با جان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالٰی تجھے اچھا بدلہ دیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق کر دیا)

ایسی غلطیاں بڑوں بڑوں کو ہو جاتی ہیں یعنی عوام کے نزدیک جو بڑے ہیں جن کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالٰی کی ان پر رحمۃ نازل ہو) لگا ہوا ہے ورنہ دراصل تو بڑا وہ ہے جو متبع شریعت ہو۔ کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا جتنا کوئی نبی کے مشابہ ہوگا اتنا ہی وہ بڑا ہوگا، حاصل یہ ہے کہ ان کی جو روح ہے وہ روح بھی نہیں ہے موٹی بات ہے کہ گنے کا رس گنے سے حاصل ہو کر پایا جا سکتا ہے۔ انگور سے نہیں جو رس انگور سے حاصل ہوگا وہ انگور کا شیرہ ہوگا گنے کا رس نہ ہوگا۔ گو مشابہ گنے کے رس کے ہو، اس راہ میں بہت دھوکے ہو جاتے ہیں۔

وسوسۂ راہ عشق بعضے بڑوں کو بھی دھوکے ہوئے ہیں۔ اور وہ چونکہ مر گئے ہیں اس لئے ہم ان کی شان میں گستاخی کرنے سے زبان کو بچاتے ہیں کہ اللہ کا نام لینے والے تھے۔ یہ اللہ کے نام کا ادب ہے۔ لیکن ان کے مقالات سے ہم قرآن و حدیث کو نہیں چھوڑ سکتے، ان کے حق میں یوں تاویل کرلیں گے کہ ان سے غلطی ہوئی حال کا غلبہ ہو گیا۔ غرض جو تاویل ہو سکے گی کریں گے۔

چاہے وہ واقعی ہو یا غیر واقعی جب کوئی نہ ملے گا تو ہم صاف طور سے کہیں گے کہ ہم ابھی نہیں مانتے وہ کوئی نبی نہیں تھے فرشتے نہیں تھے جن کا ماننا فرض ہو، یہ طریق ہے بڑا نازک اہل باطن سے جو غلطی ہوتی ہے وہ کفر تک پہنچ جاتی ہے اور اہل ظاہر کی غلطی محض معصیت تک رہتی ہے۔

اسی واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

نَحْنُ نَخَافُ الْکُفْرَ وَاَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعْصِیَۃَ

(تم تو غلطی سے گناہ ہی کا خوف کرتے ہو ہم کو تو کفر کا اندیشہ ہے)

فرماتے ہیں ؎

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسی است ٭ ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

(طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں اور ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)

ہزاروں وسوسے ہزاروں خطرے یہاں تک حالت ہے کہ بعض کے سامنے شیطان ایک آسمان پیش کر دیتا ہے جس میں اشکال مثل فرشتوں کے نظر آتے ہیں جو گفتگو کرتے ہیں، پھر وہ لوگ کسی مولوی کی نہیں سنتے۔

ایک بزرگ کو روح کا نور منکشف ہوا، بوجہ غایت لطافت کے اس کو وہ نورِ حق سمجھے اور تیس برس تک اس غلطی میں مبتلا رہے تیس برس کے بعد سمجھے کہ یہ تو روح کا نور تھا سخت حیران ہوا کہ میں اتنے عرصہ تک شرک میں مبتلا رہا۔ اسی واسطے بہت بڑے شیخ کامل محقق جامع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کا جامع) کی ضرورت ہے جس کی یہ شان ہو ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق ٭ ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

(ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو دوسرے ہاتھ میں سندان عشق، یعنی شریعت اور حقیقت دونوں میں ماہر ہو شریعت، اور حقیقت طریقت دونوں میں پورے طور سے واقف ہونا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

یہ نرے صاحب ظاہر کا کام ہے کہ صاحب ظاہر اہل باطن کی غلطیاں نہیں نکال سکتا۔ نہ نرے صاحب باطن کا کام ہے کہ اسکی بھی نظر ناتمام ہے اس وجہ سے بہت بڑے جامع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کے جامع و ماہر) کی ضرورت ہے (الحمد للہ کہ ایسا جامع شخص اس زمانہ میں حق تعالیٰ نے پیدا فرما کر دکھلا بھی دیا۔ اس شخص کا نام ہے امداد اللہ)

حضرت حاجی صاحب کی شانِ تحقیق

(ان الفاظ کو نہایت جوش و خروش سے فرمایا اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے جس کا اثر سامعین پر بے حد پڑا اور بہت سے لوگوں پر جن میں بعضے انگریزی خواں بھی تھے بے اختیار گریہ طاری ہو گیا۔ بعد کے بھی کلمات اسی جوش و خروش سے بمشکل گریہ کو ضبط فرما کر متغیر لہجہ میں فرماتے رہے جامع) وہ شخص فن تصوف کا مجتہد تھا امام تھا مجدد تھا۔ اس نے کفر و ایمان کو بالکل الگ الگ کر دیا۔ حق و باطل کو جدا کر دیا۔ فن کو ایسا صاف کیا ہے کہ کہیں گنجلک نہیں رہی ظاہری حالت بالکل معمولی تھی نہ جبہ تھا نہ عبا تھا نہ قبا۔ تھانہ کے ایک شیخزادے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن سبحان اللہ حق تعالیٰ نے اس شخص میں کیا کمال رکھا تھا جب ہی تو بڑے بڑے علماء نے اُدھر رجوع کیا۔ مگر حق یہ ہے کہ اس شخص کو سب علماء نے بھی نہ پہچانا، انہوں نے یہ مذکورہ غلطیاں رفع کی ہیں (گریہ و جوش و خروش جاری ہے) ہم پر دو زمانے گزرے ہیں ایک وہ کہ صوفیہ میں جو ذرا ظاہر کے خلاف نظر آیا اسے گمراہ سمجھے اور ایک وہ زمانہ گزر رہا ہے کہ کوئی صوفی چاہے جتنا گمراہ ہو اسے بھی کامل سمجھے اس شخص کی بدولت معلوم ہوا کہ دونوں راہ غلط تھے۔ الحمد للہ اب غلطی ایسی نظر آتی ہے کہ غلطی کرنے والا بھی سمجھ لیتا ہے کہ دُکھتی ہوئی رگ پکڑی ہے، اگر صاحب تلبیس (فریبی و مکار) بھی سنتا ہے اس کا دل بھی مان لیتا ہے محض یہ کہنا کافر اس سے غلطی نہیں نکلتی اس غلطی کے متعلق جو اعمال کے ظاہر و باطن کے باب میں مذکور ہوئی ہے۔

ازالۂ غلطی ایک درویش صاحب سے بھی سوال کیا گیا ہے۔ انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں شریعت و طریقت کو ظاہر اور حقیقت و معرفت کو باطن قرار

دے کر متبعین نبی کے دو فرقے ٹھہرا دیئے ہیں وہ بھی جو باطن اصلاحی کو لئے ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی جو ظاہر کے بالکل تارک ہیں اور دونوں کو متبعین نبی بتلایا ہے بلکہ ان دونوں میں طرف اہلِ باطن کو ترجیح دی ہے۔ اور اہلِ ظاہر پر طعن کیا ہے۔ اس میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ان الفاظ کو عمل کے چار درجوں کا نام سمجھے ہیں جن میں اصطلاحی معنی بھی متروک ہو گئے۔

الفاظ شریعت طریقت حقیقت کیونکہ شریعت کہتے ہیں مجموعہ احکام الٰہیہ کو جن میں احکام ظاہر و باطن سب داخل ہیں۔ احکام ظاہری و احکام باطنی میں تضاد نہیں بلکہ احکام ظاہری کے معنی یہ ہیں کہ احکام متعلق بالظاہر مثلاً حکم ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز پڑھو اور ادائے حقوق کے ساتھ پڑھو۔ اس میں وہ احکام ہیں ظاہر و باطن ظاہر ادائے ارکان باعتدال اور باطن اخلاص و خشوع جو حقوق صلوٰۃ میں داخل ہیں متاخرین کے اصطلاح میں احکام باطن کی تحصیل کے طریق کو طریقت کہتے ہیں اور شریعت اس سب مجموعہ کا نام ہے۔ طریقت اسی کا ایک جزو ہے۔ جیسے شریعت کا ایک جزو کتاب الصلوٰۃ ہے ایک کتاب الحج کو یا ہو ویسے ہی اس کا ایک جزو کتاب الشکر ایک جزو کتاب الصبر ایک جزو کتاب الاخلاص ایک جزو کتاب المحبۃ بھی ہے، غرض طریقت شریعت ہی کا ایک جزو ہے اس کے مقابل کوئی چیز نہیں ہے۔ اور شریعت مجموعہ ہے ان سب کا، پھر جب آدمی شریعت پر پورا پورا عمل کرتا ہے تو اس سے حسب استعداد بعض وجوہ تکوینیہ تعلق بین الحق والخلق (خالق اور مخلوق کے درمیان) کے منکشف ہوتے ہیں مثلاً مسئلہ تقدیر کی تحقیق تجدد امثال کی کیفیت روح کی حقیقت جن کا عدم انکشاف بھی مضر نہ تھا اور بعض وجود تشریعیہ تعلق مذکور کے منکشف ہوتے ہیں جس کو علم معاملہ کہتے ہیں۔ اور جس کا انکشاف حسب استعداد لازم ہے ان وجوہ کو حقیقت کہتے ہیں۔ ان انکشافات سے خدا تعالیٰ کی شناخت بڑھتی ہے اس کو معرفت کہتے ہیں۔ یہ تحقیق ہے ان الفاظ کی نہ یہ کہ چاروں متقابل و متغائر ہیں۔ جیسے حیدر آباد میں چار منارے ہیں۔

بحمد اللہ اس تقریر سے سب غلطیاں لفظی و معنوی سب رفع ہو گئیں اور ثابت ہو گیا کہ نرے باطن پر اکتفا کیا تو محض باطل ہے اور جس کو ظاہر پر اکتفا کرنا سمجھا جاتا ہے وہ محض

عاطل (بیکار) نہیں۔

پس نرا ظاہر والا نرے باطن والے سے اچھا ہے کیونکہ وہاں ظاہر تو خود ان کے اقرار سے ہے ہی نہیں اور باطن بھی دلیل سے ثابت ہو چکا کہ نہیں اور یہاں ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہے گو کم ہی سہی پس نرا باطن والا از یں سو راندہ از اں سو ماندہ (نہ اِدھر ہی کا نہ اُدھر کا) کا مصداق ہے مسئلہ تو بفضلہ تعالیٰ ثابت ہو چکا۔

اولیائے مستہلکین اب اگر مسلم حضرات میں سے کسی نے اس کے خلاف کہا ہے یا کیا ہے تو ہم یہ تاویل کریں گے اور اگر تاویل نہ ہو سکے کہہ دیں گے کہ غلطی۔ ایسے لوگ اولیاء مستہلکین (ہلاک ہونے والے) کہلاتے ہیں۔

باقی یہ کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا ہوگا۔ یقینی تو یہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے باقی ظن یہ ہے کہ چونکہ نیت بُری نہیں تھی۔ ممکن ہے معاف کر دیئے جاویں دیکھئے اجلاس احکام میں بڑے بڑے خونِ ناحق نیت بُری نہ ہونے سے معاف ہو جاتے ہیں۔ رہا یہ کہ بعض اقوال و افعال منقولہ تو قاعدہ سے کفر معلوم ہوتے ہیں۔ سو کفر کس طرح معاف ہو سکتا ہے لیکن یہ ایک دقیق بات ہے جس سے وہ کفر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی میں ہی کہہ رہا ہوں اور کسی مولوی سے تو کہلوا لو۔ اور یہ سب حضرت کا طفیل ہے۔ حضرت کی جوتی سیدھی نہ کی ہوتی تو ہم کو بھی فتویٰ کفر میں باک نہ ہوتا۔ مگر ہم نے وہاں ادب ہی ادب دیکھا۔ حضرت بہت سے کفر کے فتوے کے موارد کو بھی یہی فرماتے تھے کہ نہیں صاحب باطن تھے غلطی میں پڑ گئے۔ جب سے وہاں یہ حال دیکھا ہم بھی ایسے فتوے سے بچنے لگے ہیں۔

ایک بار مولوی محمد احسن صاحب ایک تارکِ ظاہر کا کفر ثابت کر رہے تھے اور حضرت ان کی تقریر کا رد فرما رہے تھے۔ اللہ اکبر اس قدر حلم و کرم اور دقتِ نظر و باریکی تھی کہ کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے اب میں وہ دقیق بات (مانع عن التکفیر) سے مالغ (مطلع) بتلاتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ تین شخص مرفوع القلم ہیں اس میں یہ بھی ہے۔ عن المجنون حتی یعقل (مجنوں کے جب تک ہوش درست نہ ہو مرفوع القلم ہے) اور ایک روایت میں ہے عن المعتوہ حتی یبرأ

یعنی مختل الحواس رجب تک صحت یاب نہ ہو ابھی مرفوع القلم ہے اور ایک روایت میں ہے عن الخرف (یعنی جس کی عقل میں بڑھاپے کی وجہ سے فتور آگیا ہو وہ بھی مرفوع القلم ہے) رواہ کلھا ابوداؤد (ان سب کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے) اور عتہ (مختل حواس ہونا) جس طرح مرض سے ہوتا ہے اسی طرح دوسرے اسباب باطنہ سے بھی ہو سکتا ہے گو ان اسباب کا ادراک عوام کو نہ ہو بلکہ اخیر کی روایت سے تو زوال عقل کا جنون و عتہ میں عدم انحصار زیادہ صریح ہے بس آپ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہوتی ہے بظاہر ہوش و حواس رہتے ہیں، فرزند اور بیوی سب کا ہوش رہتا ہے لیکن ان کی ایک ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے اقوال و افعال غیر منتظم ہو جاتے ہیں ایسی ہی حالت کو خسرو حیرت سے تعبیر کر کے کہتے ہیں ؎

حیران شدہ ام در آرزویت ✿ اے چشم جہانیان بسویت

(تیری آرزو میں حیران ہوں اے محبوب جہاں والوں کی آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی ہیں)

مائیم و تحیر و خموشی ✿ آفاق ہمہ بگفتگویت

(ہم ہیں اور تحیر اور خموشی ہے تمام دنیا تمہاری گفتگو میں لگی ہوئی ہے)

خسرو بکمند تو اسیر ست ✿ بیچارہ کجا رود ز کویت

(خسرو تمہاری کمند کا قیدی ہے تمہارے کوچہ کو چھوڑ کر بیچارہ کہاں جائے)

پس ایسے حواس مختل ہو جاتے ہیں کہ پورے ہوش نہیں رہتے کہ صحیح عقیدے کیا ہیں سمجھ میں ایسا تغیر ہوتا ہے کہ آیتوں کے معنے الٹ پلٹ کر دیتے ہیں لیکن نیت بری نہیں ہوتی خلاف خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قصد نہیں کرتے غلبہ حال میں خیال ہوتا ہے کہ جو میں سمجھتا ہوں وہی ٹھیک ہے باقی سب غلط ہیں سمجھتے ہیں کہ میں ہی ٹھیک سمجھا ہوں اور علامت آمیزش نفس نہ ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ وہ

تمہارے کافر کہنے کا بُرا نہیں مانتا تمہارے کافر کہنے کا تو وہ کیا بُرا مانتا وہ اپنے کو خود فرعون سے بدتر خیال کرتا ہے۔ یہ وجدانی حالت ہے دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ غرض وہ ایک حیرت کی کیفیت ہے۔ وہ پیشوا نہیں، معذور ہے۔ کیا عجب حق تعالیٰ معاف کردے۔ اسے شریعت کا منہدم کرنا مقصود نہیں۔ حیرت سے پریشان ہو کر کبھی ننگا پھرنے لگتا ہے۔ کبھی ڈاڑھی منڈا دیتا ہے، کبھی شوالہ میں گھنٹہ ناقوس جا کر بجانے لگتا ہے۔ اسکی طرف سے میں آپ سے یہ کہوں گا ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل ٭ کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور ہولناک بھنور میں کشتی آگئی ہو تو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں دریا میں قدم نہیں رکھا)

اولیائے کاملین مگر یہ یاد رہے کہ اس ساحل سے مراد ادھر کا ساحل ہے جس کے کھڑے ہونے والے ابھی دریا میں بھی نہیں گھسے۔ کیونکہ ادھر کے ساحل والے جو کہ دریا سے پار ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ حال بھی جانتے ہیں، اور اگر ان کے ہاتھ میں یہ شخص ہاتھ دے دے تو بچا بھی سکتے ہیں۔ البتہ ادھر والے سوائے ہنسنے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ سو کاملین اس ساحل پر ہیں۔

حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر منصور میرے زمانہ میں ہوتا تو میں اس کو بچا لیتا۔ شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سلسلہ کے بزرگ فرماتے ہیں کہ "منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مردانند کہ دریا ہا فرو برند و آروغ نہ زنند" (یعنی منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے جوش و خروش میں آگیا۔ یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے)، حالانکہ شیخ اس قدر مغلوب تھے کہ چالیس برس یا کم و بیش رودولی کی مسجد میں پانچ وقت نماز پڑھی لیکن راستہ نہیں یاد ہوا۔ بختیار خادم آگے آگے حق حق کہتے جاتے تھے اس آواز پر چلتے تھے۔ رستہ کی خبر نہیں مگر باوجود اس کے اتنی قدر سنبھلے ہوئے ہیں کہ فرماتے ہیں کہ منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مردانند

کہ دریا با فرد بر ندوم آرغ نہ زنند دمنصو بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے جوش و خروش میں آ گیا۔ یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے کبھی شریعت کے خلاف نہیں کیا۔

بارہ برس حضرت مخدوم صابر مراقبہ ہو میں مدہوش رہے لیکن ایک وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی جہاں کان میں اذان دی گئی بس آنکھیں کھول دیں۔ پانی تیار رہتا تھا۔ وضو کر کے نماز پڑھ کر پھر بے ہوش، بارہ برس تک یہی حال رہا۔

ان کے پیر یعنی شیخ فرید رحمۃ اللہ علیہ نے ڈوم کو خیریت دریافت کرنے کے لئے بھیجا جس وقت پہنچا افاقہ کا وقت تھا۔ بس اتنا دریافت فرمایا کہ پیر اچھے ہیں، اور پھر چپ آپ کی یہ حالت تھی کہ بارہ برس تک گولر کھائے اس روز فرمایا کہ پیر کا بھیجا ہوا ڈوم ہے آج نمک ڈال دینا پیر کا مہمان ہے۔ یہاں سے وہ ڈوم دہلی پہنچا۔

حضرت سلطان جی بھی حضرت شیخ کے مرید تھے، یہاں شاہی دربار تھا چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ وزیر شاہی حاضر خدمت تھا کھانے کا وقت آگیا۔ وزیر نے خیال کیا کہ مچھلی کے کباب ہوں تو اچھا ہے۔ جب خادموں نے کھانا لانے کے لئے اجازت چاہی تو فرمایا ذرا ٹھہرو جب کچھ دیر ہو گئی تو پھر آ کر عرض کیا کہ حضرت کھانا بے لطف ہو جاتا ہے آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص سر پر خوان رکھے ہوئے آیا اور عرض کیا کہ فلاں صاحب نے مچھلی کے کباب بھیجے ہیں، سلطان جی نے حکم دیا کہ اب کھانا لایا جاوے۔ اب وزیر صاحب چونکے دستر خوان لگایا گیا۔ وزیر کو خیال ہوا کہ مچھلی کے کباب اتفاقاً آگئے ہیں سلطان جی نے خادم سے کہا کہ مچھلی کے کباب آپ کے سامنے زیادہ رکھنا۔ آپ کو زیادہ شوق ہے وزیر کو پھر بھی خیال ہوا کہ اتفاقی بات ہے۔

تب حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ جناب وزیر صاحب فرمائش کا تو مضائقہ نہیں لیکن ذرا وقت گنجائش دیکھ کر ہونا چاہیے۔ عین وقت پر فرمائش کرنا تکلیف دینا ہے ویسے مہمان کو حق ہے فرمائش کرنے کا۔ وزیر اب سمجھے کہ یہ میرے خطرہ کا جواب تھا۔

حضرت سلطان جی کو وزیر کی خواہش کا کشف ہوا آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

بادشاہ یہ لوگ ہیں ۔ اور یہ حضرات اللہ میاں جی ۔ سے کہتے ہیں جب کہتے ہیں ، جیسے کسی رئیس کا بچہ ہو کہ سارا حشم خدم اس کا فرمانبردار ہے لیکن جب اسے کسی چیز کی خواہش ہو گی تو اپنی ماں ہی سے مانگے گا کہ اماں یہ لوں گا ۔ اماں چاہے جس کو حکم دے کر اسے دلوا دے ۔ حضرت سلطان جی نے بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی سے عرض کیا کہ کباب دیجیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ادنیٰ پیادہ کو حکم دیا کہ لیجاؤ ہمارے محبوب کے سامنے ۔

غرض یہاں یہ سامان تھا جب پیر کا ڈوم قریب پہنچا تو حشم وخدم سے اس کا استقبال کرایا اور خوب کھانے کھلائے ۔ چلتے وقت انعام واکرام بھی دیا ۔ ڈوم نے واپس ہو کر حضرت شیخ رحمہ سے سلطان جی کی بڑی تعریف کی اور حضرت مخدوم کے بارہ میں کہا کہ وہ بڑے روکھے ہیں ۔ مجھے تو کیا تمہیں بھی نہیں پوچھا ۔ بس اتنا دریافت کیا کہ پیر اچھے ہیں ، یہ سُن کر حضرت فریدؒ رقص کرنے لگے کہ الحمد للہ میں ابھی تک انہیں یاد ہوں ورنہ مجھے کچھ بھی نسبت نہیں رہی ہے ۔ ان کے مقام سے مگر مجھے اب تک یاد رکھتے ہیں ۔

ہمارے مشائخ ہمارے مشائخ میں بحمد اللہ ایسے ایسے بکثرت گزرے ہیں کہ جن کو ماسوا اللہ کا ہوش نہیں رہا ، مگر ان کو اللہ کا ہوش تھا ، اس لئے ان سے ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں ۔ اور جو مغلوب الحال غلطیاں کرتے ہیں وہ واقع میں خدا سے بھی بے ہوش ہیں کیونکہ اگر بادشاہ پہ پوری نظر ہو تو کوئی بے ادبی اس سے نہیں ہو سکتی ۔

ہمارے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید ہیں خورجہ کے وہ بڑے صاحب حال ہیں ہمیشہ تڑپتے لوٹتے رہتے ہیں ، اپنے سلسلہ کے حضرات کو دیکھ کر بلکہ ان کا نام سُن کر تڑپنے چیخنے لگتے ہیں ، مگر نماز میں انکی کبھی آہ بھی نہ نکلی ۔ یہ اتباع سنت کی برکت ہے ۔

بر کفِ جامِ شریعت بر کفی سندانِ عشق ؎ ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ادھر شریعت کا مقتضیٰ اُدھر عشق کا مقتضیٰ شریعت اور عشق دونوں کے مقتضٰے پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں)

عوام کو ایسے لوگوں پر گمان خالی ہونے کا ہوتا ہے لیکن وہ اس گمان سے خوش ہوتے ہیں۔ کیمیا گر اسی میں خوش رہتا ہے کہ اسے کوئی نہ جانے کیونکہ وہ پولیس کے مواخذہ سے بچا۔ لوگوں کے ہجوم سے بچا۔ جب اسے معلوم ہوا لوگ اب اس کو سمجھنے لگے اور بھیڑ ہوئی پس وہاں سے روپوش ہو جاتا ہے ایسے متبع سنت کاملین پر عام لوگوں کا گمان خالی ہونے کا ہے لیکن وہ پورے بھرے ہوئے مگر پُر ہونے کے ساتھ اُبلتے نہیں۔ تو وجہ یہ ہے کہ ان کو دوسری چیز نے روک رکھا ہے وہ نکلنے نہیں دیتی غیر ضابطہ تو تنگ ہو کر یہ کہہ اٹھا کہ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ؛ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

(یعنی گہرے دریا میں تختہ میں جکڑ کر ڈال دیا ہے۔ پھر کہتے ہو کہ ہوشیار دامن تر نہ ہو) کاملین باوجود اس کے قعر دریا میں غرق ہیں لیکن پھر بھی ان کا دامن تر نہیں ہوتا۔ ہر زمانے میں اللہ کے بندے ایسے پیدا ہوئے اور اب بھی موجود ہیں، عوام الناس ایسوں کو نہیں سمجھتے۔

شیخ کامل سے وابستگی کی ضرورت اور اُنکا اصلی کمال پس اگر ایسی جامعیت وضبط مطلوب ہے تو کسی متبع سنت شیخ کامل کا دامن پکڑنا چاہیے۔ اور بہت ہی سنبھال کر قدم رکھنا چاہیے۔ نیز شیخ کے تجویز کرنے میں بھی عجلت نہیں چاہیے، پہچان میں نہایت جانچ کی ضرورت ہے، پس شیخ بنانے کے قابل وہ شخص ہے جو غلطیوں کا پکڑنے والا ہو یہ نہیں کہ ناتمام سا قال وحال دیکھ لیا اور پھنس گئے ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند ؛ نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرے لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو جیسے جو شخص بھی آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو یعنی جس نے کاملین کی وضع اختیار کی ضرور نہیں کہ کامل بھی ہو۔ خوب کہا ہے ؎

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد ؛ بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ کمر تپلی ہو بلکہ محبوبیت اسکی آن اور ادا میں ہوتی ہے جو محبوب اور دل کش ہوتی ہے۔

نہ مجاہدہ دیکھو نہ ریاضت نہ کشف دیکھو نہ کرامت یہ دیکھو کہ فن کو کتنا سمجھتا ہے صحبت میں کیا برکت ہے۔ حضرات مجتہدین کو ہم سے حدیثیں زیادہ یاد نہیں تھیں لیکن ان میں ایک شان تھی مناسبت فن کی فن کو اتنا جانتے تھے کہ ہم لوگ قیامت تک بھی نہیں جان سکتے۔ بوعلی سینا کو نسخے زیادہ یاد نہیں تھے لیکن فن کو ایسا جانتے تھے کہ بعد کو لوگوں نے بڑی بڑی قرابا دین لکھیں۔ لیکن شیخ سے نہ بڑھ سکے اور اسکی کتاب قانون شاہد ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کے بعد ایسا شخص نہیں ہوا۔

اور یہ بات خدا کی جانب سے ہوتی ہے اور شیخ میں یہ بھی دیکھ لینا کہ عارف کے ساتھ عاشق بھی ہو۔ نرے عارف کا دامن مت پکڑنا کہ کفایت اسکی قلیل ہے حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ میں دونوں شانیں ایسی بڑھی ہوئی تھیں کہ سبحان اللہ میں نے تو دیکھا برتا ہے۔ یہ جی چاہتا تھا کہ ہر بات پر ہر ہر ادا پر جان فدا کر دیں۔ حضرت کے عارف ہونے پر بعضے تذکرے یاد آ گئے۔

حضرت حاجیؒ کی روحانی بصیرت

حضرت جب یہاں وطن میں تھے تو مولانا گنگوہیؒ اور بھی بعض ذاکرین اپنے اپنے حالات حضرت سے بیان کرتے۔ لیکن مولانا محمد قاسم صاحب کچھ بھی نہ بیان فرماتے۔ حضرت نے ایک دن پوچھا کہ آپ کچھ نہیں کہتے۔ مولانا یہ سن کر رونے لگے اور عرض کیا کہ حضرت حالات و ثمرات تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں۔ مجھ سے تو جتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا جہاں تسبیح لے کر بیٹھا بس ایک مصیبت ہوتی ہے۔ اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں زبان قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن۔

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل ۔ کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

(بدقسمت لوگوں کو رہبر کامل سے کیا فائدہ ہو۔ خضر علیہ السلام سا رہبر کامل سکندر کو

آبِ حیات کے چشمہ سے واپس لاتا ہے کیونکہ سکندر قسمت کا تہیدست تھا)
میں ہی بدقسمت ہوں ایسا ہوتا ہے جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو تو یہ حال سن کر بے ساختہ حضرت فرماتے ہیں کہ مبارک ہو یہ نبوت کا آپ کے قلب پہ فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا محض نوآموز طالب علم تھے اسوقت یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اس قدر بڑے عالم ہونیوالے ہیں۔ اب تو اس پیشین گوئی کا انطباق آسان ہے لیکن اسوقت یہ فرما دینا عجیب وغریب بصیرت کا پتہ دیتا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم سے حق تعالٰے کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے۔ جاؤ دین کی خدمت کرو ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔

احمد جام فرماتے ہیں ؂

احمد تو عاشقی بہ مشیخت ترا چہ کار ؛ دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

سبحان اللہ حالت کو کیسا پہچانا بصیرت کیسی زبردست تھی۔ حضرت کی پہچان غضب کی تھی مکہ مکرمہ میں حضرت کے ایک خلیفہ ہیں ولایتی۔ انہوں نے دو رکعت نماز اس اہتمام سے پڑھیں کہ سوائے حق تعالٰی کے خیال کے اور کوئی وسوسہ نہ آوے، وسوسوں کے روکنے کی غرض سے آنکھیں بھی بند کر لیں بعد کو وہ متوجہ ہوئے حقیقت صلوٰۃ کی طرف دیکھیں حق تعالٰی کے یہاں میری اس نماز کی کیا شکل ہوئی چنانچہ ایک نہایت حسین وجمیل عورت کی شکل میں انہیں وہ نماز دکھلائی گئی مگر اندھی۔

حضرت سے عرض کیا کہ میں نے نماز کامل آداب کے ساتھ پڑھی تھی لیکن یہ کیا ہوا کہ اندھی دکھائی گئی۔

فی البدیہہ فرمایا معلوم ہوتا ہے تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی تھی۔

عرض کیا کہ جی ہاں وساوس کے روکنے کے لئے بند کر لی تھیں۔

فرمایا کہ یہی سبب ہے کہ اندھی دکھلائی گئی کیونکہ نماز میں آنکھیں بند رکھنا سنت کے خلاف ہے خلاف سنت نماز پڑھنے کا یہ اثر ہوا سنت کے موافق آنکھیں کھول کر

نماز پڑھتے تو گو ہزاروں وسوسے آتے لیکن وہ نماز اس نماز سے ہزار درجہ افضل ہوتی جو خلاف سنت طریقہ پر آنکھیں بند کر کے ادا کی گئی خواہ اس میں ایک بھی وسوسہ نہ آیا ہو۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے پہچان کا بھی اور اتباع سنت کا بھی۔

اسی وجہ سے مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی جو ایک مشہور نہایت متقی جامع ظاہر و باطن عالم تھے یوں فرمایا کرتے تھے کہ حاجی صاحب اکابر سلف میں سے ہیں گو پیدا اس زمانہ میں ہوئے ہیں لیکن درجہ اُن کا وہ ہے اس طبقہ میں سے ہیں۔ میں نے یہ روایت قاری محمد علی خاں صاحب جلال آبادی سے سُنی انہوں نے مولانا سے سنا۔ واللہ رحمت تھی حق تعالیٰ کی کہ اس زمانے میں ایسے ایسے حضرات پیدا فرمائے۔ حضرت کی صحبت کے وقت سے زیادہ مجھ کو مثنوی شریف کی شرح لکھتے وقت حضرت کے علوم و معارف کی قدر معلوم ہوئی وہاں آنکھیں کھلیں۔ حضرت ہی کے علوم ہی کی بدولت یہ دقیق کتاب سمجھ میں آئی ورنہ ناممکن تھا۔ لکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کوئی ایک ہی دفتر کی شرح لکھ دے کوئی لکھ کر تو دیکھے ؏ ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوئی

(یعنی یہی مثنوی اور یہی لکھنے والے اب بھی موجود ہیں) یہ حضرت ہی کے کلیات کے سہارے ساری شرح لکھی ہے چونکہ وہی کلیات ذہن میں محفوظ تھے کوئی مشکل مقام ایسا نہیں آیا کہ حل نہ ہو گیا ہو۔ کسی جگہ ذہن نہیں اٹکا۔ کوئی میرے دل سے پوچھے کتنے باوقعت وہ کلیات تھے۔ اس کشتی کی قدر وہ جانے جس نے اس سے دریا قطع کیا ہو کہ وہ جب کشتی لے کر چلا کوئی سمندر ایسا نہیں ملا جس نے اسے روکا ہو۔

اسی طرح الحمد للہ کوئی طالب علم ایسا نہیں ہوتا کہ جس کا مرض اور دوا سب اس طرح کی تھوڑی سی حالت دیکھتے ہی سمجھ میں نہ آجاتا ہو۔ یہ سب انہیں کلیات کی بدولت ہے ہم نے بخاری مسلم سب کچھ پڑھا تھا لیکن کچھ نہ سمجھے تھے۔ اگر چند کلمے حضرت سے نہ سنتے تو ساری کتابیں کچھ بھی نہ سمجھی ہوتیں۔

جب ہی تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم علم کی وجہ سے حضرت کے معتقد ہوئے ہیں۔ حضرت کی شان علمی کے متعلق ایک عجیب قصہ

یاد آیا کہ ایک جلسہ میں جبکہ حقائق کا بیان فرما رہے تھے۔ دوران تقریر میں ایسے ایسے الفاظ بشرط شئے بشرط لا شئے لا بشرط شئے استعمال فرمانے لگے ایک معقولی بھی شریک جلسہ تھے ان کے دل میں خیال ہوا کہ درسی علم تو حضرت نے حاصل کیا نہیں، پھر یہ اصطلاحیں کیا جانیں۔ معاً حضرت کو اس خطرہ کا کشف ہوا۔ فرمایا کہ معانی کا القا کبھی بواسطہ الفاظ بھی ہوتا ہے۔ اس وقت ایسی اصطلاحات بول سکتا ہے۔ وہ معقولی صاحب دم بخود رہ گئے۔

غرض ایسے شخص کی بدولت ایسی غلطیاں رفع ہوتی ہیں کہ شریعت میں الحاد بھی نہ ہو اور جنہوں نے ایسی غلطیاں غلبۂ حال میں کی ہیں ان پر فتویٰ کفر و ارتداد بھی نہ ہو۔

تکلیف بقدر عقل

چنانچہ اوپر حدیث سے ایسے لوگوں کا عذر بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ حدیثیں قواعد کلیہ تھیں۔ اب ان کی تائید ایک حدیث جزئی سے عرض کرتا ہوں اور کوئی جامد علی الظاہر (یعنی ظاہر پہ اڑا ہوا یعنی ظاہر پرست) اس کو صوفیہ کی طرف داری نہ سمجھیں میں کسی صوفی کے قول سے استدلال نہیں کرتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کرتا ہوں کہ ایک گنہگار شخص تھا اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ میں مر جاؤں تو میری نعش کو جلا کر خاک کر کے ہوا میں اڑا دینا پھر یا تو بچ جاؤں اور اگر کہیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو پھر وہ ایسی سزا دیں گے کہ کسی کو بھی نہ دی ہوگی۔ اس کے بیٹوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے مرنے کے بعد اس کی نعش کو جلا پھونک آندھی کے دن اڑا دیا کچھ دریا میں کچھ خشکی میں وہ سمجھتا تھا کہ اللہ میاں کہاں جمع کر سکیں گے جیسا کہ اس کا قول لئن قدر اللّٰہ علی (یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قدرت پالے) اس پر دال ہے لیکن وہاں کیا تھا کن فرمایا اور فوراً سب اکٹھا ہو گیا۔

دریافت فرمایا کہ کیوں تم نے ایسا کیا۔

من خشیتک یا اللّٰہ۔ تیرے خوف سے۔

فرمایا جاؤ بخش دیا۔ اس مقام پر علماء کو دقتیں ہوئی ہیں کہ حق تعالیٰ کی قدرت

ہیں اس نے شک کیا لہذا کافر ہوا پھر مغفرت کیسی۔ بات یہ ہے کہ عقل کم تھی خدا کی قدرت کو بڑا تو جانتا تھا لیکن کتنی اس کا اندازہ نہیں کر سکا۔ ہر شخص کا اندازہ اسکی عقل کے موافق ہوتا ہے

پس ایسے شک سے وہ کافر نہیں ہوا۔ اسی کی قرب کا ایک اور قصہ ہے کہ ایک شخص نے وعظ میں سنا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں نہ پاؤں ہیں وہ تھا محض ایک گنوار دیہاتی آدمی اسے نہایت غصہ آیا اور کہا کہ کیا وہ لطیخ شامی ہے۔ اور بولا ہمارے خدا کے ہاتھ بھی ہیں پاؤں بھی ہیں تیرا خدا ہو گا جس کے ہاتھ نہ پاؤں جیسے شام کا خربوزہ۔ اب کیا ایسے شخص کو کافر کہہ سکتے ہیں وہ ہرگز کافر نہ تھا۔ اس میں عقل ہی نہ تھی بلکہ اس سے یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ پیر مت سمجھ اس کو کفر میں ڈالنا تھا۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے آ کر عرض کیا کہ میں نے ایک لونڈی کے تھپڑ مار دیا ہے اس کو ایک کفارہ میں آزاد کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے آزاد کرنے کے لئے ایمان کی شرط ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی کو طلب فرمایا۔ اس سے دریافت فرمایا این اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کہاں ہیں اس نے کہا فی السماء آسمان میں پھر دریافت فرمایا کہ میں کون ہوں عرض کیا انت رسول اللہ آپ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے فرمایا کہ یہ مومن ہے اس کو آزاد کر دو۔ باوجود اس کے کہ وہ لونڈی یہ سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں۔ لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مومن فرمایا۔ حالانکہ بھلا اللہ تعالیٰ آسمان میں کیا سماتا۔ عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ مظروف سے ظرف بڑا ہونا چاہیے سو خدا تعالیٰ کی عظمت کے سامنے عرش تک تو کوئی چیز ہی نہیں تو آسمان تو کیا ہوتا ادھر دلائل قطعیہ قائم ہیں کہ حق تعالیٰ پاک ہیں کسی مکان کے اندر رہنے سے لیکن اس جاریہ (لونڈی) کی عقل اتنی ہی تھی۔

چنانچہ اگر بچوں سے پوچھو کہ خدا کہاں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اوپر ہے حالانکہ حدیث میں ہے:

لو دلیتم الحبل الی الارض السفلی لهبط علی اللہ

یعنی اگر رسی ساتوں زمین پار ہو کر اترے گی وہاں بھی اللہ میاں ہیں وہ نہ زمین کے

ساتھ مقید ہیں نہ آسمان کے ساتھ مگر فطری امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر ہی ہونے کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اسکی ذات عالی ہے۔ عوام کی سلامتی اسی میں ہے کہ اوپر سمجھیں عرش پر سمجھیں یا آسمان پر سمجھیں کچھ حرج نہیں۔ خواص کے لئے ہے اس کو مکان سے پاک سمجھنا۔ چنانچہ میں نے ایک بار یہیں تھانہ بھون میں حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ ایک رفیع الشان مکان کے فوق کی طرف جلوہ فرما ہیں لیکن بلا کسی لون اور رنگ یا مقدار یا کیفیت کے چونکہ میرے اعتقاد میں تنزیہ ہے اور بہت سوں نے جن پر کہ تشبیہ کا مذاق غالب تھا آدمی کی شکل میں دیکھا اور اس فرق کے اور بھی اسباب ہیں۔ سو اسی طرح یقظہ (بیداری) میں جتنی جیسی عقل ہوگی اتنا ہی سمجھے گا۔ چنانچہ وہی شخص حق تعالیٰ کی قدرت کا قائل سب کچھ تھا لیکن کچھ عقل کی کمی کچھ خشیت کا غلبہ اس نے اس کو بدحواس کر دیا۔ اسی طرح مغلوب الحال کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ غلبۂ حال سے کم ہو جاتی ہے ایسے لوگ معذور ہیں۔

معاملۂ معذور

ایسے لوگوں کے ساتھ نہ گستاخی چاہیے۔ نہ ان کا اتباع چاہیے۔ معذور سمجھ کر معافی کی امید رکھنا چاہیے۔ اور اگر ان حضرات کی طرف ان اقوال و افعال کی نسبت ہی ثابت نہ ہو تو ایک جواب سب سے سہل یہ ہے کہ یہ ثابت ہی نہیں۔ الحمدللہ ان معذورین کے ساتھ جو معاملہ رکھنا چاہیے اسوقت سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ یہ تو اول بھی سے معذورین سے اہل اغلاط کی باقی جو شرعاً معذور نہیں اور وہ محض نقل اور تقلید سے ایسے اغلاط کو اختیار کرتے ہیں۔ وہ یقیناً دائرہ ایمان سے خارج ہیں۔ بہر حال یہ تھا بیان ان اغلاط اہل ظاہر و اہل باطن کا جو آیتیں میں نے پڑھی ہیں۔ ان میں ان اغلاط و اختلافات کا فیصلہ ہے جس کو میں بطن اپنی تقریر کے بیان بھی کر چکا ہوں۔

جمع بین الظاہر والباطن

جس کا حاصل جمع کرنا ہے ظاہر و باطن کے درمیان میں اب اسی کو ان آیات پر منطبق کیے دیتا ہوں اور میرا ارادہ اس انطباق کی بھی زیادہ تفصیل کا تھا لیکن وقت زیادہ ہو گیا ہے لہذا میں ترجمہ آیت کا کر کے ختم کیے دیتا ہوں۔

اور اسی کے ضمن میں انطباق سے بھی مختصراً تعرض ہو جاوے گا پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔
لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ
(یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ انکا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون ولیکن اس کے پاس تمہارا التقویٰ پہنچتا ہے)
سومنیوں کے یہاں بھی رعایت فرمائی کہ پہلے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ میں اہلِ ظاہر کی غلطی بیان فرمائی اور غلطی بھی ایسی بلاغت سے بیان کی کہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔
پھر دوسرے جملہ میں وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى قربانی کی حکمت واللہ کیا بیان کی اور اس تقویٰ کا مصداق اس سے اوپر ارشاد فرمایا ہے۔
وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۤئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ
(جو شخص تعظیم کرے شعائر اللہ واحکام الہٰیہ کی تو انکی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے) یعنی یہ تقویٰ تعظیم ہے شعائر اللہ واحکام الہٰیہ کی اس حکمت تعظیم شعائر اللہ کی جامعیت پر نظر کر کے مجھے تو وہ شعر شریعت کی شان میں یاد آجاتا ہے۔
بہارِ عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد ٭ بہ رنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را
اسکی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل وجان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

قربانی کرنے والوں کی اقسام

یعنی عاملین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو قربانی کی حکمت سمجھ گئے ہیں دوسرے وہ جو حکمت نہیں سمجھے جو حکمت سمجھ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حکمت معلوم ہو جانے سے وقعت بڑھتی ہے حکم کی وہ تو یوں حکم کی تعظیم کریں گے اور جو حکمت نہیں سمجھے انہوں نے اتنی تعظیم کی کہ حکمت بھی نہ سمجھے اور پھر بھی کر ڈالا وہاں تو کسی درجہ میں رائے کا بھی دخل تھا یہاں کچھ بھی نہیں اگر کسی نے کہا کیوں کرتے ہو کہا حکم خدا کا۔
پس آیت وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۤئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ
(جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعار اور اس کے احکام کی تعظیم کرے تو انکی یہ تعظیم کرنا دلوں

کے تقویٰ سے ہے ایسی رُوح بتلا دی قربانی کی۔

رُوح قربانی آگے اس آیت لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ میں فرماتے ہیں کہ اس رُوح یعنی تقویٰ خاص کی کہ تعظیم شعار ہے بہت حفاظت کرو اور سمجھو کہ ذبح بالذات مقصود نہیں دیکھو وہاں نہ خون پہنچتا ہے نہ گوشت جو چیز مقصود ہے وہ البتہ پہنچتی ہے یعنی تقویٰ چنانچہ اگر یہ لحم و دم (گوشت و خون) مقصود ہوتا تو سارا جانور اُٹھ کر چلا جایا کرتا بس صرف ذبح کو مقصود مت سمجھو خدا کے یہاں تقویٰ پہنچتا ہے اس کو دیکھو کہ اس ذبح کے ساتھ تقویٰ بھی مقترن (شامل) ہے جو کہ تعظیم شعائر اللہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح سے کہ تعظیم شعائر منجملہ تقویٰ ہے جب تعظیم بجا لائے تقویٰ متحقق ہو گیا یا تقویٰ سے تعظیم شعائر اللہ پیدا ہوتی ہے ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح کہ تعظیم پیدا ہوتی ہے تقویٰ سے غرض جو چاہو کہو بقول حافظ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف ؛ گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

(خوش قسمتی ہے اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہم کھینچ لیں تب بھی) —— سو تقویٰ ہر حال میں مقصود بالذبح ہوا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سینہ کی طرف اشارہ کر کے کہ یہاں ہے تقویٰ اور ما فی الصدر (اندرونِ سینہ) باطن ہے پس معلوم ہوا کہ اس ظاہر کا ایک باطن بھی ہے اس کو حاصل کرو۔

شاید اس کو سن کر اہل باطن پھول لتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ باطن ہی ہے جو کچھ ہے لہٰذا آگے ان کی غلطی بیان کرنے کے لئے ایک ظاہر کو فرماتے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا ہے تاکہ قربانی کر کے اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ تم کو اس طرح قربانی کرنے کی توفیق دی یعنی نرے تقویٰ کو کوئی نہیں پوچھے گا تقویٰ مطلق مقبول نہ ہوگا تقویٰ وہ قبول ہوگا جس کو قربانی سے تعلق ہو۔

حکمتِ تکبیر یہاں بخر کا مفعول بھی ہو جس سے تکبیر کا فعل بھی متعلق ہو پس اس میں اچھی طرح سے ثابت کر دیا گیا کہ روح سے مراد وہی روح ہے جو اس قلب کے ساتھ ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تا کہ تم نعمت ہدایت و توفیق للذبح پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اس میں اللہ اکبر کہنے کی بھی حکمت بتلا دی کہ یہ دراصل شکر ہے اللہ کا کہ اللہ بہت بڑا ہے کہ اس نے توفیق دی کہ ہم حکم بجا لاسکیں واقعی اگر خدا کی توفیق نہ ہوتی تو ترحم طبعی ہاتھ کو گردن پہ نہیں چلنے دیتا جو ملحدین کے شبہ کی بنا تھی یعنی ذبح کا خلاف ترحم ہونے کے سبب مخالف حکم الٰہی ہونا۔

ذبح کے خلافِ عقل ہونے کا جواب اسی سے ہم جواب دیتے ہیں کہ یہی خلاف ترحم ہونا بہت بڑی علامت ہے اس ذبح کے حکم الٰہی ہونے کی بعضے معترض اس مخالفت ترحم مخالف عقل قرار دیکر کہتے ہیں کہ ذبح کرنا عقل کیخلاف ہے ہم کہتے ہیں اگر ذبح کرنا عقل کیخلاف ہے تو جانوروں کو ٹاپینا بھی عقل کے خلاف ہے بلکہ یہ تو ساری عمر سسکا سسکا کر مارنا ہے ذبح میں تو ایک ساتھ کام تمام کر دیا جاتا ہے دم کے دم میں جان نکل جاتی ہے اس میں ذرا سی دیر تکلیف ہے جو ہوئی اور گذر گئی اور سچ تو یہ ہے کہ نہ یہ عقل کے خلاف ہے نہ وہ۔ ہم تحقیق کے تابع ہیں ہم ان کی طرف سے بھی کہتے ہیں کہ مارنا عقل کے خلاف نہیں اور اپنی طرف سے بھی کہتے ہیں کہ ذبح عقل کے خلاف نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خلاف عقل وہ ہوتا ہے جس میں کوئی محال لازم آوے خلاف عقل ہے خدا کا دو ہونا اجتماع ضدین کا واقع ہونا دور و تسلسل کا صادق آنا تو ذبح کرنے میں یا مارنے کو ٹنے میں کون سی بات عقل کے خلاف استحالہ (محال ہونے) کی لازم آئی جو بات خلاف عقل ہوتی ہے وہ تو واقع ہی نہیں ہوئی معترض ایسے بے عقل ہیں کہ غیر ممتنع الوقوع (جن کا واقع ہونا محال ہے) کو عقل کے خلاف کہتے ہیں ذبح تو واقع ہوتا ہے وہ عقل کے خلاف کیسے ہوا۔

بلکہ ان کا یہ کہنا خود ان کی اصطلاح کے مطابق خلاف عقل ہے بات یہ ہے کہ یہ لوگ علوم عقلیہ پڑھتے نہیں جو چیز ترحم طبعی کے خلاف ہے اسے عقل کے خلاف کہتے ہیں

ترحم طبعی کے خلاف کہو تو البتہ ہم مانتے ہیں واقعی ذبح ترحم کے خلاف ہے لیکن اے صاحب یہی تو بڑی عبدیت ہے کہ گو ترحم کے خلاف ہے لیکن خلافِ طبع و خلافِ نفس مالک کے امتثال امر کے لئے دل پر پتھر رکھ کر کرتے ہیں. جلاد کا بیٹا کسی جرم میں پکڑا آیا ذرا غور کر کے دیکھئے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک درجن بید لگاؤ. اس وقت باپ سے پوچھئے کہ دل کی تو کیا حالت ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی یہ سوال ہے کہ خیر خواہی سرکاری اور جاں نثاری کس میں ہے آیا جاں نثاری یہ ہے کہ کہدے مجھ سے نہیں ہو سکتا یہ آپکی نوکری رکھی ہے یا یہ ہے کہ با دل نخواستہ سر سر بید لگا رہا ہے دل اندر سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہے لیکن حکم کی تعمیل کئے جا رہا ہے ایمان سے بتاؤ یہ ہے جان نثاری اور خیر خواہی یا وہ اگر حاکم کو یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ اس کا بیٹا تھا اور باوجودیکہ اس سے محبت ہونے کے اور ضرب میں بیحد بیجینی کے پھر بھی اس نے میرا حکم بلا چون و چرا مانا تو اسکی نظر میں اس شخص کی کتنی قدر ہوگی آجکل جنگ میں جان دینے بہت جا رہے ہیں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ بڑے خیر خواہ سرکار ہیں جان نثار ہیں یہ کیوں حالانکہ بقول آپ کے جان دینا عقل کے خلاف ہے اور یہ خوب ہے کہ کہیں تو عقل کے خلاف ہے کہیں نہیں یہ عجیب بے جوڑ بات ہے.

معترض کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے قصائی ہیں اس کے مختلف جواب دیئے جاتے ہیں لیکن جواب اصلی یہ ہے کہ معترض کیا جانیں ہم پر کیا گزرتی ہے جب چھری پھیرتے ہیں ہم سے حلف لے لو جس وقت گلا کٹتی ہے ہمارا دل نکلا جاتا ہے لیکن دل پر پتھر رکھ کر یہ حکم معلوم کر کے کہ قربانی کرو کرتے ہیں ترحم تو ہے مگر ترحم پر عمل نہیں حکم کی تعمیل کرتے ہیں یہ ہے عبدیت پوری اسی کی توفیق ہے کہ اتنے بڑے عمل پر قادر ہو گئے.

اسی کو فرماتے ہیں لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس بات پر بڑائی بیان کرو کہ اس نے قربانی کرنے کی توفیق دی.

تفتیش حکمت

اس سوال و جواب پر ایک حکایت یاد آئی. مجھ سے ایک صاحب نے پوچھا کہ طاعون سے بھاگنا کیوں ناجائز ہے حالانکہ وہاں رہنا عقل کے خلاف ہے میں نے کہا کہ لڑائی سے بھاگنا کیوں جرم ہے حالانکہ وہاں طاعون

سے بھی زیادہ ہلاکت کا خوف ہے یہاں تو موت میں رہنا خلافِ عقل اور وہاں عقل کے خلاف نہیں وہ سمجھ گئے میں نے کہا کہ بادشاہ تو تیس روپیہ تنخواہ دے کر جان کا مالک ہو جاوے اور حق تعالیٰ جان کو پیدا کر کے بھی جان کا مالک نہ ہو اور اس میں تصرف اور اپنے قانون کی تنفیذ نہ کر سکے وہ صاحب یہ جواب سن کر کھل گئے یہ شاندار مولویوں کے جواب نہیں ہیں۔ خاکسار غریبوں کے جواب ہیں۔ سچی بات سیدھی سادی قناعت دینے والی ہوتی ہے پس حکمتوں کی تفتیش کے درپے مت ہو صرف یہ دیکھو کہ آیا یہ خدا کا حکم ہے یا نہیں پس یہ معلوم کر لیا اور اطمینان ہو گیا۔ چنانچہ جس طرح جلاد کو حکم ہے کہ بید مارو ہمیں یہ حکم ہے کہ قربانی کرو۔

اسی طرح تمام احکام میں بعد اس امر کے ثابت ہو جانے کے کہ خدا کا حکم ہے پھر حکمتیں مت پوچھو اور نہ بتلاؤ کہ انجام اس کا خطرناک ہے کیونکہ سور کے حرام ہونے کی اگر یہ حکمت بیان کی کہ وہ بیحیا ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک شخص نے اس کا حیادار ہونا ثابت کر دیا جیسا کہ ایک شخص نے اس کا دعویٰ کیا ہے پس اگر کسی فلسفی مسلمان کا عقیدہ یہی ہو کہ سور اس لئے حرام ہوتا ہے کہ بیحیا ہوتا ہے تو جب اس کے نزدیک وہ حیادار ثابت ہو جاوے گا اسی روز پھر وہی شبہ موجود یہ بڑا خطرناک طرز ہے خدا کے لئے اس طرز کو چھوڑ دو اور غیر منصوص حکمتیں جتنی بیان کی جاتی ہیں وہ اکثر اٹکل پچو ہوتی ہیں اگر ہم نے شریعت کو انہیں پہ مبنی سمجھ لیا تو اگر کبھی پچاس برس کے بعد ایسے عقلاء پیدا ہوئے جنہوں نے ان کی نفی کر دی تو جب بناء منہدم ہو گی مبنی بھی منہدم ہو جاوے گا ہم ایسی حکمتیں نکال کر شریعت کی بنیاد ریت پر کھڑی کرتے ہیں جہاں ایک سیلاب آیا سب رخصت۔ بس یوں کہو سور حرام ہے اس لئے کہ خدا کا حکم ہے۔ قیامت آ جائے تو اس کو توڑ بھی نہیں سکتا۔

جس طرح کوئی سرکاری آدمی سے پوچھے کہ موڈی کا کیا حکم ہوا یا پوچھے کہ تولہ بھر تک ٹکٹ لگانے سے بیرنگ نہیں ہوتا دو تولہ کا بیرنگ ہو جاتا ہے اس پر یہی کہے گا کہ واضعان قانون جانیں ضابطہ یونہی ہے۔ اے مسلمانو سیدھا یہی جواب ہے کہ ہم واضع قانون نہیں ہم سے کیوں پوچھتے ہیں یہ خدا سے پوچھئے۔

اصولِ اسلام عقلی ہیں

البتہ اصول اسلام کے ضرور عقلی ہیں باقی فروع کا عقلی ہونا ضروری نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ جارج بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقلی طور پر ثابت کیا جاوے گا، باغی کو مباحثہ سے سمجھایا جاوے گا۔ پھر جب اس کو صاحب سلطنت مان لیا پھر ہر حکم میں حکمتیں تلاش کرنا بغاوت کا شعبہ ہے اگر کسی کو چوری میں سزا دی گئی اور اس نے کہنا شروع کیا کہ فوجداری کی دفعہ میری سمجھ میں نہیں آئی آیا دو پیسہ کا سرقہ بھی کوئی جرم ہے تو کیا جج اس کو ظلم سمجھا کر سزا دے گا یا یوں کہہ دے گا کہ بادشاہ وقت کا یہی قانون ہے اگر اصرار کرے گا تو ڈانٹ دے گا کہ بکومت اور اُلٹی توہینِ عدالت کی بھی سزا بڑھاوے گا اور کہہ دے گا کہ ہم جھڑکی بات سمجھا چکے کہ بادشاہِ وقت کا یہی قانون ہے۔

اسی طرح توحید و رسالت عقلی طور پر سمجھ لو پھر قال اللہ وقال الرسول بس ہے۔ نصرانی، آریہ، یہودی جو کوئی پوچھے یہی جواب ہے کہ خدا کا حکم ہے قرآن میں ہے۔ قرآن کا اللہ تعالیٰ کا کلام ہونا دلیل عقلی سے ثابت کر دیں گے۔ بس سنار کی کھٹ کھٹ اور لوہار کی ایک میں ساری شریعت کی حفاظت کا سامان بتلا رہا ہوں۔ ورنہ اگر حکمتیں بتلانے پر آئے تو آخر کہیں تو عاجز ہو گے مثلاً پوچھا گیا نماز کیوں فرض ہوئی کہا عبدیت کا اظہار ہے، پانچ وقت کیوں مقرر ہوئے تاکہ پابندی میں سہولت ہو یہاں تک چلتا رہا۔ رکعتیں کیوں مختلف تعداد میں مقرر کی گئیں ظہر میں چار فجر میں دو مغرب اور وتر میں تین بس یہاں آ کر تھک گئے جو یہاں آ کر کہو گے وہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دو جس راہ پر دو کوس چل کر بالآخر آنا ہے اسے ابھی سے کیوں نہ اختیار کرو خواہ مخواہ اتنا تعب بھی کیوں سر لیا؟

عالم گیر مرض

جیسا اس وقت ایک اور مرض عالم گیر ہو رہا ہے کہ باوجودیکہ جج شرعیہ حجتیں و دلیلیں چار ہیں مگر پھر بھی ہر حکم کا ثبوت قرآن مجید سے مانگا جاتا ہے اور ہمارے ذہین اہل علم اس قدر سخی ہیں کہ ثبوت دینے کو تیار ہو جاتے ہیں میں وہاں بھی یہی کہا کرتا ہوں کہ کہیں تو عاجز ہو کر کہنا ہی پڑے گا کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں۔ پھر یہ جواب اول ہی سے کیوں نہ دے دو۔

میرے ایک صاحب علم دوست سے کسی نے ڈاڑھی کا ثبوت قرآن شریف سے مانگا انہوں نے یہ آیت پڑھی لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي (میرا سر اور میری داڑھی مت پکڑو) کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑ لی تھی معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے ڈاڑھی تھی لیجئے داڑھی کا ہونا قرآن سے ثابت ہوگیا مجھ سے انہوں نے جواب نقل کیا میں نے کہا کہ مولانا وہ تو وجوب ڈاڑھی کا پوچھتا تھا اور ثابت ہوا وجود اگر وہ یہ سوال کرتا تو کیا ہوتا۔ مولوی صاحب نے کہا اجی اتنی عقل اس میں کہاں تھی کہ وہ یہ سوال کرتا۔ مگر صاحب نہیں تو شرم آتی ہے ایسی دیسی بات کہتے ہوئے جو بات ہو محقق و باوقعت ہونا چاہیے۔ خیر اس سے تو وجوب ثابت ہی نہیں ہوا لیکن اگر کسی آیت سے وجوب بھی ثابت ہو جاتا تب بھی اول دلہ میں سائل کے جواب میں یہی کہنا چاہیے تھا کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں۔ ورنہ اگر وہ اور کوئی سوال کرتا تو کہیں نہ کہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں۔ مگر آج کل اس محقق جواب کو بے وقعت سمجھا جاتا ہے اور تلبیس کے جواب کی وقعت ہوتی ہے۔

عالم اور غیر عالم کی تقریر کا فرق

لیکن اسکی بے وقعتی اور اس کی وقعت چند روزہ ہوتی ہے پھر معاملہ منعکس ہو جاتا ہے۔

مجھ سے ایک انسپکٹر ڈاک خانہ کہتے تھے کہ میں ایک لیکچرار کو جو اخباری دنیا میں مشہور شخص ہیں، میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ایسا محقق نہیں بعد کو جو علماء کی جو تقریریں سنیں تو غور سے یہ فرق معلوم ہوا کہ علماء کی تقریریں فوری اثر تو زیادہ گہرا نہیں کرتیں مگر جتنا زمانہ گزرتا گیا دل میں گھستی گئیں۔ اور اس شخص کی تقریریں جتنا زمانہ گزرتا گیا دھلتی گئیں۔ بس یہ معلوم ہونے لگا کہ محض روغن قازملتا تھا۔ علماء جڑ کی اور گہری کہتے ہیں۔

غرض اصل جواب سوال حکمت کا یہ ہے کہ خدا کا حکم ہے اور اس کے بعد اگر تبرعاً کچھ حکمتیں بیان کر دی جائیں وہ اور بات ہے۔

میرا بھی ارادہ تھا کہ اس آیت میں مفصل حکمتیں قربانی کی بیان کر دوں گو اجمال کا درجہ

تو لفضلہ حاصل ہو گیا لیکن تفصیل کا درجہ نہیں ہو سکا مگر چونکہ وعظ رُوح الحج والثج میں بیان بھی ہو چکا ہے اور اس وقت وقت بھی نہیں اس لئے اجمال ہی پر کفایت کرتا ہوں۔ —— نیز اس وقت زیادہ مقصود بیان کرنا اس کا تھا کہ مسلک محقق جمع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن دونوں کو جمع کرنا) ہے سو اسی کو یہاں سمجھ لیجئے کہ اس عمل کا باطن تقویٰ اور تعظیم شعائر اللہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ذبح کرو۔ یہ نہیں کہ دام ادا کر دیئے۔

قربانی کی جگہ قیمت

ایک بزرگ اہل حال اس غلطی میں مبتلا تھے کہ ہمیشہ دام دیدیا کرتے قربانی نہ کرتے ایک روز خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے۔ سب کے پاس سواری ہے۔ ان کے پاس نہیں انہوں نے سواری طلب کی جواب ملا کہ یہاں کہاں سواری جو قربانی کرتے ہیں ان کو یہاں سواری ملتی ہے تم قربانی نہیں کرتے جاؤ گھسٹتے ہوئے۔ بیدار ہوئے تو بہت پریشان ہوئے فوراً توبہ کی اور قربانی کرنا شروع کر دیا۔

واہیات سوال

اس پر بعضے نو عمر ہنستے ہیں کہ بہت سے جانور ہوں گے کون سے جانور پہ سواری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سب پر قادر ہیں۔

ایک تو یہ صورت ہے کہ سب کے عوض میں ایک بہت بڑا جانور دیدیں ورنہ سب کی ڈاک لگا دیں اگر کسی کے اصطبل میں بہت سے گھوڑے بندھے ہوں تو کیا اس پر بھی کبھی تعجب کیا ہے کہ اتنے گھوڑوں میں کس پر سواری کرتا ہو گا۔ وہاں تو یہ سمجھ لیتے ہو کہ مثلاً یہ ڈاک لگانے کے کام میں آتے ہیں طویل سفر ہو تو ایک گھوڑا کام نہیں دے سکتا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایک ایک گھوڑا بھیج دیا جاتا ہے اور نہایت سہولت سے اتنا بڑا سفر بہت جلد قطع ہو جاتا ہے۔ آخرت کی سب باتوں پر تعجب اور دنیا کی کسی بات پر تعجب نہیں دنیا کی سب باتوں کو عقل کے قریب کر لیتے ہیں۔

مولانا احمد حسن صاحب امروہی خود مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ میں ریل میں سوار تھا۔ دوسرے درجہ میں ایک مولوی صاحب پرانی وضع کے اور ایک نئی وضع کے

میانہ عمر شخص سوار تھے ایک اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تو چند انگریزی خواں لڑکے اگر اسی دوسرے درجہ میں بیٹھے اور ان مولوی صاحب کا اسباب منتشر کر کے خود اپنا اسباب جما کر بیٹھ گئے، وہ مولوی صاحب آئے تو ملامت کی یہ شرمندہ ہوئے، چاہا کہ مولوی صاحب کو شرمندہ کریں۔ کہنے لگے کیوں صاحب نماز پنجگانہ فرض ہے انہوں نے کہا ہاں کہا یہ سب جگہ پانچ ہی وقت فرض ہے انہوں نے کہا ہاں کہنے لگے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی پانچ ہی وقت فرض ہے، مولوی صاحب نے کہا کیا تم وہاں سے آرہے ہو یا وہاں جا رہے ہو۔ کہنے لگے نہیں، مولوی صاحب نے کہا تو بس ہم ایسے فضول سوال کا جواب نہیں دیتے اس پر وہ سب قہقہہ مار کر ہنسے اور اس ہنسنے میں وہ میانہ عمر شخص بھی شریک تھے۔

مولانا فرماتے تھے کہ مجھ کو ان کا ہنسنا بہت ناگوار ہوا، آئندہ اسٹیشن پر وہ لڑکے تو اُتر گئے میں وہاں جا کر بیٹھا اور ان صاحب سے میں نے پوچھا کیوں جناب آپ کا دولت خانہ کہاں ہے آپ ملازم کہاں ہیں، سب کا جواب ملا پھر میں نے پوچھا آپ کو شب روز میں کے گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے اس کا بھی جواب دیدیا، میں نے کہا کیوں جناب اگر گورنمنٹ کی سلطنت اس مقام پر ہو جاوے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے اور آپ کی وہاں کی بدلی ہو جاوے تو کیا وہاں بھی ایک شب و روز میں اتنے ہی گھنٹے کام کرنا ہوگا کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اندازہ وقت کا کر کے اس شب و روز کو سال بھر قرار دے کر سال بھر کا کام لیا جاوے گا۔

میں نے کہا افسوس سلطان دنیا کے احکام و تجویز کی تو آپ کے ذہن میں یہ وقعت کہ اس پر اشکال واقع ہو تو فوراً اس کی توجیہ کر لی اور سلطان دارین کے احکام کی اتنی بے وقعتی کہ اس پر جو ایسا ہی اشکال واقع ہوا تو بجائے توجیہ کے اس کی تحقیر کی اور اس پر تمسخر اڑایا وہ شخص بے حد شرمندہ ہوا اور معذرت اور توبہ کی۔

بس اس طرح یہاں بھی ایسی ہی توجیہ کر سکتے ہو۔ بس یہ سوال ہی واہیات ہے کہ بہت سے جانور رہوں گے کون سے جانور پر سواری ہوگی۔ یہاں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

اور اصل بات تو یہ ہے کہ اس توجیہ پر کچھ موقوف نہیں ہم یوں کیوں نہ کہہ دیں کہ تعدد کے وقت ہم کو معلوم نہیں کس طرح ہوگا کیونکہ بتلایا ہم کو گیا نہیں اور رائے کا کام نہیں خواہ یہ صورت ہو جاوے یا کچھ اور ہو جاوے۔

ایک مجذوب کا قول مجھے بہت پسند آیا۔ اس سے کسی واقعہ کی نسبت پوچھا کب ہوگا اس نے کہا ہم اللہ میاں کے بھتیجے نہیں کہ چچا جان نے یہ کیا ہو کہ لاؤ بھتیجے سے بھی مشورہ کرلیں۔ ہم ان کے سررشتہ دار نہیں ہم کو کیا خبر کب ہوگا۔ پس تکوینیات میں بھی اور تشریعیات میں بھی بندہ کو اپنا یہ مذہب رکھنا چاہیئے کہ ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار ٭ کار ملک است آں کہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہیئے)

کار کن کار بگذر از گفتار ٭ اندریں راہ کار باید کار!

(عمل کر دعوے کو ترک کر دو۔ اس طریق میں عمل و کام ہی کی ضرورت ہے)

قدم باید اندر طریقت نہ دم ٭ کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(یعنی طریقت میں قدم رکھنا چاہیئے یعنی عمل کرنا نہ دعویٰ کرنا اس لئے بغیر قدم رکھے عمل کئے دعوی کی کچھ اصلیت نہیں)

اب دعا فرمائیے فہم سلیم و عمل مستقیم کی (پھر دعا کر کے جلسہ ختم کیا) فقط:

تمت بالخیر

ہمارا معاشی نظام

یہ کتاب بھی مفتی اسلام حضرت مولانا تقی عثمانی کے شگفتہ قلم کی مرہون منت ہے عصر حاضر میں اسلام کے عملی نفاذ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئے پیدا ہونے والے مسائل اور انکے اسلامی حل کے سلسلہ میں مفتی اسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب برابر لکھتے رہتے ہیں یہ کتاب بھی انہیں مسائل پر ایک عظیم کلیدی حیثیت کی حامل ہے جسکا اندازہ آپ کو درج ذیل عنوانات سے بخوبی ہو جائے گا۔

ہمارا معاشی نظام
اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات
علماء کا متفقہ معاشی خاکہ
ہمارے معاشی مسائل اور ان کے حل کی مختلف تجاویز
سوشلزم اور غریب عوام
اسلام جمہوریت اور سوشلزم
سوشلزم اور معاشی مساوات
سوشلسٹ اعتراضات
زرعی اصلاحات

سوالنامہ ربا کا جواب
غیر سودی کاونٹرز
بچت کا ہفتہ اور حکومت کی مالی اسکیمیں
مشارکہ کی نئی اسکیم
غیر سودی بینکاری، چند تاثرات
سود کا مکمل خاتمہ
بلاسودی بینکاری
نیا بجٹ اور سودی اسکیمیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

احکامِ حج

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم :

تمہید لبعد از خطبہ :

چونکہ رسالہ الہادی ہر ماہ کی تین تاریخ کو شائع ہوتا ہے اور نماز عید و صدقہ فطر وغیرہ کے مسائل کی ضرورت اس سے پیشتر ہی ہو جاتی ہے اس لئے ماہ شوال کے متعلق ضروری احکام رمضان المبارک کے رسالہ میں ہدیہ ناظرین ہو چکے ہیں لیکن احکام حج کا بیان باقی رہ گیا تھا جس کا تعلق اس بابرکت ماہ کے ساتھ دو وجہ سے ہے اول یہ کہ اس مہینے سے اشہر حج شروع ہوتے ہیں جیسا کہ آئندہ حدیث شریف سے معلوم ہوگا دوسرے یہ کہ ہمارے ملک سے اکثر اسی ماہ میں سفر حج شروع کیا جاتا ہے۔ لہذا اب احکام حج لکھے جاتے ہیں ——— واللہ الموفق والمعین ۔

اشہر حج ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول خداوندی الحج اشہر معلومات میں کہ وہ (یعنی حج کے معین مہینے) شوال اور ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس روز ہیں الدر المنثور عن اوسط الطبرانی و الخطیب ابن مردویہ ونقل عن کثیر من السلف فائدہ شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا مکروہ ہے اور احرام کے علاوہ افعال حج میں سے کوئی فعل شوال سے قبل ہو تو وہ بالکل غیر معتبر ہے مثلاً کسی شخص نے طواف قدوم

کے بعد سعی بین الصفا والمروہ رمضان میں کر لی تو سعی کافی نہیں اھ اور حق تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے لیئے لوگوں کے ذمہ بیت اللہ کا حج کرنا ہے اُن پر جو کہ اُس تک سبیل (یعنی زاد راہ) کی طاقت رکھیں۔

تاخیر حج اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے کہ جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اس کو چاہیئے کہ جلدی کرے۔ (ابوداؤد، دارمی) یعنی فرض ہونے کے بعد اول ہی سال جانا لازم ہے اگر نہ گیا تو تاخیر حج کا گناہ ہوگا۔ اور اگر کئی سال تک تاخیر کرتا رہا تو فاسق مردود الشہادۃ ہے کما فی الدر وغیرہ اھ۔ ونیز ارشاد فرمایا رسول خدا نے کہ جس شخص کو حج سے کھلم کھلا ضرورت یا ظالم بادشاہ یا رکاوٹ کے قابل مرض نے حج سے نہ روکا ہو اور پھر بھی (باوجود فرض ہونیکے) اس نے حج نہ کیا ہو پس خواہ وہ یہودی ہو کر مرے خواہ نصرانی۔ (دارمی)

فضیلت حج ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے خالص، اللہ کے لیے حج کیا اور اُسمیں فحش کوئی نہ کی۔ اور گناہ نہ کیا تو وہ شخص اُس دن کی مانند لوٹتا ہے جس دن کہ اُس کی ماں نے اُسکو جنا تھا (متفق علیہ)

عُمرہ کی فضیلت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیئے ہیں وہ سب ذیقعدہ میں تھے سوائے اُس ایک کے جو حج وداع کے ساتھ تھا کہ وہ ذوالحجہ میں واقع ہوا تھا۔ متفق علیہ۔

فائدہ:۔ عمرہ سنت مؤکدہ ہے بلکہ بعض فقہاء نے واجب کہا ہے اور عمرہ اس کو کہتے ہیں کہ احرام میں عمرہ کی نیت کی جاوے اور طواف کعبہ اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرے پوری تفصیل کسی واقف سے زبانی معلوم کر لیں۔

فائدہ ملا:۔ اس جگہ ایک بات قابل تنبیہ یہ ہے کہ عام لوگ جو ماہ ذیقعدہ کو منحوس سمجھتے ہیں یہ بڑی سخت بات ہے اور باطل عقیدہ ہے دیکھیئے آنحضرتؐ نے اس ماہ میں تین عمرے کیئے ہیں اس سے کتنی برکت ثابت ہوتی ہے ونیز ماہ ذیقعدہ

حج کے مہینوں میں سے ہے جیسا کہ حدیث اول میں گذر چکا اھ اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ حج اور عمرہ ملا کر کیا کرو کیونکہ وہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسا کہ بھٹی لوہے اور چاندی اور سونے کے میل کو دور کرتی ہے اور حج مبرور (یعنی مقبول) کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (ترمذی و نسائی)

فضیلت یوم عرفہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کسی دن عرفہ کے دن سے زیادہ ذلیل و راندہ ہوا اور حقیر و رنجیدہ نہیں دیکھا گیا اور نہیں ہے۔ یہ مگر اسی کی وجہ سے جو کہ وہ رحمت کا نازل ہونا۔ اور خدا تعالے کا بڑے بڑے گناہ سے درگذر فرمانا دیکھتا ہے سوائے جنگ بدر کے دن کہ اس میں تو یوم عرفہ کے برابر یا زیادہ اس کی خواری وغیرہ دیکھی گئی) کیونکہ (اس روز) اس نے جبریل علیہ السلام کو فرشتوں کی صفیں ترتیب دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ (مالک مرسلاً و شرح السنہ) اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ (ایک) عمرہ (دوسرے) عمرے تک کفارہ ہے ان دونوں کے درمیان (کے گناہوں) کا۔ (ترغیب عن مالک والشیخین والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

خدائی مہمان اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالے کے مہمان ہیں اگر دعا مانگیں تو خدا قبول کرتا ہے اور وہ استغفار کریں تو خدا اُن کی مغفرت کر دیتا ہے (ترغیب نسائی وابن ماجہ) ۱۲

زیارت مدینہ اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اُس کے لیے میری شفاعت ضروری ہو گئی۔ (آثار السنن عن ابن خزیمہ فی صحیحہ والدارقطنی وآخرین ونسائی و اسنادہ حسن)

فائدہ:۔ جن کو گنجائش ہو وہ حج کے ساتھ زیارت مدینہ کا شرف بھی ضرور حاصل کریں کہ اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے بلکہ تاکید بھی روایات میں آئی

ہے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر شریف کی نیت سے جانا بھی مضائقہ نہیں رکھتا ۱۲۰۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (ابراہیم علیہ السلام سے بھی کہا گیا تھا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے کا) اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس (حج کے لیے) چلے آئیں گے۔ پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنی پر بھی جو کہ دراز رستوں سے پہنچی ہوں گی۔

حج کے متعلق چند ضروری ہدایات

تارکِ حج (۱) جس کے پاس ضروریات سے زائد اتنا خرچ ہو کہ سواری پر متوسط گذران سے کھانا پینا چلا جاوے اور حج کر کے چلا آوے اس کے ذمے حج فرض ہو جاتا ہے اور حج کی بہت بڑی بزرگی آئی ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو حج گناہوں اور خرابیوں سے پاک ہو اس کا بدلہ بجز بہشت کے اور کچھ نہیں ہے اسی طرح عمرہ پر بھی بڑے ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح دُور کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کرتی ہے اور جس کے ذمے حج فرض ہوا اور وہ نہ کرے اس کے لیئے بڑی دھمکی آئی ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے اور سواری کا اتنا سامان ہو کہ وہ بیت اللہ شریف تک جا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (نعوذ باللہ) غرضکہ حج کی بیحد فضیلت آئی ہے اور اس کے تارک پر جبکہ اس پر فرض ہو چکا ہے سخت وعید آئی ہے سو یہ تو بات تو اکثروں کو معلوم ہے لیکن اس میں بعض غلطیاں عام ہو رہی ہیں ان کو اس جگہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

مسائل حج الف:۔ جب حج کے خرچ کا حساب لگاتے ہیں تو اس میں زیارت مدینہ منورہ کے خرچ کا بھی حساب لگاتے ہیں۔ پس اگر مدینہ منورہ

تک جانے کا خرچ ہوتا ہے جب تو حج کو فرض سمجھتے ہیں ورنہ فرض نہیں سمجھتے تو یاد رکھو کہ اگر صرف سفر حج کے لیے جانے کا اور وہاں سے واپس چلے آنے کا خرچ ہو تو حج فرض ہو جاتا ہے۔ گو مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے خرچ نہ ہو۔ البتہ اگر اتنی زیادت کا سامان یا ہمت ہو تو اس کا ثواب بھی بیحد و حساب ہے۔ لیکن حج کا فرض ہونا اس پر موقوف نہیں اگر ایسا شخص حج نہ کرے گا۔ تو اس کے لیئے وہی وعید ہے جو مرقومہ بالا حدیث میں آئی ہے۔ (ب) راستہ میں اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو لوگ حج کو فرض نہیں سمجھتے۔ حالانکہ معمولی اندیشہ کا اعتبار نہیں۔ پس اگر راستہ میں غالب گمان سلامتی کا ہے اور گمان بدامنی کا مغلوب ہے تو حج فرض ہو جاتا ہے (ج) بعض لوگوں کو حج کی گنجائش ہوتی ہے ولیکن تعمیر مکان یا شادی وغیرہ میں خرچ کرلے کو مقدم سمجھ کر حج سے اپنے آپ کو سبکدوش خیال کرتے ہیں اس کے متعلق یہ مسئلہ ہے کہ جس زمانہ میں عموماً لوگ حج کو جاتے ہیں (مثلاً ہمارے ملک میں ماہ شوال) اس سے قبل اگر کسی نے دوسرے کام میں رقم وغیرہ خرچ کر دی تب تو حج فرض نہ ہوگا۔ اور اگر سفر حج کا زمانہ آ گیا تو حج فرض ہو گیا۔ اور تعمیر مکان یا شادی وغیرہ امور غیر ضروریہ عند الشرع میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ گو اس تعمیر وغیرہ کی حاجت ہی ہو اگر خرچ کریگا گنہگار ہوگا۔ اور حج ذمہ رہے گا خوب سمجھ لو۔

(۱) جس پہ حج فرض ہو اور اسکے والدین منع کرتے ہوں اس کو جانا فرض ہے انہیں والدین کی اطاعت جائز نہیں۔ (۲) اسی طرح جس عورت پر حج فرض ہو اور اس کے ساتھ اس کا محرم بھی ہو مگر اس کا شوہر منع کرتا ہو اس کو شوہر کا کہنا ماننا جائز نہیں۔ (۳) بعض عورتیں بدوں محرم کے دوسری عورتوں کے ساتھ یا ثقہ مردوں کے ساتھ حج کو چلی جاتی ہیں یہ جائز نہیں۔ (۴) عورت اگر عدت میں ہو اس کو حج کا سفر کرنا بھی جائز نہیں خواہ عدت وفات ہو یا عدت طلاق۔ اور طلاق رجعی ہو یا بائن یا مغلظہ حتی کہ اگر حج کے راستہ میں عدت واجب ہو جائے یعنی تین منزل سفر[عہ] کرنے کے بعد

حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں۔

راستہ میں خاوند نے طلاق بائن دیدی ہو یا اُس کا انتقال ہو گیا ہو تو اُسی جگہ عدت پوری کرے۔ البتہ اگر جہاز یا جنگل وغیرہ میں ایسا اتفاق پیش آجائے تو ساحل تک یا قریبی آبادی تک پہنچا جاتا ہے اور یہ تفصیل جب ہے کہ مقام طلاق یا وفات سے مکہ معظمہ تین منزل ہو اور اگر تین منزل سے کم ہو تو پھر حج کو چلی جائے اور اگر خاوند نے طلاق رجعی دی ہے اور خاوند ساتھ جا رہا ہے تو سفر حج موقوف کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۵) جس نے نابالغی میں حج کیا ہو اور پھر اس کو گنجائش سفر حج کی ہو جاوے تو پھر اس پر حج فرض ہوگا۔ وہ پہلا حج کافی نہیں۔ (۶) اگر بلوغ کے بعد ناداری کی حالت میں حج کیا ہو اور پھر مالدار ہو جائے تو وہ پہلا حج کافی ہے۔

حج اکبر کیا ہے؟

(۷) حج بدل کے مسائل بہت نازک ہیں جب کوئی حج بدل کے لیے جائے یا کسی کو بھیجے تو کسی محقق عالم سے اس کے مسائل تحقیق کرلے۔ (۸) بعض لوگ تبرکات لانے کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ اگر اُس کے زیادہ خریدنے کے لائق خرچ نہ ہو۔ حج کو ہی نہیں جاتے یا اسی طرح واپس آکر دعوت دینے کو بھی۔ سو ان امور کی وجہ سے حج کو ملتوی کرنا حرام ہے (۹) عوام الناس میں جمعہ کے روز کے حج کا لقب حج اکبر مشہور ہے۔ سو یہ شریعت میں لفظی تحریف کرنا ہے کیونکہ اطلاقات شرعیہ میں حج اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں اس عمرہ سے ممتاز کرنے کے لیے جس کو حج اصغر کہتے ہیں اور قرآن مجید میں جو شروع سورۂ براءت میں یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ آیا ہے وہاں یہی تفسیر ہے اب اس اصطلاح مخترع سے احتمال ہے تفسیر میں غلطی کا اور عوام اس کے اہتمام میں بھی بہت غلو کرتے ہیں۔ یہ شریعت میں تحریف معنوی یعنی بدعت ہے

گذشتہ صفحہ کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

عـــہ۔ اور اگر ابھی تین منزل سفر نہ ہوا تھا اور مکہ معظمہ تک تین منزل باقی ہوں تو گھر واپس آنا ضروری ہے اور اگر وہاں سے گھر بھی تین منزل سے کم ہو اور مکہ معظمہ بھی تو اختیار ہے کہ واپس آجائے یا حج

البتہ حج یوم جمعہ کی فضیلت کا انکار نہیں ایک بڑی فضیلت یہی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حج جمعہ کے روز واقع ہوا تھا۔ مگر عوام کی زیادات یہ محض بے اصل ہیں۔

فرضیتِ حج کے بارے میں تنبیہ

عام طور پر یوں سمجھا جاتا ہے کہ جب نقد روپیہ مصارفِ حج کے لیئے کافی موجود ہو تب حج فرض ہوتا ہے۔ حالانکہ جس کے پاس حاجت سے زائد اتنی زمین وغیرہ ہو جس کی قیمت مصارف حج کے واسطے کافی ہو اُس پر بھی حج فرض ہے لہٰذا عالمگیری سے وہ صورتیں مفصل لکھی جاتی ہیں جن میں بدون نقد کے بھی حج فرض ہوجاتا ہے۔

(۱) رہائشی مکان کے علاوہ کوئی زائد مکان ہو تو اُس کو بیچ کر حج کرنا فرض ہے (یعنی جبکہ اُس کی قیمت میں حج ہو سکے اسی طرح کسی کے پاس غلام ہو اور اُس سے خدمت لینے کی ضرورت نہ ہو تب بھی فرض ہے کہ غلام کو فروخت کر کے حج کرے۔ یہی حکم جب ہے جبکہ ضرورت سے زائد گھوڑا وغیرہ کسی کے پاس ہو) لیکن اگر کسی کے پاس صرف ایک مکان ہو اور وہ اتنا بڑا ہو کہ ایک حصہ اُسکی رہائش کے لیے کافی ہے اور باقی کی قیمت حج کے واسطے کافی ہوسکتی ہے تو اُس کا حصہ فروخت کرنا ضروری نہیں ہے اسی طرح اگر کسی کے پاس بہت قیمتی مکان ہے کہ اُسکی قیمت میں حج بھی ہو سکتا ہے اور معمولی مکان بھی مل سکتا ہے تب بھی اس کے ذمہ حج فرض نہیں ہے گو افضل یہی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں حج کرے۔

(۲) اگر کسی کے پاس قیمتی کپڑے ہیں جو استعمال میں نہیں لاتے جاتے تو لازم ہے اُن کو فروخت کر کے حج کیا جائے۔ زائد برتنوں کا بھی یہی حکم ہے اور زیور نقدی بالکل نقد کے حکم میں ہیں۔

(۳) اگر کسی جاہل کے پاس کتابیں ہوں تو اُن کو حج کے واسطے فروخت کرنا ضروری ہے البتہ اگر عالم کے پاس فقہ کی کتابیں ہوں تو اُن کو فروخت کرنا ضروری نہیں (اور کتب تفسیر و حدیث وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے اور شامی میں ہے کہ علوم الٰہیہ یعنی صرف، نحو وغیرہ کی کتابیں بھی کتب دینیہ کے ساتھ شمار کی جائیں گی۔ اور طب و نجوم (وغیرہ) کی کتابوں کو فروخت کرنا ہر حال میں ضروری ہے خواہ وہ جاہل کے پاس ہوں یا اہل علم کے اور گو وہ استعمال میں آتی ہوں۔ اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ منطق فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا وہی حکم ہے جو طب کی کتابوں کا ہے۔ واللہ اعلم۔

(۴) اگر کسی دکاندار کے پاس اتنا مال تجارت ہے کہ اگر کچھ مال فروخت کرکے حج ہو سکتا ہے اور باقی ماندہ مال سے بقدر ضرورت تجارت ہو سکتی ہے تو حج کرنا فرض ہے۔

(۵) جس پیشہ ور کے پاس اتنی زمین ہے کہ اگر مصارف حج کی مقدار فروخت کر دے تو باقی زمین کی آمدنی سے گذر ہو سکتا ہے تو اُس پر زمین فروخت کرکے حج کرنا لازم ہے۔

(۷) کاشتکار کے پاس اگر ہل اور بیل وغیرہ کے علاوہ اتنا سامان ہو کہ اس کو مصارف حج کے لیے کافی ہو سکتی ہے تو اس کے ذمہ بھی لازم ہے کہ زائد سامان کو فروخت کرکے حج کرے۔ فقط۔ واللہ اعلم۔

احقر عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ مقیم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر
مورخہ ۱۴ رمضان ۱۳۵۱ھ

عہ عالمگیری میں یہ قید بھی ہے کہ اس عالم کو ان کتابوں کی ضرورت بھی ہو مگر شامی نے یہ قید نہیں لگائی۔ احقر کے خیال میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ قید کو اتفاقی کہا جائے اسی لیے اسکو متن میں احقر نے نہیں لیا۔ لیکن جس صاحب کو اس مسئلہ کی ضرورت پیش آوے اس کو چاہیے کہ علمائے کرام سے تحقیق کر لے۔ فقط والسلام ۱۲ منہ

ماہ ذوالحجہ کے احکام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بعد حمد و صلوٰۃ مسلمان بھائیوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس ماہ مبارک میں حج ہوتا ہے اسلئے اس کو ذوالحجہ کہتے ہیں (یعنی حج کا مہینہ) اور حج کی یاد دہانی کے لیے ماہ شوال مناسب ہے اس واسطے حج کی تاکید و فضیلت ماہ شوال کے پرچہ میں درج ہو چکی ہے اب بغرض مکرر یاد دہانی عرض ہے کہ جن لوگوں کے ذمہ حج فرض ہے وہ اب بھی ہمت کر کے اس فریضہ خداوندی سے سبکدوشی حاصل کر لیں۔ کیونکہ اس ماہ ذیقعدہ میں جانے سے بھی یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے اس کار خیر میں دیر کرنا گناہ ہے جیسا کہ رسالہ شوال میں مفصل گزر چکا۔ سال آئندہ ٹال دینا ہرگز مناسب نہیں۔ خدا جانے اس وقت تک زندگی رہے یا موت کا پیام آجائے اور حج کے علاوہ دوسرے احکام شرعیہ جو اس ماہ ذوالحجہ سے تعلق رکھتے ہیں اُن کے واسطے ماہ ذیقعدہ کا رسالہ مناسب خیال کیا گیا تاکہ پیشتر سے واقف ہو کر اہتمام کیا جاوے[عہ] اور وہ احکام یہ ہیں ذوالحجہ کی یکم سے نہم تک روزے اور دسویں تک شب بیداری۔ تکبیر تشریق۔ نماز عید الاضحٰے۔ قربانی۔ ان سب کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

عہ ان احکام میں تین مسئلے خاص طور پر پہلے ہی سے خیال رکھنے کے قابل ہیں اوّل یہ کہ قربانی کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرنا مستحب ہے اسلئے کچھ روز پیشتر ہی خرید لینا چاہیئے دوسرا یہ کہ جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو وہ ان دنوں میں (پہلی ذیحجہ سے قربانی ہونے تک) ناخن اور بال نہ بنواوے۔ تیسرا یہ کہ ذیحجہ کی چاندرات سے شب بیداری اور پہلی ہی تاریخ سے روزہ رکھنا چاہیئے اور یہ سب اعمال مستحب ہیں۔ ۱۲ منہ)

نو دن کے روزے اور دسویں شب تک بیداری کی فضیلت

حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور طاق کی اور جفت کی۔ اس آیت کے متعلق درمنثور نے متعدد سندوں سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اس آیت میں دس راتوں سے عشرۂ ذی الحجہ مراد ہے اور طاق سے عرفہ کا دن اور جفت سے قربانی کا دن مراد ہے واللہ اعلم

حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی دن ایسے نہیں جن میں نیک عمل اللہ تعالیٰ کو ان دس دنوں (کے عمل) سے زیادہ پسند ہو (بخاری)

اور حضرت رسول خدا صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی دن ایسے نہیں جن میں عبادت کرنا خدا تعالیٰ کو عشرۂ ذی الحجہ (کی عبادت) سے زیادہ پسند ہو (کیونکہ) ان میں سے ہر ایک دن کا روزہ ایک سال روزہ رکھنے کے برابر ہے اور ہر ایک رات کا جاگنا شب قدر میں جاگنے کے برابر ہے۔ (ابن ماجہ والترمذی وقال اسنادہ ضعیف)

فائدہ: دسویں تاریخ سے تیرھویں تک چار یوم کا روزہ حرام ہے اس واسطے روزہ کی یہ فضیلت نو تاریخ تک کے لیئے ہے اھ

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ عرفہ (یعنی ذی الحجہ کی نو تاریخ) کا روزہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم) و نیز ارشاد فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہ عرفہ کا روزہ ہزار روزہ کے برابر ہے (ترغیب عن البیہقی والطبرانی باسناد حسن)

عہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ عشرہ ذی الحجہ افضل ہے یا رمضان شریف کا عشرہ اخیرہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ مختار یہ ہے کہ اس عشرہ کے دن افضل ہیں اور عشرہ اخیرہ کی راتیں۔ واللہ اعلم ۱۲ منہ۔ عہ بعض جگہ عوام شب برات کی تیرھویں یا چودھویں کو عرفہ کہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ ۱۲ منہ۔

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جس نے عرفہ کا روزہ رکھا اس کے پے در پے دو سال کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (ترغیب عن ابی یعلی ورجالہ رجال الصحیح)

فائدہ: یعنی ایک سال گذشتہ کے اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں گذر چکا اھ

اس عشرہ کی فضیلت میں بہت احادیث وارد ہوئی ہیں مگر ہم نے اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں لکھی ہیں اور انہیں سے معلوم ہوگیا کہ ہم سے نہم تک ہر طرح کی عبادات میں کوشش کرنا چاہیئے۔ اور حتی الوسع ان ایام کو صیام و قیام یعنی ۲۹ شب بیداری میں گذارنا چاہیئے بالخصوص نو تاریخ کا روزہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے اب آگے ایک حدیث شریف لکھی جاتی ہے جس سے دسویں رات کو جاگنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

فرمایا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جو شخص عیدین (یعنی عید الفطر و عید الضحیٰ) کی دونوں راتوں میں طلب ثواب کے لیے بیدار رہا اُس کا دل اس دن زندہ رہے گا جس دن سب کا دل مُردہ ہوگا (ترغیب عن ابن ماجہ وقال رواتہ ثقات الا ان بقیۃ مدلس وقد عنعنہ) علاوہ ازیں جن روایتوں میں اس عشرہ میں نیک عمل اور صیام و قیام کی فضیلت گذر چکی ہے اُن سے بھی اس کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کما لایخفے واللہ اعلم

تکبیراتِ تشریق

ارشاد فرمایا آنحضرت علیہ السلام نے کہ نہ کوئی دن اللہ کے نزدیک اس عشرہ (ذوالحجہ) سے افضل ہے اور نہ کسی دن میں عمل کرنا ان میں عمل کرنے سے افضل ہے پس تم ان میں (خصوصیت سے) لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کی کثرت رکھو کیونکہ یہ دن تکبیر اور تہلیل کے ہیں (در منثور عن البیہقی)

فائدہ: یوں تو اس تمام عشرہ میں تکبیر و تہلیل کی زیادتی پسندیدہ ہے جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا لیکن نو تاریخ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ہر نماز کے بعد بلند آواز سے ایک مرتبہ تکبیر کہنا ضروری ہے۔ جیسا کہ آثار السنن میں بحوالہ ابن ابی شیبہ حضرت علی کرم اللہ کا معمول مروی ہے (ونقل عن ابن حجر ان اسنادہ حسن) ونیز سنن بیہقی میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ و حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہی روایت کی ہے علاوہ ازیں بیہقی ہی نے جابر بن عبداللہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق کی عصر تک تکبیر پڑھا کرتے تھے۔ (وقال اسنادہ لا یحتج بہ وقال ایضاً ابعد سرد الطرق وفی روایۃ الثقات کفایۃ۔ واللہ اعلم۔

نماز عید الاضحے کے احکام

عید اور بقر عید کی نماز شہر اور قصبہ اور اس بڑے گاؤں کے لوگوں پر واجب ہے جو قصبہ کے مشابہ ہو جیسا کہ جمعہ اور جس طرح جمعہ چھوٹے گاؤں میں جائز نہیں اسی طرح عیدین کی نماز بھی جائز نہیں اسلئے چھوٹے گاؤں میں ہرگز نہ پڑھی جاوے۔ اور بقر عید کے روز سنت یہ ہے کہ نماز عید سے پہلے کچھ کھائیں پئیں نہیں جو لوگ قربانی کریں اُن کے لیے یہ مسنون ہے کہ نماز کے بعد نہ کھاویں بلکہ قربانی کے بعد اپنی قربانی میں سے

عہ مگر عورتیں آہستہ کہیں ۱۲ منہ۔

عہ تکبیر یہ ہے اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔ ۱۲ منہ

عہ اور عید الفطر میں نماز سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا مسنون ہے ونیز یہ کہ صدقۂ فطر نماز سے پہلے ہی ادا کرے اور راستہ میں تکبیر آہستہ کہی جاوے باقی سب سنتیں وہی ہیں جو بقر عید میں ہیں ۱۲ منہ۔ عہ اور دیہاتی لوگ اگر صبح ہی قربانی کر کے شہر میں عید پڑھنے آویں تو وہ نماز سے پیشتر ہی قربانی میں سے کھالیں ۱۲ منہ

کھاویں۔ اور نماز سے بیشتر غسل اور مسواک کر کے اپنے موجودہ کپڑوں میں سے عمدہ ترین کپڑے پہنیں اور خوشبو لگاویں اور جہاں تک ہو سکے جلدی عید گاہ پہنچیں اور پیدل جاویں اور راستہ میں با آواز بلند تکبیر کہتے رہیں تکبیر وہی ہے جو ایام تشریق کے حاشیہ میں گذری یعنی اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ اور نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر پڑھیں کہ بعض فقہا نے اُس کو واجب کہا ہے اور خطبہ کے وقت اسی طرح صف بستہ چپ چاپ بیٹھے رہیں اکثر لوگ خطبہ نہیں سنتے وہ برا کرتے ہیں اور ترک سنت متوارثہ کے وبال میں گرفتار ہوتے ہیں اور جو لوگ خطبہ کے وقت بولتے ہیں وہ سخت گنہگار ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت چپ رہنا واجب ہے پھر جب واپس ہوں تو جس راستہ سے گئے تھے اُس راستہ سے نہ آویں بلکہ دوسرے راستہ سے لوٹیں اور واپسی میں اگر کسی چیز پر سوار ہو جائیں تو مضائقہ نہیں

تنبیہ اول عورتوں کی جماعت

بعض جگہ دستور ہے کہ جب عید گاہ میں مرد نماز کو جاتے ہیں تو عورتیں جمع ہو کر اپنے گھروں میں نفل نماز پڑھتی ہیں پھر بعض جگہ تو جماعت کرتی ہیں اور بعض جگہ تنہا پڑھتی ہیں حالانکہ دونوں طرح کراہت سے خالی نہیں کیونکہ نماز عید سے قبل نفل پڑھنا مکروہ ہے اور جماعت ہونے سے زیادہ کراہت ہو جاتی ہے کیونکہ عورتوں کی جماعت بھی مکروہ ہے اور اہتمام سے نفل کی جماعت بھی مکروہ ہے۔

غرض جماعت میں تین مکروہات جمع ہو جاتے ہیں و نیز ایک گناہ بے پردگی کا ہوتا ہے کیونکہ یہ گمان کرتی ہیں کہ سب مرد چلے گئے اسلیئے بے فکر نکلتی ہیں حالانکہ بعض آدمی راستے میں مل جاتے ہیں اسلیئے نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا لازم ہے اور اگر کوئی نفل پڑھنا چاہے تو نماز عید کے بعد اپنے گھر میں تنہا ہی چار نفل چاشت کی نیت سے پڑھ لے تو ثواب ہے۔

تنبیہ دوم نماز عید مسجد میں

عیدین کی نماز عید گاہ میں پڑھنا مسنون ہے اسلیئے اگر امام عید گاہ دیندار ہو تو عید گاہ میں جانا چاہیئے

البتہ اگر بیماری یا بڑھاپے کے سبب مسجد میں شریک ہو جاوے تو مضائقہ نہیں اور مسجدوں میں عیدین کی نماز معذور لوگوں ہی کے واسطے جاری بھی ہوئی ہے ولیکن جب امام عیدگاہ ایسا ہو جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہو تو پھر دیندار امام کے پیچھے مسجد میں پڑھ لیں غرض بلا وجہ مسجدوں میں نماز عید نہ پڑھی جاوے۔

تنبیہ سوم دُعا بعد خطبہ عید کی نماز کے بعد تو دعا مانگنے کی گنجائش ہے لیکن خطبہ کے بعد دعا مانگنا محض بے دلیل ہے اسواسطے خطبہ کے بعد دعا نہ مانگی جاوے۔

تنبیہ چہارم اذان عید نماز عیدین کے لیے اذان اور اقامت نہیں ہے اور یہ جو دستور ہے کہ الصلوٰۃ۔ الصلوٰۃ پکارتے ہیں یہ بدعت ہے اسکو ترک کرنا چاہیئے۔

تنبیہ پنجم اوقاتِ عید عید الفطر کی نماز میں تاخیر بہتر ہے اور عید الاضحےٰ میں تعجیل اور معیار اس کا یہ ہے کہ شروع وقت سے اخیر تک یعنی اشراق سے نصف النہار تک کا حساب لگایا جاوے۔ جتنا وقت ہوتا ہو اس کا ادھا کریں آدھے سے پیشتر پڑھنا تعجیل ہے اور آدھے کے بعد پڑھنا تاخیر اس حساب سے بقرعید کی نماز چھوٹے دنوں میں طلوع آفتاب کے بعد اڑھائی گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا چاہیئے اور بڑے دنوں میں اس سے کچھ دیر بعد اور عید الفطر کا مستحب وقت چھوٹے دنوں میں طلوع سے اڑھائی گھنٹہ بعد شروع ہو جاتا ہے اور بڑے دنوں میں ساڑھے تین گھنٹہ بعد۔

تنبیہ ششم التزامِ عربی خطبہ خطبہ صرف عربی میں پڑھا جاوے اُردو فارسی وغیرہ کوئی زبان شامل نہ کی جاوے۔ اور اگر ضروری مسائل سُنانا مقصود ہو تو خطبہ ختم کر کے ممبر سے اُتر کر سناویں بلکہ مجمع کی ہیئت بھی بدل دی جاوے اور اس کا بھی التزام نہ کیا جاوے بلکہ کبھی سناویں کبھی نہیں۔

نماز عیدین کا طریقہ[1]

امام یوں نیت کرے کہ میں دو رکعت واجب نماز عید[2] چھ زائد تکبیروں سمیت پڑھتا ہوں منہ طرف کعبہ شریف کے۔ اور مقتدی اس کے ساتھ یہ نیت بھی کریں پیچھے اس امام کے۔ یہ نیت کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں اور سبحانک اللھم پڑھیں اس کے بعد تین تکبیریں اس طرح کہی جاویں کہ دو تکبیروں میں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا اٹھا کر چھوڑتے رہیں اور تیسری تکبیر میں بھی ہاتھ اٹھادیں مگر چھوڑے نہیں بلکہ باندھ لیں بعد ازاں امام اعوذ باللہ اور بسم اللہ آہستہ پڑھ کر بلند آواز سے قراءت یعنی الحمد اور سورت پڑھے اور بہتر یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ و غاشیہ پڑھی جاویں مگر اس پر ہمیشہ پابندی نہ کی جاوے اور مقتدی حسب معمول خاموش رہیں اور دوسری نمازوں کی طرح رکوع سجدہ وغیرہ کر کے دوسری رکعت میں اول امام بلند آواز سے قراءت پڑھے اس کے بعد تکبیریں کہی جائیں اور تینوں تکبیروں میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر چھوڑتے رہیں پھر بغیر ہاتھ اٹھائے چوتھی تکبیر رکوع کے واسطے کہہ کر رکوع میں جاویں اور دوسری نمازوں کی طرح سجدوں کے بعد التحیات وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ اور امام کو چاہیے کہ تکبیروں کے درمیان اتنا وقفہ کرے کہ مقتدیوں کے فارغ ہونے کا گمان ہو جاوے۔

شروع نماز میں نہ ملنے والے کے احکام

اور جو شخص بعد میں آکر شامل ہو اُس کی چند صورتیں ہیں سب کو الگ الگ لکھا

---

[1] یہ طریقہ نماز نہایت آسان عبارت میں پوری تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اگر اس کو جداگانہ چھاپ کر ضرورت کے موقع پر تقسیم کر دیا جایا کرے تو بہت اچھا ہو ۱۲ منہ۔

[2] اگر عید میں عید الفطر اور بقر عید میں عید الاضحیٰ کا لفظ کہہ لیں تو بہتر ہے و نیز امام کو امامت کی نیت بھی کر لینا چاہیے۔ ۱۲ منہ۔

لکھا جاتا ہے۔

پہلی صورت

اگر کوئی شخص تکبیروں سے پہلے ہی آگیا تب تو نیت باندھ کر شامل ہو جاوے اور اگر ایسے وقت پہنچا کہ تکبیریں ہو رہی ہیں تو جتنی تکبیر مل جاویں اتنی ساتھ کہہ لے اور باقی ماندہ بعد میں اسی وقت کہہ لے اور اگر کل تکبیریں ہو چکی ہوں تو نیت باندھتے ہی فوراً تینوں تکبیریں کہہ لے خواہ قرأت شروع ہو چکی ہو اور ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کا وہی طریقہ ہے جو اوپر گذر چکا۔

دوسری صورت

اگر کوئی شخص ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں جا چکا ہے تو اگر غالب گمان ہو کہ تکبیریں کہنے کے بعد رکوع مل جاوے گا تب تو طریقہ مذکورہ کے موافق تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کی تکبیر کہہ کر رکوع میں جاوے اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ رکوع نہ ملے گا تو رکوع میں شریک ہو جاوے اور رکوع ہی میں تسبیح کی جگہ بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہہ لے اور اگر ایک یا دو تکبیر کے بعد امام رکوع سے اٹھ جائے تو یہ بھی ساتھ ہی اٹھ جائے باقی تکبیر معاف ہے۔

تیسری صورت

اور جو شخص دوسری رکعت میں اس وقت آیا ہو جب امام رکوع میں جا چکا ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی رکعت کے رکوع کا ابھی لکھا گیا ہے اور پہلی رکعت جو رہ گئی ہے جب امام کے سلام پھیر دینے پر اس کو پڑھے تو اول قرأت پڑھنا چاہیے اس کے بعد تین تکبیریں زائد ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے کے بعد چوتھی تکبیر رکوع کے لیے بغیر ہاتھ اٹھائے کہتا ہوا رکوع میں جائے جیسا کہ دوسری رکعت میں

حکم ہے۔

چوتھی صورت

اگر دوسری رکعت کے رکوع کے بعد کسی وقت آکر ملے تو پھر دونوں رکعت اُس طریقہ سے پڑھے جو شروع میں لکھا ہوا ہے۔

چند ضروری مسائل

(۱) اگر امام نے پہلی رکعت کی تکبیر بھول سے چھوڑ کر قراءت شروع کر دی ہو تو یہ حکم ہے کہ اگر الحمد پڑھتے پڑھتے یاد آجائے تب تو تکبیریں کہہ کر دوبارہ الحمد شریف پڑھی جائے اور اگر سورت شروع کر دی ہے تو پھر سورت پوری کرنے کے بعد دوسری رکعت کی طرح تین تکبیریں زائد اور چوتھی تکبیر رکوع کے لیے کہہ کر رکوع میں چلے جاویں قراءت کا اعادہ نہ کیا جائے اور اگر رکوع میں یاد آوے تو تکبیروں کے لیے رکوع سے اُٹھنا جائز نہیں بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ کہہ لے اور مقتدیوں میں سے بھی جس جس کو یاد آئے اپنی اپنی تکبیریں کہہ لیں خواہ اُن کو امام کے تکبیر کہنے کا پتہ لگا ہو یا نہ لگا ہو۔ اور اگر کسی نے رکوع سے اُٹھ کر تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کیا تو نماز ہو گئی مگر بُرا کیا اور یہی تفصیل اُس مسبوق کے لیے ہے جس کی دونوں رکعت رہ گئی ہوں۔

(۲) اسی طرح اگر دوسری رکعت میں امام تکبیریں بھول کر رکوع میں چلا جائے تب بھی تکبیروں کے واسطے رکوع سے واپس نہ ہو بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ

عہ اگر الحمد پوری پڑھ لی تھی۔ یا اکثر حصہ پڑھ لیا تھا تو اعادہ کرنے سے سجدہ سہو واجب ہوگا۔ مگر امام سجدہ سہو نہ کرے جیسا کہ آگے آتا ہے اور مسبوق کرے ۱۲ منہ

عہ۔ کیونکہ بلند آواز سے کہنے میں جماعت گڑبڑ کریگی۔ ۱۲ منہ۔

تکبیریں پڑھ لے اور مقتدی بھی جیسا کہ ابھی سلہ میں گذرا اور یہی حکم مسبوق کے بھول جانے کا ہے۔

(۳) نماز عیدین میں اگر بھول سے تکبیر رہ جاویں یا اور کوئی بات سجدہ سہو کی موجب ہو جائے تو امام کو چاہیئے کہ سجدہ سہو نہ کرے کیونکہ زیادہ مجمع کی وجہ سے لوگوں کو غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ البتہ اگر مجمع کم ہو اور غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو سجدہ سہو کر لے اور اگر مسبوق سے اس کی رہی ہوئی نماز میں کوئی بات سجدہ سہو کی موجب سرزد ہو تو اس کو سجدہ سہو کرنا واجب ہے۔

(۴) اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے نماز بالکل نہیں ہوئی تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مجمع متفرق ہونے سے پیشتر ہی پتہ لگ گیا تب تو دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہے اور اگر مجمع متفرق ہو چکنے کے بعد خبر ہوئی تو اعادہ نماز میں مختلف روایات ہیں۔ مگر آسانی اس روایت کو لینے میں ہے کہ اب جماعت کا دہرانا ضروری نہیں بلکہ صرف امام نماز لوٹا لے وہو حکم الاستحسان کما فی الشامی عن البدائع۔ ہاں اگر احتیاطاً اعلان کر کے دوبارہ پڑھ لی جاوے تو بہتر ہے اگر اس روز موقع نہ ملے تو عید الفطر میں دوسرے روز بھی لوٹا سکتے ہیں اور عید الاضحیٰ میں تیسرے روز بھی واللہ اعلم اور یہ سب تفصیل امام کی نماز فاسد ہونے میں ہے اور اگر مقتدی یا مسبوق کی نماز فاسد ہو جاوے تو کسی حال میں قضا نہیں ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص عیدگاہ میں ایسے وقت پہنچا کہ نماز ختم ہو چکی ہے تو یہ تنہا نماز عید نہیں پڑھ سکتا۔ بلکہ اگر دوسری جگہ نماز ہوتی ہو وہاں چلا جاوے ورنہ چار رکعت چاشت کی نیت سے پڑھ لے اور اگر چند آدمی رہ گئے ہوں تو جائز ہے کہ کسی دوسری جگہ جماعت[عہ] کر کے نماز عید پڑھ لیں۔ فقط والسلام۔

عہ یعنی کم از کم چار آدمی ہوں ۱۲ منہ۔

قربانی کی تاکید وفضیلت

یہ تاکید وفضیلت کا مضمون حیات المسلمین ہے کسی قدر تغیر واختصار کے ساتھ لیا گیا ہے جو شخص پورا مضمون دیکھنا چاہے وہ اصل کتاب ضرور دیکھ لے بلکہ وہ پوری کتاب حرزِ جان بنا لینے کے قابل ہے بالخصوص دیباچہ کہ روح الارواح ہے اور تاکید تو اسی کے لیے ہے جس پہ واجب ہو لیکن جس پہ واجب ہو اگر وہ بھی کرے یا کوئی شخص اپنے بچوں کی طرف سے بھی کرے تو اس کو بھی بہت ثواب ملتا ہے اور اگر کسی میت کی طرف سے کرے تو اس میت کو بھی بہت ثواب ملتا ہے اب اس کے متعلق آیتیں اور حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔

آیات: (۱) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (کوثر) یعنی آنحضرت کو خطاب ہے کہ نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے۔ فائدہ: اور یہ حکم امت کو بھی شامل ہے کیونکہ آنحضرت کے لیئے خاص ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ عام ہونے کی دلیل موجود ہے چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص قربانی کی گنجائش رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آوے (حاکم) اس حدیث شریف سے کس قدر ناراضی معلوم ہوتی ہے اُن سے جو کہ باوجود واجب ہونے کے ترک کرتے ہیں کیا اسکو وہ لوگ سُنکر بھی بیدار نہ ہوں گے۔

(۲) فرمایا اللہ تعالےٰ نے کہ ہم نے ہر امت کے لیئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ اُن مخصوص چوپایوں پہ (یعنی گائے اونٹ بکری بھیڑ سب کے نر و مادہ پر) اللہ کا نام لیں جو اس نے اُن کو عطا فرمائے تھے (ف) اس آیت سے معلوم ہوا کہ قربانی بڑی مہتم بالشان عبادت ہے جو کہ سب امتوں کے لیئے مشروع رہی ہے۔ فائدہ (۲) بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ جو اس آیت میں آیا ہے اُردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کا ترجمہ ہو سکے اسلیئے جن جن چوپایوں پہ یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اُن سب کا نام لکھ دیا اور گائے کے حکم میں بھینس بھی ہے اور دُنبہ بھیڑ کی قسم ہے۔

پس قربانی بارہ چیزوں کی جائز ہے ۔ گائے ۔ بیل ۔ بھینس ۔ بھینسا ۔ اونٹ ۔ اونٹنی ۔ بکرا ۔ بکری ۔ بھیڑ ۔ مینڈھا ۔ دُنبہ ۔ دُنبی ۔ ان کے سوا اور کسی کی قربانی جائز نہیں ۔

(۳۳) اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے کہ اُن کی قربانی سے اللہ تعالےٰ کی عظمت اور دین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اُخروی فائدہ ثواب (فائدہ ۲) اگرچہ بکری بھیڑ بھی قربانی کے جانور ہیں اور اسلیئے وہ بھی دین کی یادگار ہیں ۔ مگر آیت میں خاص اونٹ اور گائے کا ذکر فرمانا اسلیئے ہے کہ اُن کی قربانی بھیڑ بکری کی قربانی سے افضل ہے اور حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ سب سے عمدہ قربانی سینگ والا مینڈھا ہے سو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی جنس میں مینڈھا سب سے افضل ہے یعنی بکری وغیرہ سے اور دُنبہ بھی مینڈھے کے حکم میں ہے اور اگر پوری گائے یا اونٹ نہ ہو بلکہ اس کا ساتواں حصہ قربانی میں لے لے تو اُس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ساتواں حصہ اور پوری بکری یا بھیڑ قیمت اور گوشت کی مقدار میں برابر ہوں تو جس کا گوشت عمدہ ہو وہی افضل ہے اور اگر قیمت اور گوشت میں برابر نہ ہوں تو جو زیادہ ہو وہ افضل ہے ۔ (شامی از تاتارخانیہ)

فائدہ ۲ اس سے معلوم ہوا کہ گائے کی قربانی خاص درجہ رکھتی ہے اور بعض جاہل جو کہتے ہیں کہ حضورؐ نے گائے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے سو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کا گوشت شرعاً ناپسند ہے بلکہ اسکی وجہ یہ تھی اہل عرب کو بوجہ خشک ملک ہونے کے موافق نہیں ۔

۳۷ اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ اُن کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقوےٰ (اور اخلاص) پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالےٰ نے ان چوپایوں کو تمہارا زیرِ حکم کر دیا تاکہ تم اس بات پر اللہ کی برتری بیان کرو کہ اُس نے تم کو توفیق دی اور (اے پیغمبر) اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۔ (سورۂ حج)

فائدہ : اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ خاص حق تعالیٰ کو خوش کرنے اور اس سے

ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو کوئی دنیا کی غرض شامل نہ ہو۔

احادیث ۱: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دن میں آدمی کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کرنے سے زیادہ پیارا نہیں اور قربانی کا جانور قیامت کے دن مع اپنے سینگوں اور اپنے بالوں اور کھروں کے حاضر ہوگا۔ (یعنی ان سب چیزوں کے بدلے ثواب ملے گا اور (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالےٰ کے یہاں ایک خاص درجہ میں پہنچ جاتا ہے سو تم لوگ جی خوش کرکے قربانی کیا کرو۔ (زیادہ داموں کے خرچ ہو جانے پر جی برا مت کیا کرو) ابن ماجہ و ترمذی وحاکم)

۲: زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ یہ قربانی کیا چیز ہے آپؐ نے فرمایا تمہارے (نسبیٌ یا روحانی) باپ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے انہوں نے عرض کیا کہ ہم کو اس میں کیا ملتا ہے یا رسول اللہؐ آپؐ نے فرمایا ہر بال کے بدلے ایک نیکی انہوں نے عرض کیا کہ اُون (والا جانور یعنی بھیڑ و دنبہ) ہو آپؐ نے فرمایا کہ ہر اُون کے بدلے بھی ایک نیکی (حاکم ؎)

فائدہ: کتنی بڑی رحمت ہے کہ بکری وغیرہ کی قربانی کرنے سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پیروکار شمار کیے گئے جنہوں نے اپنے اس پیارے پہلوٹھی کے بچے کو قربانی کیا تھا جو بڑھاپے میں بڑی تمناؤں کے بعد نصیب ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوگی ۳: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے فاطمہؓ اٹھو اور ذبح کے وقت اپنی قربانی کے پاس موجود رہو کیونکہ پہلا قطرہ جو قربانی کا زمین پر گرتا ہے اس کے ساتھ ہی تیرے لیے تمام گناہوں کی مغفرت ہو جانے گی (اور) یاد رکھو کہ (قیامت کے دن) اس (قربانی)

ٌ یعنی بعض کے صرف روحانی باپ اور بعض کے نسبی بھی۔ ۱۲ منہ

؎ ورواہ احمد وابن ماجہ ایضاً ۱۲ منہ

کا خون اور گوشت لایا جائے گا۔ اور تیرے میزان (عمل) میں ستر حصے بڑھاکر رکھ دیا جاویگا (اور ان سب کے بدلے نیکیاں دی جاویں گی) ابو سعید نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ (ثواب مذکور) کیا خاص آل محمدؐ کے لیے ہے کیونکہ وہ اس کے لائق بھی ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ خاص کیے جائیں یا آل محمدؐ اور سب مسلمانوں کیلئے عام طور پر ہے آپؐ نے فرمایا کہ آلِ محمد کے لیئے (ایک طرح سے) خاص بھی ہے اور سب مسلمانوں کے لیے عام طور پر بھی ہے (اصبہانی)

فائدہ: ایک طرح سے خاص ہونے کا مطلب ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا قرآن مجید میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لیے فرمایا کہ نیک کام کا ثواب بھی اوروں سے دونا ہے اور گناہ کا عذاب بھی دونا ہے سو قرآن مجید سے آپ کی بیبیوں کے لیئے اور اس حدیث سے آپؐ کی اولاد کے لیئے بھی یہ قانون ثابت ہوتا ہے اور اس کی بناء زیادہ بزرگی ہے۔ ۴۔ حسین بن علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس طرح قربانی کرے کہ اس کا دل خوش ہو کر (اور) اپنی قربانی میں ثواب کی نیت رکھتا ہو وہ قربانی اُس شخص کے لیئے دوزخ سے آڑ ہوجائے گی (طبرانی کبیر)

(۵) حنش سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ دو دُنبہ قربانی کیئے اور فرمایا ان میں ایک میری طرف سے ہے اور دوسرا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے میں نے اُن سے (اس کے متعلق) گفتگو کی انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھ کو اس کا حکم دیا ہے میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ (ابوداؤد و ترمذی)

فائدہ:۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پر بڑا حق ہے اگر ہم ہر سال حضورؐ کی طرف سے بھی ایک حصہ مقرر کر دیا کریں۔ تو کوئی بڑی بات نہیں۔

(۶)۔ ابو طلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دُنبہ کی اپنی طرف سے قربانی فرمائی اور دوسرے دُنبہ کے ذبح میں فرمایا کہ یہ (قربانی) اسکی طرف سے ہے جو میری امت میں سے مجھ پر ایمان لایا اور جس نے میری تصدیق کی (موصلی و کبیر

واوسط) فائدہ ۱: مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو ثواب میں شامل کرنا تھا۔ نہ یہ کہ قربانی سب کی طرف سے ایسے طرح ہو گئی کہ اب کسی کے ذمہ قربانی نہیں رہی۔ فائدہ ۲: غور کرنے کی بات ہے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قربانی میں امت کو یاد رکھا تو افسوس ہے کہ امتی حضور کو یاد نہ رکھیں اور ایک حصّہ بھی آپ کی طرف سے نہ کر دیا کریں۔

۸: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی قربانیوں کو خوب قوی کیا کرو (یعنی کھلا پلا کر) کیونکہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔ (کنز العمال عن ابی ہریرۃؓ) فائدہ: عالموں نے سواریاں ہونے کے دو مطلب بیان کیئے ہیں ایک یہ کہ قربانی کے جانور خود سواریاں ہو جاویں گی۔ اور اگر کئی جانور قربانی کیئے ہوں یا تو سب کے بدلے میں ایک بہت اچھی سواری مل جاوے گی اور یا ایک ایک منزل میں ایک ایک قربانی پر سواری کریں گے دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قربانیوں کی برکت سے پلصراط پر چلنا آسان ہو جائے گا جیسے گویا خود اُن پر سوار ہو کر پار ہو گئے اور کنز العمال میں ایک حدیث اس مضمون کی یہ ہے کہ (۸) سب سے افضل قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو (حم ک عن رجل) اور ایک حدیث یہ ہے کہ (۹) اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پیاری قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو۔ (ہق عن رجل) (والضعف غیر مضر فی الفضائل لاسیما بعد انجبارہ بتعدد الطرق)

تاکید و فضیلت کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ کچھ ضروری احکام بھی مختصر طور پر لکھدیئے جاویں لہٰذا اصلاح انقلاب سے مختصراً اور خطبات الاحکام سے کسی قدر اضافہ و تغیر کے ساتھ چند احکام لکھے جاتے ہیں۔

عہ یعنی سب قربانیوں پر یکے بعد دیگرے سوار کیا جاویگا اور ظاہر ہے کہ سواریاں بدلنے سے رستہ جلدی طے ہوتا ہے پس جتنی زیادہ قربانی کی جاوے اتنی ہی جلدی پلصراط سے پار ہو۔ ۱۲ منہ

احکام قربانی

(۱) ہر عاقل بالغ مرد و عورت مسلمان مقیم جس کے پاس بقدر نصاب عـ چاندی یا سونا وغیرہ کی حاجت ضروریہ سے زائد یا اتنی ہی مالیت کا اسباب ہو اُس پر واجب ہے کہ اپنی طرف سے قربانی کرے۔

(۲) اونٹ، بکرا، دنبہ، بھیڑ، گائے، بھینس نر ہو یا مادہ سب کی قربانی درست ہے گائے بھینس دو برس سے کم بکری ایک برس سے کم نہ ہو۔ اور دنبہ چھ مہینہ کا بھی درست ہے جبکہ خوب فربہ ہو اور سال بھر کا عـ معلوم ہوتا ہو۔ اور اونٹ گائے بھینس میں سات آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں۔ مگر کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو۔

(۳) جانور قربانی کا بے عیب ہو۔ لنگڑا۔ اندھا۔ کانا۔ اور بہت لاغر اور کوئی عضو تہائی سے زائد کٹا ہوا نہ ہو۔ خصی (یعنی بدھیا) کی اور جس کے سینگ نکلے ہی نہ ہوں قربانی درست ہے اور پوپلی جس کے دانت نہ رہے ہوں۔ اور بوچی جس کے پیدائشی کان نہ ہوں جائز نہیں۔ اور اگر بکری وغیرہ کا ایک تھن خشک ہو گیا یا بھینس وغیرہ کے دو تھن خشک ہو گئے ہوں اُسکی قربانی بھی درست نہیں۔

عـ قربانی اور صدقۂ فطر واجب ہونے کے لیے غیر ضروری سامان کا تجارتی ہونا شرط نہیں و نیز نصاب پر سال گذرنا بھی شرط نہیں ہے حتیٰ کہ اگر قربانی کے بالکل اخیر وقت میں کوئی نصاب کا مالک ہو جائے تب بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے اور اسی طرح اگر کوئی شخص مسافر تھا یا نابالغ یا مجنون تھا یا کافر تھا۔ اور اخیر وقت میں مسلمان مقیم عاقل بالغ ہو گیا تب بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ بلکہ اگر کوئی ایسا شخص قربانی کر چکا ہو جس کے ذمہ واجب نہ تھی اور پھر وجوب کی شرطیں وقت قربانی کے اندر پوری ہو گئیں تو اسکو دوبارہ قربانی کرنا پڑے گی۔ ۱۲

عـ اور بھیڑ میں اختلاف ہے کہ بکری کے حکم میں ہے یا دنبہ کے۔ بھیڑ سال بھر سے کم کی نہ کرے۔ ۱۲ منہ

(۴) دسویں تاریخ عید کی نماز کے بعد سے بارہویں کے غروب سے پہلے پہلے
تین دن دو رات تک قربانی کا وقت رہتا ہے۔ مگر دسویں افضل ہے پھر گیارہویں
کا درجہ ہے پھر بارہویں کا اور رات کو ذبح کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اگر دس تاریخ
کو کسی وجہ سے نماز نہ ہوئی ہو مثلاً بارش تھی تو زوال کے بعد قربانی کا وقت
شروع ہوتا ہے اور اگر نماز عید چند جگہ ہوتی ہو تو ایک جگہ ہونے کے بعد قربانی
جائز ہے۔ اور دیہات کے باشندوں کو جائز ہے کہ نماز عید عــه سے پہلے ذبح کریں
بعد اس کے نماز کے لیے جائیں۔

(۶) اگر قربانی شرکت میں کریں تو محض اندازے سے گوشت تقسیم کرنا جائز نہیں
تول کر پورا پورا بانٹیں۔ کسی طرف ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔ ہاں جس حصہ میں کلے
پائے بھی ہوں اس میں کمی چاہے جتنی ہو جائز ہے البتہ اگر مشترک ہی خیرات کرنا یا کسی
کو دینا چاہیں تو تقسیم کی حاجت نہیں۔

(۷) بہتر ہے کہ کم از کم تہائی گوشت خیرات کرے اور ایک تہائی اعزا و احباب
کو دے (۸) قربانی کی کوئی چیز قصاب کو اجرت میں دینا جائز نہیں۔ (۹) قربانی پر جھول
ڈالنا مستحب ہے اور پھر اس کی رسی جھول سب تصدق کر دینا افضل ہے (۱۰) قربانی کی کھال
تو اپنے کام میں لانا جائز ہے مثلاً مصلے وغیرہ بنوا لے لیکن کھال کا بیچنا اپنے خرچ میں لانے کیلئے

عــه دیہات والوں کیواسطے دسویں تاریخ کی صبح صادق سے وقت شروع ہو جاتا ہے
مگر بہتر یہ ہے کہ سورج نکلنے سے پیشتر نہ کریں ۱۲ منہ۔ عــه اور مستحب ہے کہ ذبح
سے پہلے یہ آیتیں پڑھے إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ
اور بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے پھر بعد ذبح یہ کہے۔ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ
وَلَكَ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ ۔ اور کئی شریک ہوں تو منا کہے اور جو کسی دوسرے کی طرف سے
ہو تو منی کے بعد اس کا نام لے جس کی طرف سے قربانی کی جاوے۔ ۱۲ منہ

درست نہیں۔ ہاں اگر قیمت خیرات کرنے کے لئے بیچے تو خیر۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ کھال ہی کسی کو دیدی جاوے (۱۱) قربانی کے ذبح کے وقت دعا پڑھنا ایسی ضروری نہیں کہ بدون اسکے قربانی ہی نہ ہو۔ جس کو یاد نہ ہو بسم اللہ عہ اللہ اکبر کہہ کے ذبح کر لے

(۱۲) اکثر لوگ قربانی کی کھال امام یا موذن وغیرہ کو دیدیتے ہیں یہ جائز نہیں کیونکہ اس کو ان کی خدمت مسجد کا صلہ سمجھا جاتا ہے اور کسی خدمت کے معاوضہ میں چرم قربانی وغیرہ دینا جائز نہیں البتہ اگر کسی امام وغیرہ سے صاف کہدیا جاوے کہ قربانی کی کھال بالکل نہ ملے گی اور پھر کوئی شخص بطور ہدیہ یا صدقہ کھال بجنسہ دیدے تو کچھ حرج نہیں خواہ وہ امام مصرف زکوٰۃ ہو یا نہ ہو کیونکہ بعینہ کھال دینے میں مصرف زکوٰۃ ہونا شرط نہیں۔ بلکہ جس طرح گوشت خود کھاتے ہیں اور امیر غریب اور سید وغیرہ سب کو دیتے ہیں یہی کھال کا حکم ہے گوشت اور کھال میں صرف یہی شرط ہے کہ کسی کو بطور حق الخدمت نہ دیا جاوے اور اگر کھال کے دام دینا ہوں تو جس کو دے اس کا مصرف زکوٰۃ ہونا بھی شرط ہے۔ یعنی صاحب عہ نصاب اور بنی ہاشم کو دینا جائز نہیں خوب سمجھ لو۔

(۱۳) ایک عام رسم یہ ہو گئی ہے کہ قربانی کے بعض حصص کو بعض لوگوں کا حق سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً میری کو سقے کا۔ اور اگر وہ چیز اُن کو نہ دی جاوے تو جھگڑا ہوتا ہے یہ حق سمجھنا اور ایسے موقع پر دینا بالکل ناجائز ہے جس کسی کو کچھ دیا جاوے محض تبرعاً دیا جاوے۔ جیسا کہ (۱۲) سے معلوم ہو چکا۔

(۱۴) بعض لوگ گابھن گائے بکری وغیرہ کی قربانی کو ناجائز سمجھتے ہیں یہ تو غلط

عہ بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ذبح کے وقت ضروری ہے چاہے قربانی ذبح کی جاوے یا ویسے ہی کھانے کے واسطے ذبح کیا جاوے ۱۲ منہ

عہ جس قسم کا نصاب ہونے سے قربانی اور صدقہ فطر واجب ہوتا ہے اس قسم کے نصاب کا جو مالک ہو وہ زکوٰۃ۔ فطرہ۔ قیمت چرم قربانی وغیرہ صدقات واجبہ کا مصرف نہیں ہے ۱۲ منہ بنی ہاشم سے مراد بنی فاطمہ اور علوی اور عباسی اور حضرت جعفر و عقیل کی اولاد اور حارث کی اولاد ہے ان میں سے کسی کو زکوٰۃ وغیرہ دینا درست نہیں ۱۲ منہ

ہے قربانی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اگر پہلے سے معلوم ہو جاوے تو بہتر یہی ہے کہ اس کی قربانی نہ کرے۔ بلکہ اس کے بدلے میں دوسری کر دی جاوے لیکن اگر دوسری کم قیمت ہو تو جو دام باقی رہیں وہ خیرات کر دیئے جاویں۔

(۱۵) اگر کسی میت نے قربانی کی وصیت کی تھی تو اس قربانی کا گوشت خیرات کر دینا واجب ہے اور اگر بغیر وصیت کے ویسے ہی کسی نے ایصال ثواب کے لئے میت کی طرف سے قربانی کی ہو تو اس میں اپنی قربانی کی طرح اختیار ہے۔

(۱۶) بعض جگہ قربانی کی یا ویسے ہی کسی جانور کی کھال ذبح سے پہلے ہی فروخت کر دیتے ہیں یہ بالکل حرام ہے۔

(۱۷) اکثر جاہل یوں سمجھتے ہیں کہ اگر خاوند غریب یا قرضدار ہو تو بیوی کے ذمہ بھی قربانی نہیں یہ بالکل غلط ہے جب بیوی صاحب نصاب ہو جیسا کہ اکثر مقدار نصاب زیور ان کی ملک ہوتا ہے تو اس پر مستقل قربانی وغیرہ واجب ہوتی ہے۔

(۱۸) قربانی کرنے والے کے واسطے یہ مستحب ہے کہ ذی الحجہ کے عشرہ میں بال اور ناخن نہ بنوائے بلکہ قربانی کے بعد بنوائے۔ فقط والسلام۔ باقی مسائل بہشتی زیور وغیرہ میں دیکھ لیں۔ ونیز اصلاح الرسوم ابھی قابل دید ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

عبدالکریم عفی عنہ

خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مورخہ ۳ رشوال ۱۳۵۱ھ

بڑوں کا بچپن

تالیف :۔ حضرت مولانا اسلم صاحب شیخوپوری

ترتیب و اضافہ :۔ مولانا حکیم ساجد الواجد

بڑوں کا بچپن ● برصغیر کے ممتاز علماء اور اہم شخصیات کے بچپن کے انتہائی مؤثر، سبق آموز اور دلچسپ حالات و واقعات ۔

بڑوں کا بچپن ● جس کے مطالعے سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے کیا انداز اختیار کرنا چاہئے اور وہ لوگ جنھیں ہم آج محدث، مفسر، علامہ، فقیہ ادیب، شاعر، مفکر اور حکیم کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں انکے والدین نے انکی تعلیم و تربیت کیلئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا ؟

بڑوں کا بچپن ● جس سے آپکو یہ معلوم ہوگا کہ ان اکابر کی اٹھان کس ماحول میں ہوئی انہوں نے تعلیمی مراحل کیسے طے کئے، بچپن میں انکی دلچسپیاں کیا تھیں، انھیں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کن کتابوں اور کن شخصیات نے انکی طلب علم کی راہ کو آسان بنایا ؟

بڑوں کا بچپن ● جس کا مطالعہ آپکے سامنے تعلیم و تربیت کی نئی نئی راہیں کھول دیگا ۔

بڑوں کا بچپن ● جس نے برصغیر کی پوری علمی دنیا میں ایک عطر بیز خوشبو پھیلا دی ہے ۔

بڑوں کا بچپن ● انتہائی دلچسپ کتاب جسے شروع کر کے ختم کئے بغیر دل نہ چاہے ۔

پہلی فرصت میں خریدیئے !

طلباء، اساتذہ اور عوام کیلئے یکساں مفید ۔

بڑوں کا بچپن ● آپکے محبوب ادارہ زمزم بکڈپو دیوبند کی ایک اہم پیشکش ۔

عالم اسلام کے عظیم واعظ بے مثال عالم دین ولیٔ کامل حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عالمانہ تقریروں کا

ایک عظیم شاہکار

خطبات حکیم الامت

جس کی ہر تقریر اپنی جگہ ایک مکمل کتاب اور لازوال علمی دستاویز ہے۔

حکیم الامت کے مواعظ مختلف ناموں سے سلسلہ وار شائع ہوتے رہے جن سے مردہ قلوب کو زندگی فراہم ہوتی رہی۔ یہ مواعظ ناشرین کی عدم توجہ سے کبھی بھی عمدہ اور دیدہ زیب کتابت وطباعت سے مزین نہ ہو سکے اور عموماً انتشار کا شکار رہے۔

منشی عبدالرحمن صاحب اور قاری ادریس صاحب ہوشیارپوری نے ان مواعظ پر خاص توجہ فرمائی اور مسلسل محنت اور بڑی کاوش سے منتشر مواعظ میں بکھرے ہوئے موتیوں اور جواہر پاروں کو جمع کر کے ایک منظم لڑی میں اس طرح پرو دیا کہ وہ ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔

ان ہی مواعظ کے ذریعہ سینکڑوں انسانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب برپا ہوا دین کے بارے میں بیسیوں شبہات کا خاتمہ ہوا اور ان خطبات کی بدولت وہ صراط مستقیم روز روشن کی طرح واضح ہوئی جو ہر مومن کا مقصد اور ہر مسلمان کی بار بار دعا ہے

ان مواعظ میں ایک مسلمان کے لئے دارین کی فلاح وبہبود کا وہ سازو سامان ہے جس کی اسلامی زندگی میں ہر شخص کو ہر حال میں ضرورت ہوتی ہے۔

ہم نے یہ عظیم الشان پروگرام اپنے روایتی انداز میں عمدہ کتابت خوبصورت ٹائیٹل اعلیٰ معیاری کاغذ کے ساتھ شروع کر دیا ہے جس کی چھ جلدیں

دعوت تبلیغ۔ آداب انسانیت۔ جزا وسزا۔ حقوق الزوجین۔ برکات رمضان۔ سنت ابراہیمؑ منظر عام پر آچکی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جس طرح شائقین حضرات نے ہمارے ادارہ کی دوسری کتابوں میں دلچسپی لی ہے یہ کتابیں بھی اسی دلچسپی کے ساتھ پڑھ کر روحانی راحت وسکون حاصل کرتے ہوئے اپنی علمی لائبریری کے وقار میں اضافہ کریں گے۔

- معارف وحقائق کا شاہکار
- علم وحکمت کے لعل وجواہر
- دنیاءِ وعظ ونصیحت کا عظیم خزانہ
- ہزاروں احادیث اور قرآنی آیات کی تشریح

ناشر

زمزم بکڈپو نزد مسجد چھتہ دیوبند